

دیوی



6

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ————— ۲۰۰۹ء

مطبع ————— پرائیڈنٹی پرنٹرز لاہور

کپڑے ————— حافظ رحمن لاہور

قیمت ————— ۲۵۰ روپے

شانی جانتی تھی کہ چپ رہنے سے گزرا وہ نہیں ہوگا۔ اسے بھڑے ہوئے چوہدری کو کچھ نہ کچھ بتانا پڑے گا۔ اس نے تاپا معصوم کو یہ فعال بنائے جانے کا ذکر نکال کر بشیر کو قریباً بھی کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ ڈپٹی ریاض اسے زبردستی بیپ میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہاں اس کی مدد سے ریاض نے رستم کو ڈے ڈیرے سے نکلنے پر مجبور کیا۔ پولیس کے کیپ میں رستم سے بس اس کی ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہاں بھی ریاض کے ماتحت نیچے میں موجود تھے۔ بعد ازاں ڈے ڈیرے کے کینوں نے ڈیرے سے نکل کر پولیس پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں رستم سمیت زیادہ تر لوگ کام آگئے اور وہ خود پولیس اور خصوصاً ڈپٹی ریاض کے خوف سے سری کی ایک قریبی ہستی میں روپوش ہو گئی۔ گر بس بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

بشیر نے شانی سے ہستی کا اتنا پتہ در یافت کیا۔ شانی نے کہا۔ ”میں نہیں بتا سکتی۔ میں نے کچھ لوگوں سے وعدہ کیا ہوا ہے۔“

”اور وعدے کی تم بہت زیادہ پابند ہو۔“ بشیر سخت کٹیلے لمبے میں بولا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ کچھ اور بھڑ گیا۔ ”میں نے کہا تھا تاں تم جو کوگی جھوٹ بکو گی۔ سفید جھوٹ!“ شانی کی تازک کھائی پر اس کی گرفت بے حد سخت ہو گئی۔ وہ کراہی۔ اسے تکلیف میں دیکھ کر بشیر نے گرفت کچھ اور سخت کر دی۔ ”جی تو چاہتا ہے کہ تیرے بکھرے کر کے کٹر میں بہا دوں لیکن اپنے اس ضعیف دل سے مجبور ہوں۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مارا اور شراب کا نصف گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا لیا۔

اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہوتی جاری تھیں۔ کمرے کی کھڑکی اور اٹھو تار دروازہ بند تھا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کے سوا عمارت میں کوئی اور موجود ہی نہیں، لیکن حقیقت مختلف تھی۔ یہاں تقریباً چار افراد موجود تھے اور ان میں سے ایک ٹائلر کا

استاد

علی بابا

نسبت روڈ، چوک سید ہسپتال، لاہور

ISBN 978-969-517-282-7

بے غیرت خاوند کن کتنا ناصر تھا۔ اس کے علاوہ رکھوالی کا ایک دیو بڑھل کتا تھا جو کمپاؤنڈ میں گامے بگامے شور مچانے لگتا تھا۔

چوہدری شیر نے اپنی نگاہیں شانی کے چہرے پر گاڑے گاڑے کہا۔ ”تم کہتے ہو، تم اپنے پیار کے پاس نہیں ملتی ہو لیکن میں تمہارے اس چہرے پر اس کے شخص ہونوں کے نشان دیکھ رہا ہوں۔ سارے چہرے پر!“ اس نے آخری الفاظ کا کافی بلند آواز میں کہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھاس میں بچی جیسے شراب شانی کے چہرے پر پھینک دی۔ حیرت کے ساتھ شانی کو آنکھوں میں جلن اور جھپٹ کا احساس ہوا۔ وہ ہوا ہوا۔ ”تم کو بخیر عورت ہے۔ وہاڑا، احسان فرماؤ۔ میں نے کیا نہیں کیا تیرے لئے؟“ اپنی، فیصلوں، دشمنی، اپنا کاروبار تباہ کیا، بے پس کی آنکھوں میں مشکوک بنا۔ ”کیا نہیں کیا میں نے تیرے لئے؟“ کاش میں اپنے ہاتھوں سے تیرے جیسی نمدار کی جان نہ لے سکتا۔“ فردا غضب میں شیر کے منہ سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے شانی کی کلائی کو ایک اور جھک دیا۔ وہ بھر کا اٹھی۔

شانی کا یہ صبرِ لہریز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب تک چوہدری بشیر کے سامنے بولی ہی رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ وہ جب بھی اس کے سامنے آتا تھا، وہ اس کے غرائس میں آجاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سننے کا پاپ تھا۔ شانی نے جب جب بھی چوہدری کی مزاحمت کا سواچھا تھا، اسے ایسے لگا تھا کہ اس مزاحمت کے سبب سننے کی مصیبت بڑھ جائے گی لیکن آج تو نماں یہاں نہیں تھا۔ وہ یہاں سے بہت دور ایک محفوظ چار دیواری میں تھا۔ لہذا شانی دل و دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ آج اگر چوہدری بشیر نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو وہ ناموش نہیں رہے گی۔

چو بدری نے اس کے چہرے پر جو اشباح چھلکے تھے وہ اس کی گردن کو بھونک کر بیان میں داخل ہو رہی تھی۔ کراہیت سے شانی کا دل بھر گیا۔ چو بدری نے اس کی کلائی چھوڑی تو وہ منہ دھونے کے لئے واش روم میں گھس گئی۔ یہ بڑا گلہڑی ہاتھ روم تھا۔ پوری کٹھنی پر گھڑی تھی۔ شانی صباں سے چہرہ اور گردن دھو رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ چو بدری واش روم کے دروازے میں کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر بے نیازی کا تاثر آتا ہے۔ آئے انھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

وہ ڈانگا ہوا امداد آیا، اس نے ہاتھ بکڑا کر بکڑا اور شانی کے بال بکڑ کر برش کو جنونی انداز میں اس کے چہرے پر گڑنے لگا۔ ”بھئی تو صاف کر رہی ہے۔۔۔ انشانوں کو بھی صاف کر جو تیرے حرای بار کے گندے ہونوں نے یہاں ڈالے ہیں۔ صاف کر ان

کو صاف کر۔“ وہ جیسے دیوانگی کے عالم میں ہاتھ بکڑ کر کوشانی کے چہرے اور گردن پر کڑنے لگا۔

”کیا کر رہے ہو..... چھوڑ دو مجھے۔“ شانی نے بہ مشکل خود کو اس کی بے رحم گرفت سے بچڑایا۔

وہ باپا بپا ہو کر نکل گیا۔ شافی دیوار سے سر کا کروٹ لے گی۔ برش کی حرکت دگڑے سے اس کے رشتی رخسار چیلنے لگے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ جلن اسے اپنے کانپن پر محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے بشیر کی انکھوں گوشت میں جیسے جھنک لگی تھیں۔ وہ بشیر کی اس بے رحم گرفت کا ڈھاراکہ مرتبہ سنے بھی ہوئی تھی۔

وہ بارہنگی تو چوری چھپو بشرتہ مجھ سے کی طرح کمر سے سے باہر جا چکا تھا۔ دروازہ دیکھ کر ہر منظر ملتا تھا۔ شانی خاں حوالہ کر رہا تھا۔ پتھر لگی اور پتھر لگی کمر کی تقدیر اب آگے سے کیا دکانے والی ہے۔ اسے اچھا کہ وہ غلطی پر غلطی کرتی رہی ہے۔ پہلے اس نے دو کھٹ بستی سے لکھنے کی غلطی کی، پھر اجمیر خان کو مری کے نواح سے واپس بھیج دینے والی غلطی، اس کے بعد ان خود ہیپتال سے نکل کر میڈیکل سٹور جانے والی غلطی۔ اگر وہ اصل کو ہی اپنے ساتھ رکھتی تو شاید یہ تحکیم ترین صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

دو شام تک یکسر ہلکوی بیاض کمرے میں بند رہی۔ کمرے میں اسے ہی وجود تھا۔ ٹھہریں
 نہیں رہا تھا۔ چپٹ کا پچھلا گری کی شدت کم کرنے میں کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ شانی کا حلق
 سوجھ کر ٹپکا ہو گیا تھا۔ اس نے گاڑ سے سادہ پانی مانگا۔ اس نے پانی دیا۔ وہ بد مزہ سنا تھا لیکن
 وہ پی لی۔ اس کے ہاتھ دیر بعد اس پر غصہ دگی غاری ہو گئی اور وہ سو گئی۔

دو بارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی پر دنیا، پر مایوسا ہے۔ بے خبری میں اس کا دل گولیاں دے رہا تھا کہ اس کی "بے خبری" کافی گہری اور خطرناک تھی۔ شاید پانچ چھ گھنٹے کی۔ اس نے وال کلاب دیکھا۔ دو سالہ بے بارہ بچے کا وقت ہمارا بڑا تڑپا۔ یعنی شام کے بعد قریباً سارے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ کمرے سے خندک تھکی، شاید اسے اب آن کر دی گیا تھا۔ یوب لائسنس کی روشنی میں شبانی کی لگاؤ ایک شے پر پڑی اور وہ دہری طرح چونک گئی۔ اسے سامنے ایک منیجر پر اپنا لباس نظر آیا تھا، وہی دہبائی لباس جو اس نے یہاں آتے ہوئے پہن رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے ساتھ موجود لباس کی طرف دیکھا اور اسے دوسرا شدید ترین جھجکا لگا۔ اس کے جسم پر ایک سرخ عروسی لباس تھا۔ اسے اپنی کلاہوں پر یقین نہیں آیا۔ شاید وہ ابھی تک جاگی ہی نہیں تھی۔ اس نے بھر

ترب کر سائے جنگری طرف دیکھا۔ یہ بیٹھر کر سے باہر ایک دوسرے کر سے میں تھا۔ ہاں، یہاں کا پہاڑی لباس تھا۔ چٹنوں والا موٹا چول دار کرت اور شلوار۔ گرتے کی ایک آستین پچی ہوئی تھی۔

وہ توب کر اٹھ بیٹھی۔ کس نے بدلا تھا اس کا لباس؟ کون تھا وہ؟ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ کئی سوالات اس کے ذہن میں چٹھھاڑے۔ اسے لگا کہ اس کا سر محسوس رہا ہے۔ ہر شے ڈھکی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اسے یاد آیا، اس نے پیاس سے مجبور ہو کر بدھرو پانی پیا تھا۔ تو کیا پانی میں ہی کوئی نشہ آور دوا تھی؟ جیتنے ایسا ہی تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ پر بہت بھاری بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے حد زور دے ہوئے تھے۔

وہ بے حد پریشانی کے عالم میں اٹھ بیٹھی۔ تب اس کی نگاہ ایک عورت پر پڑی اور وہ سکتہ زدہ کھڑی رہ گئی۔ یہ لڑکی نما عورت دہائیوں سے برآمد ہوئی تھی اور ایک چھوٹے توپے سے اپنے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ شانی کے لئے یہ تیسرا جھکا تھا۔ یہ لڑکی نما عورت اس کے لئے ابھی نہیں تھی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی بلکہ اس کے ناصر اچھا زکوہ کھینے کے بعد اسے توقع پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہ اس عورت کو بھی اپنے آس پاس دیکھے گی۔ یہ ناصر کی بیوی اور بڑی رکیکل شائلہ تھی۔ پچھلے تقریباً ایک سال میں وہ پہلے سے فرہ ہو گئی تھی۔ چہرے کی دلکشی بھی گناہوں کی سیاحت میں مائل ہو چکی تھی مگر اس کا لباس، یہاں یہ بیان غیر تازہ۔ اس کے چہیتے پٹھانوں سے جسم پر یہ لباس بالکل ناگاہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے گھونگر بالے بالوں کے نیچے پٹھانی پرچہ کا ہلکا سا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ ناصر یا چوہدری کے ساتھ ہونے والی کسی مار پیٹ کا نتیجہ تھا۔

شائلہ حسبِ عادت لہراتی ہوئی اس کی طرف آئی اور بے پائی سے بولی۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چھوٹی چوہدرانی آپ کے یہ کپڑے کسی اور نے نہیں، میں نے اُتارے ہیں اور بالکل بند کرے میں۔“

”یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ ایسا کیوں کر رہے ہو تم؟“ شانی رو ہانسی آواز میں بولی۔

”میں نے کیا کرنا ہے چھوٹی چوہدرانی! اب تو حکم کے نلام ہیں۔“

”چوہدری کدھر ہے؟“ اس کو بلاؤ اور میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گی، مجھے میرے کپڑے دو۔“ وہ چلائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سرخ آؤٹو میں اپنے کندھوں سے اتار کر دور پھینک دی۔

”کیا کرتی ہیں چھوٹی چوہدرانی؟“ شائلہ کلمت دار لہجے میں بولی۔ ”یہ مرد لوگ ایسے لال پیٹے کپڑے اتارنے کے لئے ہی پہنتا ہے۔ پر آپ خود تو نہ اتاریں۔ یہ اتار دیں گی تو پھر ہمیں کیا؟ کھڑی میں سے کسی نے دیکھ لیا تو؟“

”میرے کپڑے مجھے لا کر دو۔“ شانی گرج کر بولی۔

”وہ میں کیسے لاؤں دو تو کمرے سے باہر ہیں جی۔“ شائلہ نے دھجائی لہجے میں اردو بولی۔

شانی نے اپنی طرف دیکھا۔ اس کے گھٹے میں سونے کا جڑاؤ پار تھا۔ کانوں میں آؤپے اور کلانیوں میں طلائی چوڑیاں دک رہی تھیں۔ اس نے ہارتو ذکر پھینک دیا۔ سفید موتی پورے کالین پر بکھر گئے۔ اس نے آؤپے اتار دیے لیکن چوڑیاں وہ کوشش کے باوجود نہیں اتار سکی۔ اسے اپنے ہاتھوں پر صابن کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔ شانی کی مدد ہوشی کے عالم میں یہ چوڑیاں شائلہ نے اسے پہنائی تھیں اور پہنانے کے لئے ہاتھوں پر صابن لگایا تھا۔

شانی نے بے تاب ہو کر کمرے کا بند دروازہ زور زور سے بجایا۔ آواز پوری گونجی میں گونجنے لگی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

”چھوٹی چوہدرانی! کیا کرتی ہو؟“ شائلہ غصے سے بولی۔ ”رونا پینا تو مجھے چاہیے جسے چوہدری ورت کر (استعمال کر کے) چھوڑ دیا ہے۔ میرے قتل کی میراوی آج پوری ہو رہی ہیں۔ ششکوں والی رات آگئی ہے۔ آج تو خوج کچ چوہدرانی بننے والی ہے اور مجھے لگتا ہے باقی سب پیچھے رہ جائیں گے۔ اب چوہدری تیرے ہاتھ کی پکی ہوئی عی کھائے گا۔ جو سوا دے تو دے سکتی ہے اور کس نہ دینا ہے۔ وہ اب تک تیرے ہی انتظار میں روٹی سوچی کھا تا رہا ہے۔“

”کھوس بند کر۔“ شانی نے اسے دکھایا۔ ”چوہدری کو بلا کہاں ہے وہ؟“ نشہ آور دوا کے اثر سے شانی کا گلاسو کھرا تھا اور نظر دھندلا رہی تھی۔

”اتنی بے چین کیوں ہوتی ہو چھوٹی چوہدرانی! ابھی آجاتا ہے اور پھر سویرے سے پہلے نہیں جائے گا۔ تیرے سارے ارمان پورے کرے گا۔“ وہ کسی تائیکے کے سے انداز میں بولی۔

شانی نے اسے طمانچہ دے مارا۔ اس نے بالکل نہ انہیں منایا۔ بس اسے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ شانی چلائی۔ ”دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتا ہے۔ بے غیرت، بے حیا۔ گاڑی اور

بچنے کے لئے چوہدری کے اشاروں پر ہاتھی رہی ہے اور وہ میرا بے شرم شوہر بھی....." اس کا گھارندہ گہرا اور وہ حقیرانہ پورا نہ کر سکی۔

"بہت آکر ہے چھوٹی چوہدرانی! سو رہے مجھ سے نظر ملا کر بات کرنا پھر مانوں گی۔" وہ عجیب انداز میں بولی۔

اسنے میں بھاری قدموں کی آواز آئی۔ شانی نے مڑ کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ چوہدری بشیر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ تھامس تھا اور ایک مولوی صاحب تھے۔ لمبا ترنگ گاڑ ٹریل اور ٹرائفل ہاتھ میں تھا۔ چوہدری بشیر نے کلف لگا لیا سلیف جوڑا پہن رکھا تھا۔ دروازے کا لاک کھولا گیا اور یہ لوگ ندانے ہوئے اندر آ گئے۔

مولوی صاحب قدرے پریشان نظر آ رہے تھے۔ غالباً انہیں ماحول کی شدید تنگی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ "ووہ! کون کہاں ہے؟" مولوی صاحب بولا۔

"یہ تجھے کیا نظر آ رہا ہے؟" ناصر نے چنیزئی سے کہا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ جانے دو۔" شانی چلائی اور اس نے چوہدری اور ناصر کے درمیان سے راستہ بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ چوہدری بشیر نے اسے بازو سے پکڑ کر اتنی زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا کہ وہ سبز پر جاگری اور اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرایا۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ شانی جو پہلے ہی بڑی طرح پتھر کی ہوئی تھی، شیم بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ شائد اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ناصر اٹھا کر اس کی مدد کی۔

شانے نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا مولوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ان کی دھیمی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ "میں آپ سے شرمندہ ہوں جی۔ میں یہ نکاح نہیں چاہتا تھا۔"

"کیوں نہیں چاہا؟" چوہدری کی آواز شانی کی سماعت سے نکل گئی۔

"آپ کسی اور کا انتظام کر لیں جی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نکاح کے لئے لڑکی کی چوری دشنامدی ضروری ہے۔ اس طرح کا نکاح۔ نکاح نہیں ہوگا۔"

چوہدری اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے رہے۔ شانی کے دل میں ناامیدی کے گہٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی لمبی کرن پیدا ہوئی۔

درمیانی عمر کے مولوی صاحب نے کسی کو خاطر میں لانے بغیر دروازہ کھولا اور واپس چل دیے۔ چوہدری اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے تھے۔ شانی کو تھوڑا سا تعجب ہوا لیکن جلد ہی یہ تعجب دور ہو گیا۔ مولوی صاحب ابھی راجداری میں چند قدم آگے گئے تھے کہ کن

کئے ناصر نے اپنے لمبی قمیص کے نیچے سے سیاہ رنگ کا پھتول نکال لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ مولوی صاحب کو ٹکراتا اور رکنے کا حکم صادر کرتا، چوہدری بشیر نے اسے ایک جھلائے ہوئے اشارے کے ساتھ منع کر دیا۔ پھتول پھر ناصر کی قمیص کے نیچے چلا گیا۔ چوہدری خود آگے بڑھا اور مولوی صاحب کو روکا۔ بھرہ مکر سے یہ باہر جا کر مولوی صاحب سے بات کرنے لگا۔ چوہدری کی تاک کے اوپر وہی صوفی کی سلطنت نظر آ رہی تھی جو اس کے اندر کے شدید تناؤ اور شے کو نکال کر کرتی تھی۔ تاہم فی الوقت اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا ہوا تھا۔

شانے کو جو درد اٹھ گیا تھی اس میں شاید اعصاب شل کرنے والے اثرات تھے۔ وہ شائد اور ناصر کی گرفت میں مزاحمت تو کر رہی تھی مگر اس مزاحمت کی تاوانی خود اسے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بار بار کھیر تھوہرہ دہرا رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو۔"

جب اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ چوہدری بشیر نے اپنی جیب سے ہوا نکالا اور سوسے کے چند نوٹ نکال کر مولوی صاحب کو تھمائے۔ وہ مسلسل انکار میں سر ہلاتے رہے اور باہر جانے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے۔ چوہدری نے ہٹوے سے چند اور نوٹ نکالے۔ پھر چند اور نکاح خواں کے چہرے پر نرزی کے آثار دکھائی دینے لگے لیکن وہ ابھی تک پوری طرح آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی دوران میں لمبا ترنگ گاڑ پورڈی گاڑا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو بیکن شے کی زنجیر تھی۔ معلوم نہیں وہ خود آیا تھا یا چوہدری نے اسے اشارے سے بلا دیا تھا۔ شے کی سرخ زبان اور سفید کھیلے دانت چمک رہے تھے۔ اندر آتے ہی اس نے اپنے سینے سے لڑزہ خیز دھیمی آواز نکالی اور رشوت خور نکاح خواں کی طرف بڑھا۔ نکاح خواں کوئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ ہلکی سی طرح زرد ہو گیا تھا۔ چوہدری نے شے کو تری طرف ڈانٹا۔ اس کے بعد گاڑ کو انڈا کہہ دیا وہ اسے باہر لے کر جانے لگا۔ گاڑ شعل شعلے پر قابو پاتا ہوا اسے باہر لے گیا۔ شے کی گونج دار آواز دروازے میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

چوہدری نے لڑزائیں نکاح خواں کا شانہ تھکا اور اپنے ہٹوے کا تھوڑا سا مزید وزن نکاح خواں کی جیب میں منتقل کر دیا۔ اس نے دھیمی نکاح کیا اور پھر نکاح چوہدری کے لئے واپس لڑنے میں آگیا۔ یہ بنوں کو آمادہ کرنے کے لئے لائی اور ڈراوے کا وہی دو طرفہ کھیل تھا۔ حاشہ سے میں نیچے کی سطح سے بلند ترین سطح تک کھینچا جاتا ہے اور کھینچنے والا اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے ایک معمولی اہلکار نے لے کر کسی ملک کی حکومت تک کو اس طریقے سے باغ فرما کر لیا جاتا ہے۔ اس نکاح خواں کو پہلے رشوت کے ذریعے توڑا گیا پھر جو تھوڑی

”وڈے دیرے کی لڑائی سے پہلے۔“
 ”بہت خوب۔۔۔ اب کہاں سے رہیں؟“
 ”مجھے نہیں معلوم۔“

”اگر تجھے اتنی نہیں معلوم اور کسی اور کو بھی نہیں معلوم تو پھر وہ مرام زادہ دیرے پر ہتھے کی موت مرچکا ہے۔ تیری مدت شدت بھی پوری ہو چکی ہے۔ اب تو میری ننگوٹ۔ بیوی ہے اور میرا پورا حق ہے کہ تجھ سے ازدواجی تعلق قائم کروں اور تو مجھ پر پابند ہے کہ میری مرضی کے مطابق چلے۔“

شانی کی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک اس نے چوہدری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھے معاف کر دو چوہدری! مجھ سے تجھیں کچھ نہیں مل سکے گا۔ ایک مٹی کے برتن سے تم کیا حاصل کرو گے۔ میں اب بھی مافی ہوں کہ تم دوسرے چوہدریوں سے مختلف ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت بھی ہو اور محبت کسی کو پا لینے کا نام ہی نہیں ہے۔ محبت تو اپنا صلا آپ ہوتی ہے۔“

چوہدری چمنکار۔ ”یہ بات تو نے اپنے اس حرامی بار سے کیوں نہ کہی؟ اس سے تو شادی رجحانی اور خود کو پورے کا پورا اس کی گود میں پھینک دیا۔ اس شے نے بھی کہا تھا کہ بہت کسی کو پا لینے کا نام نہیں ہے۔“ اس نے گھبراہٹ سے سنتری بھولی کا ایک خوں رخ محسوس کیا اور بولا۔ ”یہ کیا کہیں تو ہیں کی باتیں اپنے پاس رکھو شانی! تم۔ میں بہت بے وقوف بن رہا ہوں، اب اور بے وقوف نہیں بننا ہے۔ آج وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔ اس میں اپنی مرضی تسلیم کرو گی تو تمہارے حق میں اچھا ہے، ورنہ میاں بیوی تو آج ہم کو بنا رہی ہے۔ باقی ساری باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔“

شانی کو لگا کہ تار چرکی خولی کا چوہدری فاخر جو بیٹھنے لڑھ برس میں قوتور تھوڑا چوہدری میں زندہ ہوتا رہا تھا، آج پوری طرح اٹھڑائی لے کر بیدار ہو گیا ہے۔ وہی چوہدری فاخر نے تار چرکی خولی میں از روایتی رشتے کی خوب صورتی کو لگا دیا کہ رکھ دیا تھا۔

چوہدری بشیر نے نیا سنگریٹ سلگایا اور دھواں اپنی مٹی سیاہ مہنچوں کے نیچے سے چھڑا دیا۔ ”ہاں شانی! تمہارے انہوں نے انہی میرے شے کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ اسے کہاں چاہا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ شانی نے روتے ہوئے نانی میں سر جھپکایا۔
 ”تمہیں سب کچھ معلوم ہے، لیکن تمہیں کچھ نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔۔۔ بہت۔ بہت۔“

بہت کسر ہو گئی اسے دھواں سے پورا کر لیا گیا۔ ہر طبقے اور ہر شعبے میں اس نکاح خواں جیسے جگہ اہر اصول پسند اور دراصل کٹر لوگ موجود ہوتے ہیں۔

اپنے قلعے میں سے نکاح کا قارم نکاح نکاح خواں نے خانہ پڑی شروع کر دی۔ شانی کا سارا احتجاج بے سود ثابت ہو رہا تھا۔ جب نکاح خواں نے باقاعدہ نکاح پڑھنا شروع کیا تو وہ اپنے جملے خواں کو جمع کر کے چلائی۔ ”یہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ میں شادی شدہ ہوں۔“
 چوہدری نے ایک لمحے کے لئے چونک کر شانی کی طرف دیکھا پھر نکاح خواں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنے تاثرات سے ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی ذہن کے خواں درست کام نہیں کر رہے اور وہ اسی جاتی بول رہی ہے۔ نکاح جاری رہا۔ پھر چوہدری بشیر اور شامک نے نیم جان شانی کا دایاں ہاتھ پکڑا اور زبردستی اس کا گھونٹا نکاح قارم پڑھا لگا۔

”مبارک مبارک۔“ کی مدھم آوازیں شانی کے کانوں سے ٹکرائیں۔ تب شانی نے دیکھا کہ کن کن ناصر مضافی کا ڈیڑھ کھول کر سب کا ہاتھ ملٹا کر وار رہا ہے۔ ایسا ہی ایک چھوٹا سا نکاح خواں کو دیا گیا۔ چوہدری بشیر نکاح خواں کو ضروری ہدایات دیتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ گارڈ سمیت باقی دو افراد بھی باہر چلے گئے۔

چند سیکنڈ بعد چوہدری بشیر زندہ ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے شامک اور ناصر کو بھی باہر جانے کو کہا۔ دو دونوں باہر چلے گئے۔ چوہدری نے دروازہ منقش کیا اور کانٹونی کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

”دیکھو چوہدری! میں جان دے دوں گی لیکن تمہاری مرضی پوری نہیں ہونے دوں گی۔“

”تو دے دیتا ہوں! لیکن ابھی تو میں تجھیں مرنے بھی نہیں دوں گا۔“ چوہدری کے لیے میں شراب پھر کار رہی تھی۔ ”بہت صبر کیا ہے میں نے۔ بہت ڈمبل دی ہے تجھے۔ لیکن تو عورت ہے۔ مرد کی مزید بھی پٹلی سے پیدا ہوئی ہے۔ تجھے سیدھا کرنے کے لئے اب دل کو تھوڑا سا سخت کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں۔۔۔ شادی شدہ ہوں۔ نکاح پڑھا نہیں ہو سکتا۔“
 ”کس سے ہوئی ہے تیری شادی؟“
 ”رستم سے۔“

چوہدری کے سنگھار چہرے پر دنیا جہان کی سفاکی ست آئی۔ ”کب ہوئی تھی یہ شادی؟“ اس نے پوچھا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جسمیں جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ تمہارے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ میں مہیا کر سکتا ہوں اور سننے کے لئے بھی اس کے باپ سے بڑھ کر کسی کا سایہ نہیں ہے۔ ویسے اگر تم مجھے تادیبیں کر میرا بیٹا کہاں ہے تو مجھے تھوڑی سی تسلی ہو جاتی۔“

چوہدری کے بخور چہرے پر سوجن کی پر چھائیاں تھیں۔ شانی جاتی تھی کہ یہ بے جس باپ اپنے بیٹے کا کیوں بچہ رہا ہے۔ وہ شانی کی مزاحمت دیکھ کر ہاتھ اور ٹانواں سوچ رہا تھا کہ اس مزاحمت کو کتنا طریقے سے اور مستقل طور پر توڑنے کے لئے بچے کا یہاں ہونا ضروری ہے۔

ایک دم شانی بے تاب ہو کر اٹھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ چانی دروازے کے اندر ہی گئی ہے۔ اس نے ایک کر دروازے سے نکل کر پچھتا چاہا۔ اس کا سر نہی طرح گھوم رہا تھا۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ نہی طرح لکڑھائی۔ وہ دوار سے نکل آئی مگر چوہدری نے اسے پکڑ لیا۔ چوہدری کی مضبوط ہاتھوں کا ٹھیکہ اس نے اپنی نازک کمر کے گرد محسوس کیا۔ وہ بظاہر اسے آرام سے لیکن حقیقت میں نہایت سختی سے سمجھ کر دایں بندہ پر لے آیا۔

”نہیں شانی بیٹھ، نہیں۔ اب اس طرح نہیں چلے گا۔ دوسرے بھی اپنی بہن پر اتنا ظلم ٹھیک نہیں ہوتا۔“ اس کی سخت گیر ناک پر نظر آنے والی سلوت مونی ہوئی تھی۔ مکمل کے ٹھیک شانی کے سختوں سے ٹھکر کرنا پور چوٹی کی ساری ٹانگیں تازہ کر رہے تھے۔

اس نے ٹھیک ہوئے انداز میں اپنا ہاتھ شانی کے ٹھیکے رخسار پر چھیرا۔ ”شاید غاغر نے تمہارے ساتھ ٹھیک ہی کیا تھا۔ تم جنم کی جینی ہو اور دوسرے جنم کی بیٹی ہو گی۔“ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

”شانی نے خود کو دیا کے کردہ ترین بوجھ سے محسوس کیا۔ ہاں یہ کردہ ترین بوجھ تھا۔ یہ اس مشتعل مرد کا بوجھ تھا جو ایک کمزور عورت کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرتا ہے۔ کیا کرنا چاہیے کہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شانی نے بے پناہ نفرت سے بٹیر کو پیچھے دھکیلا اور ایک مار بھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ بٹیر کے ہاتھ میں اس کی قمیض آئی اور اس نے پورے زور سے کھینچا۔ شانی لہر آ کر تالیاں پر گر گئی۔ بٹیر پھر اپنے غلیظ ہاتھوں پر بوجھ کے ساتھ اس کی طرف آیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے شانی کی سرخ کام دار قمیض پھاڑ دی اور اس کے دونوں ہاتھوں طرف میں بوجھ لئے۔ وہ ہانپی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولا۔“ تجھے بھولوں کی تاج پر بھٹاتا ہوتا تھا لیکن حرام زادی تیری قسمت میں نہیں تھا۔“

بابر سے کچھ آٹھنیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی دہنی شے گری ہے۔ بٹیر ذرا چونک کر

دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شانی بدستور اس کے بٹوں میں رہی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو بوجھ لینے کے بعد اطراف کی آہوں کا جائزہ لیتا ہے۔

مزید کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور بٹیر پھر شانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنی ٹھکانیاں بٹیر کی گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر یہ ایک بھڑے ہوئے شرابی مرد کی گرفت تھی۔ اسے قہر کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ شانی کا بالائی جسم بالکل مریاں ہو چکا تھا۔ شانی نے خود کو بالکل بے بس محسوس کیا تو اپنی بے پناہ نفرت کے اظہار کے لئے چوہدری بٹیر کے منہ پر تھوک دیا۔

یہ تھوک چوہدری کے منہ پر توپ کے گولے کی طرح لگا۔ چند لمحوں کے لئے وہ بھرا سا کیا۔ پھر اس کی دھشت کئی گنا فزوں ہو کر شانی کی طرف پلٹ آئی۔ اس نے ٹھیک کی طرح شانی کو بھینچنے کی کوشش کی۔ مطلقاً آہٹ ایک مرتبہ بھرا بھری۔ اس دفعہ یہ آہٹ دروازے کے پاس سے ابھری تھی۔ عالم دھشت و دہوشی میں بٹیر ایک بار پھر ذرا سا چونکا۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر ایک زوردار دھماکا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی باہر سے پوری قوت کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا ہے پھر دوسرا دھماکا ہوا۔ اس دفعہ بوجھ میں محسوس ہوا کہ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔

چوہدری سکتے میں تھا۔ وہ کچھ نہیں پارہا تھا کہ شانی کو چھوڑ کر اپنے ہسٹول کی طرف بڑھے، جو بستر پر پڑا تھا یا انتظار کرے کہ اس کے ساتھی دروازے پر حملہ کرنے والے کو بڑھیں۔ اسے یہ تذبذب پہنکا پڑا۔ اگلی ٹکڑ میں دروازے کا کھٹکا کھڑ گیا۔ اندر آنے والے نے چوہدری بٹیر پر گولی چلائی جو بیدار ہی اس کے سینے میں گئی اور یہ گولی نشانے پر کیوں نہ گئی۔ نوئی چلنے والے اس حسن ابدال کا باہر ترین نشانہ باطل خان تھا۔ شانی کو لگ رہا تھا، وہ جانتی تھیں اسے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ باطل خان اور یہاں؟ شاید وہ بھری واپس کا شکار ہو رہی تھی لیکن نہیں۔ یہ باطل خان ہی تھا۔ باطل خان کی ساری غیرت۔ سنگاٹ باڑوں کی ساری سختی اور آگ و بارود کی ساری تپش اس کے چہرے پر تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر

بابر کا ہاتھ وہ شادی اس وقت بیٹوں افراد کو بھی قتل کر سکتا ہے۔

شانی خود کو ڈھانچتی ہوئی ایک کونے میں سٹ گئی تھی۔ باطل کے بھلے پروہی سائیکلر ہاتھ جو دوڑے ڈیسے پرے رحم کے زیر استعمال تھا۔ باطل نے دوسرا ہاتھ چوہدری بٹیر کے ہاتھ پر پکڑ لیا۔ پانچ فٹ کی دوری سے کیا۔ سرے سے جھکا نہ کیا۔ چوٹیاں پر باطل کی طرف خون کا بارش نظر آیا۔ چوہدری بٹیر کی آنکھیں حیرت اور خوف کے عالم میں بھٹی ہوئی تھیں۔ یہ

اس کی زندگی کی آخری ساتیس حصیں مگر وہ پھر بھی شادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 "کتنے! امارا بہن ہے۔۔۔ کتنے! امارا بہن ہے۔" اجمل سینے کی پوری قوت سے دہڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں آنسو تھیں۔ پھر شادی نے دیکھا اس نے ہاتھوں سے ہاتھوں سے کم از کم حین مزید گولیاں بٹیر کے سر میں اتار دیں۔ اس کی پشیمانی کے پرے پڑنے اڑ گئے اور پورے اس کے ہماری بھر کم چہرے کو بھگوانے لگا۔ شادی کو لگا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ وہ دیوار کے ساتھ پھسل کر نیچے پڑی۔ اجمل نے اپنے سینے میں سے نیا میگزین نکال کر ہاتھوں سے اچھ کر لیا پھر اس نے ہسٹر کی چادر شادی کو لپیٹنے کے لئے دی۔ وہ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ شادی کا پتلا ہوا پہاڑی لباس بھی منگے سے اتر کر اس نے گول مول کیا اور شادی کو تھما دیا۔ پھر اس نے شادی کا بازو پکڑا اور تیزی سے باہر آیا۔ وہ رمارمار سے گزر کر بیڑیوں کے پاس سے گزرے۔ یہاں کے مناظر شادی کے لئے دل دہلا دینے والے تھے۔ اس نے بیڑیوں پر دو لاشیں دیکھیں۔ ایک لے تر گئے گاڑی کی تھی۔ سائینسٹر گئے پھل کی گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی۔ دوسری لاش ناصر اعجاز کی تھی۔ وہ بیڑیوں پر پشت کے تل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سمیت پر گئی ہوئی تھیں۔ شادی سکڑا زہر لگی۔ ناصر کی چھاتی پر اور پیٹ پر چاقو کے کم از کم چھ وارے، گئے تھے۔ خون اس کے پورے لباس کو بھگو چکا تھا۔ شادی کے دلال غلام شہر کی کہانی اپنی تمام "ناپاک لالچ" سمیت آج ان بیڑیوں پر فخر ہوئی تھی۔
 بیڑیوں کے اوپر سے بھی تھوڑا تھوڑا خون پگھ رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ایک آدھ لاش اور بھی موجود ہے جو نظر نہیں آ رہی۔ یوں لگتا تھا کہ جو بھی اجمل کے سامنے آ رہا ہے، آنا غانا اس کی وحشت کا دکھارہوتا رہا ہے۔ اسے پھل کی گولی لگی ہے یا تھوڑا دھار آئے ہے اس کا سینہ جھجے دیا ہے۔ یہاں شادی کو ایک چیل لی جو اس نے پہن لی۔
 "مجھے کہاں لے جا رہے ہو اجمل؟" شادی پوچھتی پوچھتی آواز میں بولی۔
 "آپ بے فکر ہو امارا بہن۔ ام آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے دے گا۔"
 وہ ایک کمرے کے سامنے سے گزری اور شادی کو ایک اور جھگڑا لگا۔ کمرے کے فرش پر لٹا خواس مرد پڑا تھا۔ اس کی بالائی جبب میں سے سرخ اور نیلے نوٹ اپنی جھلک دکھا رہے تھے جیسے وہ نیچے گرنے کے لئے بے تاب ہوں۔ قریب ہی بیڑ پر روست مرغ کی ہڈیاں اور روٹی تان کے پتے ہوئے ٹکڑے تھے۔ درمیانی رات کا یہ کھانا لٹکا خواس کو بہت مریض پڑا تھا۔ گیسوں کے ساتھ وہ بھی گھن کی طرح پڑ گیا تھا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے میں گئی تھی اور کان کی طرف سے نکل گئی تھی۔

کبھی سے دروازہ کھٹکھٹانے جانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کوئی نسوانی آواز میں دایلا بھی کر رہا تھا۔ آواز میں مدھم مدھم گھن گھن غور کے سنی جا سکتی تھیں۔
 "یہ کیوں ہے؟" شادی نے پوچھا۔
 "ان ہی کی کوئی ساتھی ہے۔ ام نے عورت کچھ کر چھوڑ دیا تھا۔ ایک غسل خانے میں بند کیا ہے۔ امارا تو خیال ہے اسے بھی یاد کر دیا جائے۔"
 "نیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس نے؟" شادی نے پوچھا۔ اجمل خان نے اثبات میں جواب دیا۔ شادی سمجھ گئی کہ وہ شاید ہے۔ اس کے چہرے پر شہید کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ دہتر میں دشمن تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کسی جاہل کا نیک سا کاردار اور گری تھی لیکن شادی اس کے لئے بھی موت نہیں چاہتی تھی۔
 "نہیں اجمل۔" وہ کراہی۔ "وہ عورت ذات ہے۔ رہنے دے۔"
 اجمل ایک لمبے کے لئے ٹھکا پھر شادی کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا کونھی کی چھٹی سمت میں آ گیا۔ یہاں درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا۔ اجمل خان نے اپنی جبب میں سے چابیوں کا ایک چھوٹا ٹکڑا نکالا اور لوہے کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ یعنی بات تھی کہ اجمل نے یہ کچھ کسی مقتول کی جبب سے نکالا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک چھوٹی سڑک کے ساتھ ساتھ قریباً تین فٹ چوڑی گرین ٹیلٹ دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر ٹریک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک نیکی کار اس طرح کمزری تھی جیسے خراب ہو۔ اس کا ہونٹ اٹھا ہوا تھا۔
 شادی نے اندازہ لگا لیا کہ اجمل خان اس نیکی پر یہاں پہنچا ہوگا۔ فی الحال اس کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہاں کیونکر پہنچ سکا۔ ایک بار پھر احتیاط سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اجمل نے شادی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر نیکی کار تک آ گیا۔ اس نے شادی کو چھٹی نشست پر بٹھا یا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ رات کے اس پیر سڑک پر اطراف میں مکمل خاموشی تھی۔ اسٹرینٹ لائٹس اور گھروں کی اکادکار و شیاں کبیر آلود تار پٹی میں اوجھتی محسوس ہوتی تھیں۔ دور کہیں کسی لین میں چوکیدار کی سیٹی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔
 شادی نے مڑ کر کونھی کی طرف دیکھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بظاہر اس نے سکون کونھی کے اندر تھوڑی سی دی دیر پہلے پانچ چوٹوں سے پکے ہیں اور یہ تو کسی گینگ یا قاتل نوٹے نے نہیں کئے، نہ ایک شخص نے کئے ہیں اور وہ شعلہ صفت شخص اس وقت شادی کے ساتھ اس نیکی میں

موجود ہے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے سنبھال چکا تھا مگر پتا نہیں کیوں تذبذب میں نظر آ رہا تھا، جیسے سوچ رہا ہو کہ گاڑی آگے بڑھائے یا نہیں۔ تب ایک دم وہ باہر نکل آیا۔ کبھی کھڑکی میں جھک کر شانی سے بولا۔ "شانئی بہن! آپ بے پکر ہو کر بیٹھیں۔ ام ایک سینکڑ میں آیا۔"

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہہ پاتی، وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پھر گٹھی کے اندر چلا گیا۔ اندر جانے کے لئے اس نے وہی لوہے کا دروازہ استعمال کیا تھا۔

اس کی ادھی تین چار منٹ بعد ہوئی۔ دروازہ کھلیا۔ اس نے تیزی سے گرین لیٹرب پارک کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چند سینکڑ بعد ٹیکسی تیزی سے ویران سڑک پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت ایک سیاہ ہونڈا اس کا ریتیزی سے ٹرن لے کر گٹھی کے مین گیٹ کی طرف مڑی۔ کار کے دبے ہوئے شاخس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں کم از کم تین چار افراد موجود ہیں۔

"کہاں گئے تھے اہمل؟" شانی نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"وہ ایک چیز وہاں رہ گیا تھا۔"

"مجھے سے صیحت مت بولو اہمل۔"

"ام۔ ام۔ سمجھ نہیں۔"

شانئی نے ذرا توقف کیا پھر گھمبیر لہجے میں بولی۔ "اس لڑکی کو بھی قتل کر آئے ہو یاں؟"

اہمل کو جھٹکا سا لکھن دو خاموش رہا۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیرنگ ڈنبل پر تھپتھپ رہے تھے۔ چند سینکڑ بعد اس کی آواز ابھری۔ "آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"میری بات کا جواب دو۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ ام مانی چاہتا ہے شانی بہن! لیکن ام کو یہی مناسب لگا۔ جو مار مار کر بھی یہاں ہوا ہے۔ یہ عورت اس کا چشم دید گواہ تھا۔ یہ امار سے اور آپ کے لئے مصیبت بن سکتا تھا۔ ام سمجھتا ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ جات امار سے۔ میں اُس دن ام ان لوگوں کو بار بار زندہ کر کے مارتا۔" اہمل کے لمبے میں آتش فشاں بلب رہے تھے۔ اہمل کا یہ روپ شانی کے لئے حیران کن تھا۔ خاموش شاید یہ سوچ جی نہیں سکتا تھا کہ ایک جتنے جتنے خوش باش شخص کے پیچھے ایسا گھمبیر و شعلہ صفت بندہ چھپا

پہ

"یہ امار سے؟" شانی نے دل لرزہ آواز میں پوچھا

"زیادہ تکلیف نہیں دیا۔ بس ایک گولی کھینچ میں اتار دیا۔"

شانئی کی آنکھوں میں شاکل کی شکل گھومی۔ وہ چھپس ستائیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی، لیکن وہ اور اس کا شوہر بغیر کسی محنت کے بہت جلد بہت کچھ حاصل کر لینا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے جو بددی بھڑکی میٹ پر کسی کو سڑھی بنا رکھا تھا۔ آج وہ آغا ناٹا چوہدری بشیر کے ساتھ ہی خاک و خون میں لوٹ کر تپا پھو گئے تھے۔

شانئی وقت کی تیز رفتاری پر سشدرد تھی۔ اب سے صرف دو چھل مری کے دور افتادہ خاموش پہاڑوں میں تھی۔ ان دو چھل ان کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ وہ راولپنڈی کی پہنچی جلی جملہ چوہدری بشیر اور اس کی شعلہ فطانی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اب چوہدری بشیر اپنی چاقی تمام تر دوشٹ اور سے قرار یوں سمیت راسی عدم بھی ہو چکا تھا۔ اسے ابھی تک یہ یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ بشیر مڑ چکا ہے۔

شانئی نے لرزاں آواز میں اہمل سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں روکیت واپس جانے کا کہہ دیا تھا۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"آم آپ کو سب کچھ بتاتا ہے۔ ذرا ام پہلے کسی مجمع جگہ پر پہنچ جائے شانی بہن۔" اہمل نے دھڑکن پر لگا ہی جھائے جھائے کہا۔ وہ تیزی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہو گیا اہمل۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔"

"ام خود بھی ان سب کو مارتا نہیں چاہتا تھا مگر پتہ نہیں تھا یہ کیا ہو گیا تھا۔ ام ان کو نہ مارتا تو وہ ام کو مارتا اور آپ کے لئے تو ام اس سے دگنا بندہ سے بھی مار سکتا تھا۔" اہمل کی آواز بھی جذبات کی شدت سے کاتب رہی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ٹیکسی کا ایک متوسط درجے کی رہائشی آبادی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک دو منزلہ مکان کے سامنے کچھ کرکسی رکھی گئی۔ اب رات کے تین بجتے والے تھے۔ چہار نو خاموشی تھی۔ کچھوں میں آواز و کنوئیں کی آوازوں کے سوا سناتا تھا۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ یہاں ایک اور ٹیکسی بھی اوس میں بیٹھی ہوئی کھڑی تھی۔ اہمل خان نے آڑ کر لوہے کے چھوٹے سے گیٹ پر نکل دی۔ دبلے چہرے والا ایک شخص باہر آیا۔ ایسا لگتا تھا وہ جیسے پہلے سے ہی اہمل کا انتظار کر رہا تھا۔ اہمل شانی کو لے کر فوراً گھر کے اندر آ گیا۔ اب پہلی بار شانی نے اہمل کے پاؤں کی انگڑا بہت محسوس کی۔ اس کا یہ پاؤں بھورے سا تھیں کے مزار پر جماداروں کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوا تھا، یہ اہمل کی بہت تھی کہ وہ اس پوت کو خاطر میں لائے بغیر نقل و حرکت کر رہا تھا۔ یہاں محض میں شانی کو وہ ڈال سیتی لوڈر بھی کھڑا نظر آیا

جس نے انہیں بھورے وال سے مری پہنچایا تھا۔ شانی نے اس چار دیواری میں کھینچے ہی سب سے پہلے اپنے اوصورے لباس سے نہایت حاصل کی تھی اور ایک زنا نہ جوڑا پہنا۔ بستر کی چادر کی جگہ سے ایک شال مہیا کر دی گئی۔

شانئی کو چنگی منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بلب روشن تھا۔ پرانی طرز کے پھول دار فرش پر پرانی طرز کا ڈیزائن دار چنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف چار پائی چھٹی ہوئی تھی۔ شانی یہاں ڈولے اور شہاب کو کچھ کرانے لگا۔

”اجمل! یہاں دوں یہاں کیسے؟“ شانی نے تعجب سے پوچھا۔

”یہ بھی کل رات ہی یہاں پہنچا تھا۔ ان کو مارا یہ پنڈی وال دوست شیر محمد یہاں لے کر آیا ہے۔“ اجمل نے دہلے چہرے والے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے گیت کھولا تھا۔

شیر محمد نے مقامی لب و لہجہ میں اجمل خان سے پوچھا۔ ”کھانا کھاسو۔ یا چائے پیو؟“

اجمل نے سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ شیر محمد بولا۔ ”چلو جی! میں جوتا ہوں (جاتا ہوں) اگر تم اس کو کسی بھی شے کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔“

شیر محمد کے جانے کے بعد شانی نے رو بانی آواز میں اجمل سے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہوا ہے۔ تم کو کچھ کیسے پہنچے ہو یہاں؟“

اجمل نے بے حد تعجب و کجگوشی میں کہا۔ ”ام کو امید ہے، درحکم بھائی کی طرح آپ بھی ام کو معاف کر دے گا۔ آپ کے منع کرنے کے باوجود ام آپ دونوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ شاید امارے بس میں ہی نہیں ہے۔“

”تو تم ریکٹ واپس گئے ہی نہیں؟“ شانی اپنی گردن کی خراشوں کو شال سے ڈھانچتے ہوئے بولی۔

”نہیں شانی! بہن! امارے پاس آپ کا نام رہانی کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ام آپ کے پیچھے گھوڑے پر ہی مری پہنچا تھا۔ وہاں مری میں لوگ گھومڑوں پر گھومتے رہتا ہے۔ ام پر بھی کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ام نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے گھوڑا چھوڑ دیا۔ اوصور ہسپتال میں ام کو وہ ڈاکٹر نظر گیا جس پر ام اسٹینڈر جیٹ کو لے کر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ام کو یہ بھی پتا چل گیا کہ چھوٹا (ڈولا) ڈالے کے اندر ہی سویا پڑا ہے۔ ام اگلے روز صبحی آپ کے آس پاس ہی رہا تھا۔

جب بپ میڈیکل سٹور سے دوکانی لینے گیا تب بھی ام آپ کے آس پاس تھا۔ وہاں ام کو شک پڑا کہ ایک بندے نے ام کو پہنچاتا ہے اور کچھ دور تک آپ کا چھپا بھی کیا ہے۔ ام اور بھی چوکس ہو گیا۔ اسی دوران میں اللہ تعالیٰ نے امارا مدد پر مایا۔ ام کو اپنا یہ پرانا پنڈی وال دوست شیر محمد مل گیا۔ یہ وہاں مری میں ڈرائی پروٹ کا کم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تین چکی بھی پنڈی اور مری کے درمیان چلتا ہے۔ ام نے اس کو بتایا کہ ام کو اس کا ایک چکی کا ضرورت پڑ سکتا ہے۔ اس نے چکی پر امارے حوالے کر دی۔

اجمل خان نے ذرا توقف کر کے گہری سانس لی اور خاموش بیٹھے ڈولے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”چھوٹا بھائی کا نظر دہاتی جتنی تیز ہے۔ اور کان وغیرہ نظر سے بھی زیادہ تیز ہے۔ ام اس سے پتہ چلا جاتا تھا لیکن اس کو پتا چل گیا کہ ام ہسپتال کے احاطے میں موجود ہے۔ اس نے ام کو دیکھ لیا۔ ام نے اس سے رشتہ کیا کہ یہ لہو مالل آپ کرنا۔۔۔ ہارے میں کچھ نہ بتائے۔ شام کے بعد جب اچانک ہسپتال کا لائٹ گیا تو ام، ڈولا اور شیر محمد پاس ہی کھڑا تھا۔ ڈولے نے ام آپ کو بھاگ کر پھینچنے کی طرف جاتے اور ایک سوزوکی ڈبے میں بیٹھنے ہوئے دیکھ لیا۔ ام پورا ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی کو ڈبے کے پیچھے لگا دیا۔ شیر محمد بھی امارے ساتھ تھا۔ جانے سے پہلے ام نے چھوٹا بھائی کو شیر محمد کا موبائل نمبر دے دیا تھا۔ ام نے پنڈی تک بڑی احتیاط سے سوزوکی ڈبے کا پیچھا کیا اور دو نمبر کو بھی دیکھ لیا جس میں آپ کو لے جایا گیا تھا۔ اب آپ امارا بات بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوگا۔“

”ڈولا اور شہاب یہاں کیسے پہنچے؟“ شانی نے پوچھا۔

”کل رات نو بجے شیر محمد کے موبائل پر چھوٹا کا کال آیا۔ اس نے ام کو بتایا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور بہت پریشان ہے۔ چھوٹا آپ کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔ ام نے اس کو تسلی دیا کہ آپ کا پتا چل گیا ہے۔ پھر ام نے اس سے کہا کہ ابھی شیر محمد کا دوسرا ٹیکسی ہسپتال پہنچ جائے گا۔ وہ اور شہاب خاموشی سے اس میں بیٹھ کر پنڈی پہنچ جائے۔“

”ہسپتال میں کسی کو پتا چلا کہ کیا ہوا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ لوگوں کو کڑا بڑی کاشک ہو گیا تھا۔ ایک عورت نے دو ہندوں کو آپ سے کھینچا تھائی کرتے دیکھ لیا تھا۔ بعد میں سب لوگ شہاب سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شہاب نے قتل مندی کیا کہ خاموشی سے ڈولے کے پاس آیا اور دونوں ہسپتال سے نکل کر ہال روڈ کی طرف چلا گیا۔ بعد میں ڈولے۔۔۔ امارا مطلب ہے چھوٹا نے وہیں سے شیر محمد کے موبائل پر فون کیا تھا۔“

شانی کے چہرے پر ابھی تک بیچانی تاثرات تھے۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں جھکا دیا اور منٹائی۔ ”یہ بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے، اہمل ابہت بڑا۔“

”کیا آپ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہیں یا جی ہاں؟“ ڈولے نے پوچھا۔

”ہاں ڈولے! میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ شانی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

ڈولا اور شہاب فوراً باہر چلے گئے۔ شانی نے کہا۔ ”اب کیا ہوگا اہمل؟ جو بدری بشری موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بڑی پھل پھلے گی۔ پتا نہیں کس کس کی معیت آئے گی؟“

”تسلیمات صرف ایک ہے۔ جس جس نے بھی اس کوشی میں آپ کو دیکھا اور پہچانا ہے وہ زندہ نہیں ہے۔ مری کے ہسپتال میں بھی آپ کو کسی نے نہیں پہچانا۔ نہ ہی یہاں راولپنڈی میں کسی نے دیکھا ہے۔ آپ مہینوں سے لا پتا ہیں۔ ادارے سندھ میں خاک رستم بھائی کو نمروہ سمجھ لیا گیا ہے۔ امید نہیں ہے کہ ان قتلوں کے لئے کسی کا دھیان جلدی آپ کی طرف پائے گا۔“

”لیکن ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا اہمل۔ کیا چتا چوہدری بشری نے لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے ہی کسی کو میرے بارے میں بتا دیا ہو۔“

”چلیں جو بھی ہے، اگلے دن بارہ گھنٹے میں سامنے آ جائے گا۔“

پھر اہمل شانی کو بتانے لگا کہ وہ کیسے اور کیونکر کوشی میں داخل ہوا اور داخل ہونے کے بعد کیا ہوا۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ اہمل خان کو کل رات ہی کوشی میں گھسنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے کوشی کے چھوڑے نیکی کے راکمڑی کی اور اس کا ہونٹ افگن دیا تا کہ وہ خراب نظر آئے۔ یہ ایک سازگار اتفاق تھا کہ کوشی میں ٹھنٹ کے بعد اہمل خان کسی کو نظر نہیں آیا۔ رکھوائی سے ٹھنٹے نے تھوڑی دیر شور مچایا پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ جس وقت اہمل کوشی میں گھسا، شانی کمرے میں بندھی اور کمرے کے ناصر پر چار دیواری تھی۔ اہمل اس کی آواز نہیں کرتا ہوا اس کمرے تک پہنچ گیا اور ساتھ والے کمرے میں چپ گیا۔ یہ ایک سنوروم تھا

اور سالانہ پر پڑی ہوئی گرد و غبار کے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے شاید دھاری کھولا جاتا ہے۔ اہمل کے چھپنے کے لئے یہ جگہ بڑی مناسب تھی۔ اس سنوروم کا ایک چھوٹا دروازہ اس کمرے میں بھی کھلتا تھا جس شانی کو رکھا گیا تھا تاہم یہ دروازہ نہ منتقل تھا۔ اس دروازے کی موجودگی سے یہ فائدہ ہوا کہ اہمل تک وہ ساری آوازیں پہنچتی رہیں جو شانی والے کمرے سے ابھرتی تھیں۔ اہمل نے وہ سنگین گفتگو بھی کان لگا کر سننی جو شانی اور چوہدری بشری کے درمیان ہوئی

تھی۔ اس گفتگو کا کافی حصہ اہمل کے کانوں تک بھی پہنچا۔

جب شانی نشہ آور دوا کے زیر اثر مگر بی خودگی میں چلی گئی تو اہمل نے سنوروم اور کمرے کے درمیانی دروازے کو قفل کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

بعد ازاں کمرے میں نکاح خواں مولوی داخل ہو گیا اور اہمل پر صورت حال کی مختصر مزید واضح ہو گئی۔ جب کمرے میں زبردستی شانی کا نکاح پڑھا جائے گا تو شانی کی جارحی، اسی وقت سنوروم کا دروازہ اچانک کھلا اور کسی نے سنوروم کی لائٹ جلاتا چاہا۔ حنفیہ انندم کے طور پر اہمل نے سنوروم کا بلب اتار رکھا تھا تاہم آنے والے کے پاس تاریخ بھی تھی۔ اس نے دفعتاً تاریخ جلائی۔ اہمل خان جو کچھ تقریباً پچاس گھنٹوں سے اس سنوروم میں چھپا ہوا تھا مزید چھپا نہ سکا۔ اس سے پہلے کہ اندر آنے والا اہمل کو دیکھ کر شور مچاتا، اہمل نے اس کے دل پر خنجر کا وار کیا اور اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ باہر کمرے سے دو افراد نے سنوروم میں ہونے والی گڑ بڑ کو محسوس کر لیا اور منتقل ہو چکے تھے۔ اہمل خان سمجھ گیا کہ اب چھپنا اور خاموش رہنا پکار ہے۔ اس نے اپنا سائنکلسر لگا پھل نکال لیا اور سیز بیوں کی طرف لڑکا۔ یہاں اس نے گاڑ کو باہر سے اور ناصر کو گنجر کے پے دوپٹے سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب چوہدری بشری کمرے میں شانی سے دست درازی کر رہا تھا کسی کے زمین ہوس ہونے کی آوازیں سنائی دی تھیں اور ڈوڈا رے کے لئے وہ ٹھک گیا تھا۔ یہ گاڑ یا ناصر اٹھارے گرنے کی آوازیں سن رہی تھیں یا پھر دونوں کے یکے بعد دیگرے گرنے کی آوازیں ہوں گی۔ نکاح خواں کمرے میں کھاتا کھاتے ہوئے قفل ہوا۔ اس نے نہ صرف شور مچانے کی کوشش کی بلکہ کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کرنا چاہا تھا۔ کمرے میں فون سیٹ موجود تھا شاید وہ دروازہ بند کر کے فون استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اہمل نے اسے اتنی سہلت نہیں دی تھی۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے لیکن نہایت خاموشی سے ہوا تھا۔ اندرونی کمرے سے شانی سے دھجکا مشتاق کرتے ہوئے بدست بشری کو اس آفت کا پتا بھی چلا تھا جب اہمل نے کمرے کے دروازے پر ہلا بولا تھا۔

اہمل کی پوری زرداد سننے کے بعد شانی کو اہمل کی بے پناہ دلیری اور خدا داد ہمت کا احساس ہوا۔ اس نے کوشی کے سنوروم میں قریب ایک دن تک بڑے صبر سے مناسب موقع کا انتظار کیا تھا اور جب موقع آیا تھا تو وہ بالکل کی طرح تڑپ کر اپنے حریفوں کو خاکستر کر دیا تھا۔ اس کا یہ دوپٹہ اس کے غباری روپ سے بہت مختلف تھا۔

اگلے روز اہمل خان کا دوست شیر محمد کہیں سے دوپٹہ کا ایک اخبار ڈھونڈ لایا۔ اس اخبار

میں کل رات زینت کالونی کی ایک کوشی میں ہونے والی لڑوہ خیز واردات کا احوال شہ سرنیوں کے ساتھ درج تھا۔ کچھ لاشوں کی خون آلود تباہی بھی چھانی گئی تھی۔ شہ سرنی بھی۔ "لاہور کے مشہور صنعت کار سمیت سات افراد کا بھانہ قتل۔"

لیکن اس شہ سرنی کے نیچے جو ذیلی سرخیاں اور تصویروں میں جنس انہوں نے شانی اور اجمل وغیرہ کو بری طرح چوکنڈا دیکھا تھا۔ "کمرشل پلاٹ کی ملکیت کا شاخسانہ۔ وحدت گروپ کے لوگوں نے پرسوں ہونے والے قتل کا بدلہ چکا دیا۔ خونی واردات میں چوہدری بشیر اس کا سیکرٹری ناصر اعجاز اور اس کی بیوی شائکہ بیگم بھی شامل ہیں۔ تمام افراد کو بے دردی سے مارا گیا۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تیز دھارے والے سے بھی وار کئے گئے۔"

ان ذیلی سرخیاں کے نیچے کھلم خبر کا متن اس طرح تھا۔ "صدر کے علاقے میں کمرشل پلاٹ کی ملکیت سے جنم لینے والا تنازعہ کل رات ایک خونی واردات کا سبب بن گیا۔ وحدت گروپ کے لوگوں نے زینت کالونی کی ایک کوشی پر دھاوا بول کر صنعت کار چوہدری بشیر اور اس کے سیکرٹری و گاڑ سمیت سات افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یاد رہے کہ دو کیٹال کا یہ پلاٹ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان جھگڑے کی بنیاد پر تاجزاد بنا ہوا تھا۔ یہ پلاٹ چوہدری بشیر کی شائش فیکٹری سے ملحق ہے اور چوہدری کو اس کی ملکیت کا دعویٰ تھا۔ صرف دو دن پہلے مری روڈ کے علاقے میں وحدت گروپ کے ایک نواز راہبانی شخص کو موٹر سائیکل سواروں نے بے رحم مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ باخبر طبقوں کا کہنا تھا کہ یہ کارروائی چوہدری بشیر کے کارندوں نے کی ہے اور وحدت گروپ کے لوگ جلد ہی اس کا بدلہ لیں گے۔"

شانی نے یہ طویل سسٹی فیئر خیر آفریک پڑھی اور سانسے میں رو گئی۔ اسے خوارق و سیاہ ہنڈا کار یاد آئی تھی جو اس نے اجمل کے ساتھ کوشی چھوڑنے وقت کوشی کی طرف مڑتے دیکھی تھی۔

پھر شانی کی نگاہ اسی خونی واردات کے حوالے سے ایک اور چھوٹی خبر پر پڑی۔ اس خبر میں لکھا تھا۔ "حملہ آوروں کی سیاہ ہنڈا موٹر واردات سے صرف ایک گھنٹہ کے فاصلے پر حادثے کا شکار ہو گئی۔ کار ایک آتشیں دھن سے نکل کر گرین بیلٹ میں ٹھس گئی۔ اسی دوران میں پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی اور سب انسپلر نے وحدت گروپ کے تین افراد کو پکچان لیا۔ ان لوگوں سے واردات کے دوران استعمال ہونے والے ہتھیار بھی برآمد ہوئے ہیں۔ وحدت گروپ کے کم از کم تین افراد بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں

چھاپے مار رہی ہے۔ وحدت گروپ کی طرف سے اس واردات سے لاطلفی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ وحدت گروپ کا سرخز راہب وحدت روپش ہو گیا ہے۔"

یہ خبریں بڑی قویہ خیز تھیں اور بہت غیر متوقع بھی۔ شانی کو یاد تھا کہ جب دوسری سے زینت کالونی کی کوشی میں پہنچائی گئی تھی تو اس کے تصویری ہی دیر بعد ناصر نے فون پر چوہدری بشیر کے موبائل پر بات کی تھی۔ اس نے شانی کی بھلائی آمہ کے علاوہ کسی جھڑوے کی بات بھی کی تھی۔ اس نے سنگین لہجہ میں کسی پٹواری اور قانون گو وغیرہ کا ذکر کیا تھا۔ غائب یہ اسی جھڑوے کے نتائج تھے جو آج اخباروں کی سرخیاں میں نظر آ رہے تھے۔

اطلاق یہ ہوا تھا کہ اس کوشی میں کوئی گواہ زندہ نہیں رہا تھا۔ شانی اور اجمل وہاں کوئی ایسی شہادت بھی چھوڑ کر نہیں آئے تھے جو شانی کی طرف اشارہ کر سکتی۔ یہاں تک کہ شانی کا پیڑا لباس بھی اجمل بیگ سے اٹار کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ یقین ممکن تھا کہ اس واردات کی تحقیق کوئی دوسرا رخ اختیار کر جاتی۔

شیر محمد کے گھر میں فون موز جوتا۔ یہاں سے شانی نے ایک بار بھر حاجی حلیت اور اس کے خاص ماتحت سب انسپلر اختر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد کامیابی ہوئی۔ اس کا رابطہ سب انسپلر اختر کے موبائل سے ہو گیا۔ اختر اسلام آباد میں تھا۔ شانی نے اسے بتایا۔ "تین دن سے جہیں نہیں کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اختر! حاجی حیات سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟"

"شانی بی بی! میں تو ایک تاریخ پر اسلام آباد آیا ہوا ہوں۔ حاجی حیات صاحب اسی معاملے کے پیچھے گئے ہوئے ہیں۔" اختر کا اشارہ رسم اور ناصر وغیرہ کی کشدگی والے معاملے کی طرف تھا۔

شانی کا دل ہڑک اٹھا۔ "کوئی خبر ہے؟"

"نہیں، میرے پاس تو نہیں ہے بی بی۔ شاید حاجی صاحب کے پاس ہو۔"

شانی نے کہا۔ "اس وقت جہیں ایک ضروری اطلاع دیجی ہے۔ حلیت ڈی ہوا ہے اور مری کے ہسپتال میں ہے۔ اسے فوری نگہداشت اور توجہ کی ضرورت ہے۔"

شانی نے اس بارے میں ڈھکے پیچھے الفاظ میں اختر کو بتایا۔ وہ فون پر وضاحت سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اختر نے کہا۔ "اب آپ اس کے بارے میں بے فکر ہو جائیں۔ میں حاجی صاحب سے مشورے کے بعد ابھی اس کا انتظام کر رہا ہوں۔"

"حاجی صاحب کہاں ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

”وہ تو راولپنڈی میں ہی ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں؟“

شانی نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ وہ بمبئی جلد ہی مل سکیں انا ہی بہتر ہے۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ وہ پہلی کی طرح سادہ لباس میں آئیں۔

اختر نے شانی سے اس کا موجودہ ایڈریس پوچھا جو شانی نے بتادیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد حاجی حیات گھر کے دروازے پر موجود تھے۔ شانی کی ہوا کس تیز ہو گئیں۔ حاجی حیات اسے رستم کے بارے میں کوئی اچھی خبر دے سکتے تھے اور رستم کے حوالے سے کسی اچھی خبر کے لئے وہ اسی طرح تری ہوئی تھی جیسے کئی دن صومالیہ میں بیٹا سا بچھٹے والا پانی کے لئے ترستا ہے۔

حاجی حیات ایک خستہ حال مرد کا میں یہاں پہنچے تھے۔ وہ شلوار قمیص میں تھے اور ایک سوئی چادری بٹن ماری ہوئی تھی۔ کوئی قریبی شخص ہی انہیں اس طبقے میں پہچان سکتا تھا۔ ان کی نگاہیں شانی کی نگاہوں سے تھیں۔ شانی کی نگاہوں میں امید کے ستارے چمکے لیکن فوراً ہی بجھ گئے۔ حاجی حیات کے چہرے پر اسے کوئی حوصلہ افزا تاثر نظر نہیں آیا۔ شانی کو لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ اس نے خود کو یہ مشکل سمجھا۔ گھر کی بیٹھک میں حاجی حیات سے اہمیل اور شانی کی طویل بات چیت ہوئی۔ سب سے پہلے تو حاجی حیات نے شانی کو تسلی بخشی دی اور اسے یقین دلایا کہ رستم کا کھوج بنے تک وہ چین سے بیٹھیں گے اور نہ تلاش کی رفتار سست ہونے دیں گے۔ حاجی حیات نے تحقیق کی تفصیل سے شانی کو آگاہ کیا۔ اس کے بعد حاجی حیات نے شانی سے دریافت کیا کہ وہ یہاں کیونکر اور کیسے پہنچی اور حقیقہ کے رخی ہونے کا کیا جواز ہے۔

جواب میں شانی نے تقریباً بھی کچھ حاجی حیات کو تفصیل سے بتادیا۔ خوالہ انداز کی یہ وہ تلاش جو اس نے دروازہ قہقہوں کے حوالے سے شروع کی تھی۔ پھر ان کی ناگہانی موت اور حقیقہ کا رخی ہونا۔ اس کے بعد شانی اور اہمیل کا حقیقہ کسری لاتا اور بعد ازاں سری میں ہانگل غیر متوقع طور پر شانی کا ناصر اعجاز کے ہتھ چڑھ کر چوہدری بشیر کی دسترس میں چلے جانا۔ شانی نے ذہن کا لوٹی میں غیش آنے والے سارے واقعات الف سے بے تک حاجی حیات کے گوش گزار کر دیے۔

حاجی حیات بڑے چٹل اور بڑی توجہ سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے شانی اور اہمیل سے دو چار سوال بھی کئے۔ آخر میں حاجی حیات نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری بشیر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی خبر مجھے واردات کے ایک گھنٹے بعد ہی مل

گئی تھی۔ تب تک مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ تم دونوں روکت کے بھائے یہاں راولپنڈی میں ہی موجود ہو۔ اس کے باوجود پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ واردات اس طرح نہیں ہوئی جس طرح میڈیا میں آ رہی ہے۔ اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔ اب جو کچھ تم نے یعنی تم دونوں نے مجھے بتایا ہے۔ یہ میرے لئے بڑا حیران کن اور سسٹنی چیز ہے۔ اگر تم لوگ خود نہ بتاتے تو شاید میں کسی اور پر یقین نہ کر سکتا۔“

چوہدری بشیر کے قتل اور اس کے اثرات کے حوالے سے شانی، اہمیل اور حاجی حیات میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد حاجی حیات نے شانی کو وہ بہت اہم باتیں بتائیں۔ پہلی بات کا قتل روکت سے تھا۔ حاجی نے کہا۔ ”میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہاں جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد چھوٹے سائیں کے چیلوں نے اہمیل کو کشنا نہ ضرور بتانا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سوئی ابراہم کے رخی ہونے کا الزام اہمیل پر نہ لگائیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اہمیل تم لوگوں کے پیچھے ہی پیچھے مری چلا آیا اگر یہ واپس روکت جاتا تو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہو جاتا تھا۔ میں ایسے محاوروں کی خلق کہ دشمن کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب بہتر یہ ہے کہ شنے، مگر میں اور اس کے بچے کو بھی جلد از جلد روکت سے نکال لیا جائے۔ میں اس سلسلے میں ابھی انتظام کرتا ہوں اور اس بارے میں میں مجھے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“

حاجی حیات نے جو دوسری بات بتائی وہ رنگ والی کے آگے جو ہر آباد گاؤں کی تھی۔ وہی جو ہر آباد جہاں تاؤ حشام کی قید سے چھوٹے والے ڈاکٹر زبیب النساء اور ڈاکٹر بہروز ایک نئے عزم سے ہسپتال کا آنا ڈاکر نہ والے تھے۔ جب شانی جو ہر آباد سے نکلی تھی تو ایک طرف ہسپتال کھولے جانے کی تجاویں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف قدرت اللہ کے چیلے اس کوشش کو سبوتاژ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

حاجی حیات نے بتایا۔ ”پچھلے نچھوٹے چار مہینے میں جو ہر آباد میں بڑی نمایاں اور تیز رفتار تبدیلیاں آئی ہیں۔ ڈاکٹر بہروز، ڈاکٹر یوں کی ایک فہم کے ساتھ ہسپتال میں ہے اور اس نے ہسپتال کو بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ ڈاکٹر زبیب النساء بھی اس کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر لوگوں کو پتا ہے کہ ڈاکٹر زبیب النساء کا شوہر ڈاکٹر محسن کا پورہوں کی قید میں قتل ہو گیا تھا اور اس قید میں زبیب النساء سے بدسلوکی بھی ہوتی رہی ہے۔ اب لوگوں کی ساری ہمدردیاں ڈاکٹر زبیب النساء کے ساتھ ہیں اور اس نے بھی خود کو ہسپتال کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بڑی تیزی سے ہسپتال کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ جنہیں پتا ہے، ہسپتال کا نام کیا رکھا گیا ہے؟“

شانی نے سوالیہ نظروں سے حادی حیات کو دیکھا۔

”شانی بی بی پہنچا۔“ حادی حیات نے کہا۔ ”لوگ تم سے بہت پیار کرتے ہیں شانی! اس پیار میں وہ سارا پیار بھی شامل ہو گیا ہے جو تمہاری والدہ ڈی آپا سے کیا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تم نے ڈاکٹر بہروز اور زبیب النساء وغیرہ کو ناپوریوں سے چھڑا کر اگر کوہوں اور ناپوریوں میں لڑائی ختم کرنا کہ بہت بڑے کام کئے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ تمہاری وجہ سے اس علاقے میں اور بھی بہت سی اچھی تبدیلیاں آئیں گی۔ میں سمجھتا ہوں شانی بی بی! تم خوش قسمت ہو کہ اس چھوٹی سی عمر میں تمہیں اتنی عزت اور محبت مل رہی ہے۔“

”یہ قدرت اللہ کا رویہ کیسا ہے؟“

”اب میں اسی بات کی طرف آرہا تھا۔ قدرت اللہ اور اس کے بڑاؤں عقیدت مند اس صورت حال کی وجہ سے سخت غصے میں ہیں۔ وہ بھی اپنے پاؤں بجائے رکھنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہ قدرت اللہ نے خود علاقے کے دورے کئے ہیں اور کئی کئی دن وہاں رہا ہے۔ اس نے اپنے سینئر جنٹلمن کی وہاں ڈیوٹیاں لگا دی ہیں اور ان کی پوری پوری توجہ کر رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی موت کو بھی کیش کرانے کی کوشش میں ہے۔ اس کے چہلپھارے اور رستم کے خلاف پریوینٹنگ کرتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی سے بی بی کو پرائی مارکی اور رستم نے بی بی کے کہنے پر اسے قتل کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ”خارش والا معاملہ“ بھی دن رات اچھا لگا رہا ہے۔“

جلدی بیماری والی بات؟“ شانی نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ قدرت اللہ کے عقیدت مند اسے سمجھو قرار دیتے ہیں اور اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔“ حادی حیات نے ذرا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہی ہے مجب اتفاق ہوا ہے۔ اس جلدی بیماری والے واقعے نے خاصی شہرت پائی ہے۔ حیران کن طور پر وہی لوگ بیمار ہوئے جنہوں نے جوہدی بشیر کی لاہور والی کوٹھی میں یہ قدرت اللہ اور اس کے حامیوں پر ہاتھ اٹھایا اور بھیجنا پانی کی۔ نہ صرف وہ لوگ بیمار ہوئے بلکہ ان کے گھر والے اور قریبی عزیز بھی اس بیماری کا شکار ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے قدرت اللہ کی شہرت کو بڑا بڑھا ملا ہے۔“

”یہ بات سامنے آئی نہیں کہ صرف وہی لوگ بیمار ہوئے جنہوں نے قدرت اللہ سے جھگڑا وغیرہ کیا۔“ شانی نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ ایک پھبت کی تکلیف تھی جس میں بہت سے لوگ بیمار ہوئے۔ قدرت اللہ اور اس کے سامنے والوں نے اس معاملے کا کس ایک

رخ پیش کیا۔“

”کچھ بھی ہے۔ اس معاملے نے قدرت اللہ کو بہت فائدہ دیا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ان لوگوں نے دو تین کانپے بھی چھاپے ہیں۔ ایک کا نام ”کرامت“ ہے، دوسرے کا نام ”کرشمہ“ تیسرے کا نام بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ان کتابوں میں درجنوں لوگوں کی تصویریں اور ان کے بیان وغیرہ چھاپے گئے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو بیمار ہوئے اور بعد ازاں توبہ کر کے اور قدرت اللہ سے معافی مانگنے کے بعد صحت یاب ہوئے۔ یہاں تک کہ ان جانوں میں جوہدی بشیر کا بیان بھی شامل ہے اور اسے نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ جوہدی بشیر نے مرید کے میں ناصر اعجاز کے گھر اپنے بیمار ہونے کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کس طرح اس کے جسم پر چھپا کی جیسے بڑے بڑے داغ نمودار ہوئے تھے اور کس طرح وہ جھلی ہوئی برف اپنے جسم پر ڈال کر بھی جلنے سے بچتا رہتا تھا۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی صحت یابی صرف قدرت اللہ کی مرہونِ منت ہے۔“

”عام لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

”عام لوگ اس بارے میں مکمل کربات نہیں کرتے۔ وہ لوگ بھی قدرت اللہ کی شعبہ باز یوں سے خوف زدہ رہتے ہیں جو اسے دل سے نما لگھتے ہیں۔ بہت سے بڑے چھٹے لکھے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ قدرت اللہ کے علاج کے کچھ طریقے بڑے غلط ہیں۔ وہ جانوروں اور بندوں کو بے دردی سے مارتا ہے اور ان کے خون سے عملیات کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ۔۔۔ اور مادہ جانوری Meeting کے دوران میں نر کی جان لیتا ہے اور اس کے خون سے یہ عمل لگھتا ہے۔ لیکن اس طرح کے کاموں کے خلاف بھی کوئی آواز نہیں اٹھاتا ہے۔ ویسے جانوروں اور پرندوں کو بے وجہ مارنے والا معاملہ قانون کی نذر میں تو آتا ہے مگر اس کے لئے کسی کوئی بڑی سزا نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن حادی صاحب، اگر کوشش کی جائے تو ان لوگوں کے خلاف اور کئی معاملوں میں۔۔۔ لیکن قسم کے ثبوت مل سکتے ہیں۔ کسی انسان کی جان لینے سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہوگا۔ اس قدرت اللہ نے میری آنکھوں کے سامنے میری بھابھو کو اپنے جادو نوٹے کی بھیبت عطا کی۔ وہ لاہور والی کوٹھی میں سسک سسک کر مر گئی لیکن اس نے اور اس کی بیوی نے۔۔۔ پتھر نہیں جانے دیا۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا تھا۔ آپ میں کبھی کے میں گمراہی دوں گی اور مجھے یقین ہے کہ ایسے بہت سے مرنے والوں کے لئے۔۔۔“ اس نے آپ کو مل جائیں گی۔“

عالمی حیات نے ایک گہری سانس لی۔ "فی الحال تو یہی لوگ ہر جگہ اپنی گواہیاں پیش کر رہے ہیں۔ چند روز پہلے قدرت اللہ کے کسی عقیدت مند جلیشر نے ایک رنگ دار پختہ روغنی کانو پر چھاپ کر اسے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں ایسے لوگوں کی مکمل تفصیل ہے جو کسی نہ کسی طور پیر قدرت اللہ کے عقاب کا شکار ہوئے اور اب گونا گوں مشکوک اور آفتوں کا شکار ہیں۔ اس میں دو چار لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اب تک جلدی بیماری سے نجات حاصل نہیں مل سکی اور وہ موت کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔"

عالمی حیات اور شانی کی درمیان بات چیت قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ آخر میں رستم کا ذکر آیا۔ شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ عالمی حیات نے شانی کو بھرپور تسلی دی اور یقین دلایا کہ وہ جلد کسی اچھی خبر کے ساتھ یہاں آئے والا ہے۔ جاتے وقت عالمی حیات نے شانی کو بتایا کہ وہ سننے گرہیں اور اس کے بیٹے کو جلد از جلد یہاں راولپنڈی میں لا رہا ہے۔ جو بھی وہ آگئے وہ انہیں اس بارے میں اطلاع دے گا۔

☆=====☆

عالمی حیات کی طرف سے اطلاع قریباً تین روز بعد آئی۔ شیر محمد کے گھر نے فون پر عالمی حیات نے شانی کو بتایا کہ مٹا کر گیس اور اس کا بچہ جیسا بھلاشت روکیت سے راولپنڈی پہنچ گئے ہیں اس نے بتایا کہ ان کے انداز سے کے عین مطابق روکیت میں حالات خراب ہیں۔ روکیت کی قریب نصف آبادی چاہا پر ایام پر دن رات زور دے رہی تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کو یہاں سے چلا کر دے ورنہ چاروں اور روکیت کے کینوں میں باقاعدہ جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ عالمی حیات کی ہدایت پر پہلوں، بجر اور اس کے ایک درجن ساتھیوں نے بڑی سخت کے ساتھ دونوں بچوں اور گیس کو وہاں سے نکالا تھا۔ اب دو تینوں راولپنڈی کے ایک پوش علاقے کی وسیع کوٹھی میں عالمی حیات کی قبول میں تھے۔

عالمی حیات نے فون پر شانی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب تم تینوں بھی اس مکان کو چھوڑ کر یہاں پہنچ جاؤ۔ یہ جگہ زیادہ بہتر اور محفوظ ہے۔ تمہارا آبادیوں میں لوگ ایک دوسرے کی فوج میں رہتے ہیں۔ یہ پڑھن کو بھی ہر لحاظ سے ٹھیک رہے گی۔"

عالمی حیات کی بات میں وزن تھا۔ شانی اور اہل نے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ عالمی حیات کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ شانی، ننہ اور گریس سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔

اسی شام سات بجے کے لگ بھگ عالمی حیات نے ایک اسٹیشن دیکھن بھجوا دی۔ رنگ

دارنشوں والی یہ پرائیویٹ وین ان کے سفر کے لئے بالکل محفوظ تھی۔ یہ کسی ہائی بیٹل کینی کی وین تھی اور اس پر لوگوں کو غور کئے ہوئے تھے۔ اپنے زبان شیر محمد کا بہت بہت شہرے ادا کرنے کے بعد وہ لوگ وین میں آ بیٹھے۔

اہل خان کی فکڑا ہٹ اب کافی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شہاب کی چوٹیں بھی بہتر تھیں۔ شہاب اپنے گاؤں کھمن وال جانا چاہتا تھا لیکن اس میں خطرات تھے۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ وہ شانی کی ہر بات پر بڑی عقیدت مندی سے جلا چوں چرا عمل کر رہا تھا۔ روانہ ہوتے وقت شانی بالکل کم سن تھی۔ درحقیقت وہ ابھی تک ان فونی مناظر کے اثر سے نہیں نکل پائی تھی جو اس نے زینت کالونی کی کوٹھی میں دیکھے تھے۔ بیڑیوں پر اٹنی سیدی لاشیں، نکاح خواں کا خونچکاں جسم، بند کمرے میں شام کا روٹا چلانا اور ان سارے مناظر میں سے دردناک ترین منظر چوہدری بشیر کی پیشانی کا عاقب ہو جانے والا تھا۔ اس کی ٹیک کا ایک شیشہ لیورنگ تھا اور کل سب سے ہو گئی تھی۔

شانی ان مناظر کو ذہن سے نکالنے کی بہت کوشش کرتی تھی مگر کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسٹیشن وین میں بیٹھی تو سامنے ہی شام کا اخبار نظر آ گیا۔ وہ چاہنے کے باوجود اخبار پر نگاہ ڈالنے لگا۔ زینت کالونی والے واقعے میں چوہدری بشیر قتل ہوئے چاروں گزر چکے تھے تاہم اخبار میں اس کی بازگشت موجود تھی۔ وحدت گروپ کے کم از کم افراد گرفتار ہو چکے تھے اور باقی نامزدگان کے لئے مجاہدے مارے جا رہے تھے۔ سرفراز چا وحدت ابھی تک پوش تھا۔ کسی نامعلوم مقام سے اس نے پولیس حکام کو مطلع کیا تھا کہ وہ مغرب کسی اعلیٰ مقامی عہدے دار کے ذریعے خود کو قتل کر دے گا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا یہ بیان دہرایا تھا کہ چوہدری بشیر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت میں اس کے ساتھیوں کا ہاتھ نہیں اور نہ وہ خود اس واقعے میں ملوث ہے۔ بہر حال پولیس تحقیقات کا نوے فیصد زور وحدت گروپ کی طرف

اسٹیشن وین اس محفل آبادی سے روانہ ہوئی اور صدر کے علاقے کی طرف چل پڑی۔ راولپنڈی کی سڑکیں جھکا رہی تھیں۔ زندگی حرکت میں تھی۔ گاڑیوں کا شور، ہارنوں کی آوازیں، چلتے بھٹتے ٹریک سسٹر، بس، شاہوں پر خنجر چروں کا ہتھم، ٹفلوں کے بڑے بڑے ڈانڈا، کانوں اور شاہک ہلاڑے کے دل آؤ بڑے نین سائز اور رستم کہاں تھا؟ کتنی؟ دور، کسی نے؟ کسی تاریک بستی یا کسی پہاڑ کی اندھی گدیوں میں؟ اس کا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ اہل کوٹھی مل جاتی تھی۔ رستم کے وقت رخصت شانی نے ہرگز نہیں سوچا تھا کہ یہ جدائی

ایسا رخ اختیار کرے گی۔

وہ اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ ذرا نچر پولیس کا ہی ایک ریٹائرڈ ملازم تھا اور حسن ابدال ہی کے علاقے کا تھا۔ وہ اہمل خان سے کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ اہمل خان بھی جب باتیں کرنے پر آمنا تھا تو اسے کا نام بھی لیتا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اندر سے کتنا گھبرا اور گھبر ہے۔ اہمل خان ذرا نچر سے بس بس کر اپنے لڑکپن کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ وہ بچپن میں بہت غیظ تھا۔ اسی غیظ پن کی وجہ سے اسے کھانا پکانے کا شوق پیدا ہوا۔ اب وہ پارٹ ٹائم بہترین کک ہے۔

ذرا نچر نے پوچھا۔ ”پارٹ ٹائم کک ہو اور مل جائے گا تم کیا کرتے ہو؟“
اہمل اطمینان سے بولا۔ ”امل خانم میں کل شغل کر لیتا ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے لیکن ہفتے میں دو دن کل بھی ہو جائیں تو گزارے لائق پیسے مل جاتے ہیں۔“

اہمل کی اس بات پر ذرا نچر نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”آپ دلچسپ آدمی ہو۔“ شہاب کے ہونٹ بھی مسکرنے والے انداز میں مچکے تھے۔ ڈالا خاموش بیٹھا رہا۔ انیشن وین ایک کشادہ سڑک پر فرارے بھرتی ہڈی کی پرش علاقے کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک روشن سڑک کے خوبصورت لڈکے میٹھن پر وہ فعل لینے کے لئے رکے۔ اچانک رنگ دار میٹھن کی دوسری جانب شانی کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی۔ بالکل گول آنکھوں اور بالکل گول چہرے والا یہ سالو لا شخص وین کے بالکل پاس سے گزرتا ہوا سڑک پار کر گیا۔ اس کے ہاتھ میں شاہرہ تھے۔ ایک شاہرہ میں دو دھ اور جس کی ٹیڑا ایک تھے، دوسرے میں کیلے وغیرہ تھے۔ گول منول چہرے والا سالو لا شخص سڑک پار کر کے سامنے کی سبز بلڈنگ میں چلا گیا۔ یہ ایک شاندار برائو بیٹ ہسپتال کی بلڈنگ تھی۔ صاف ستھرے پارکنگ لٹ میں پانچ چھ شاندار گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

شلوار قمیص والے اس شخص کو دیکھ کر شانی کے داغ میں مغلز دوڑی شروع ہو گئی۔ کہاں دیکھا تھا اس نے یہ چہرہ؟ کہاں دیکھا تھا؟ شاید اسے کوئی وہم ہو رہا تھا۔ لیکن نہیں، یہ وہم نہیں تھا پھر اسے یاد آ گیا۔ یہ چہرہ تو اس نے کئی بار پہلے بہتم ہستی میں دیکھا تھا۔ رنگ والی کے ارد گرد سارے علاقے میں دور دور تک قدرت اللہ کے چیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نامور چیلہ جالب بھی تھا۔ جس طرح شای جو پر آباد میں ودنا تھا، جالب بہتم ہستی کا کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ بہتم ہستی میں شانی اور ستم جب سردار دراج کے مہمان تھے تو شانی نے کئی بار جالب اور اس کے عقیدت مندوں کو دیکھا تھا۔

یہ گول منول شخص جو ابھی نظر آیا تھا، جالب کا خدمت گار تھا۔ شانی نے بہتم ہستی میں بھی دیکھا تھا۔ یہ شخص بہت وقت ناف پر ہاتھ باندھے جالب کے پیچھے پیچھے چھڑتا تھا۔ یہ بیان ہسپتال میں کیا کر رہا تھا؟ یہ بہت مہنگا ہسپتال تھا۔ تو کیا جالب بھی اس شخص کے ساتھ یہاں موجود تھا؟ اگر جالب یہاں موجود تھا تو یہ بڑی انکشاف انگیز بات تھی۔ قدرت اللہ اور اس کے نامی گرامی چیلے تو خود عظیم معالج تھے۔ ان کو مستند ڈاکٹروں اور معالجوں کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟

شانی کے داغ میں تجسس جابجا فطری عمل تھا لیکن اس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ اس دور دراز علاقے میں رہنے والا شعبہ باز جالب واقعی یہاں راولپنڈی میں موجود ہوگا۔ اسی دوران میں شانی کی نگاہ ڈولے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو کبیرے سرائے سے ملتی جلتی تھی۔ وہ جیسے بہت غور سے کچھ سوچنے یا جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ”کیا بات ہے ڈولے؟“ شانی نے اس کا اضطراب بھانپتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں باقی جی۔“ اس نے اپنا چھوٹا سا سر نیچے میں ہلایا۔

شانی نے اسے گھورا۔ ”ڈولے! انھیں ہزار دفعہ کہہ چکے ہو کہ تم میرے دل میں ہو بتایا کرو۔“

ڈولے کے چہرے پر ابھرنے لگا۔ وہ کھانا سا دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر تک مزید تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”بانی جی! اپنا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہاں آس پاس قدرت اللہ یا اس کا کوئی قریبی عزیز موجود ہے۔ ہو سکتا ہے یہ صرف میرا وہم ہو اور ہو سکتا ہے۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا اور کسی حساس جانور کی طرح سڑک کے پار نہیں گئے۔

”کیا جنھیں کوئی آواز آ رہی ہے؟“ شانی نے سرگوشی میں پوچھا۔

”نہیں جی۔“

”کیا کچھ دیکھا ہے؟“

”نہیں جی۔“ ڈولے نے بھرا نکار میں سر ہلایا۔ ”بب..... بس مجھے لگ رہا ہے۔“

شانی نے دیکھا۔ ڈولے کے چھوٹے چھوٹے حواس تھخے پھولے ہوئے تھے۔ اس نے دور میں یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ یہ دلیل کا زمانہ ہے، یہ غوس حقیقتوں کی دنیا۔ لیکن انہو بیوں کے وجود سے کسرا نکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چھوٹا سا بے حقیقت ہونا چاہیے

اندہر کچھ ایسی توانائیاں رکھتا تھا جو حیران کن تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ان صلاحیتوں کے اظہار سے کئی کھڑا تھا اور شرمندہ رہتا تھا۔ یہ شانی ہی تھی جس کے ساتھ کبھی بھی ڈولے نے بات کرنا شروع کی تھی اور وہ بھی رازداری کے ساتھ۔ اس وقت بھی۔ مہرگوشتوں میں بات کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اہمل یا شہاب نے یہ باتیں سنیں تو اس کا مذہب "اناشروع کردیں گے یا پھر اس طرح کی باتوں سے یہ ہوگا کہ وہ اس سے دور ہوتے جائیں گے۔

اگر کسی اور موقع پر شانی نے ڈولے سے یہ بات سنی ہوتی تو شاید وہ اسے سنجیدگی سے لینے میں کچھ دیر لگاتی لیکن ابھی تو وہی درپیلے اس نے کول منول حکم کی صورت جو کچھ دیکھا تھا، اس کے بعد زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہاں واقعی کچھ ہے۔ اہمل خان اعلیٰ نشست پر بیٹھا شہاب سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈرائیور باہر کھڑا ایندھن بھروا رہا تھا۔ شانی نے اہمل کو اپنے پاس پچھلی نشست پر بلایا اور اس سے کہا۔

"اہمل! وہ دیکھو سامنے۔ وہ کیا ہے؟"

"ہسپتال ہے جی۔ پھل اگلی ہسپتال۔"

"مجھے لگتا ہے اہمل! یہاں کچھ ہے۔ میں نے ابھی یہاں سے ایک بندے کو گزرتے دیکھا ہے۔"

"کیا مطلب جی؟" اہمل نے پوچھا۔

شانی نے اسے ساری تفصیل بتادی، صرف ڈولے کی بات کو حذف کر دیا۔ اہمل فور سے سنکار با پھر ایک دم وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ام ابھی گیا اور ابھی آیا۔ ام کو یہ شہاب کی حاجت ہو رہا ہے۔ یہ ہسپتال والا اتنا کھنور دل نہیں ہوگا کہ ام کو اندر نہ گھسنے دے۔"

شانی سمجھتی تھی کہ وہ ہسپتال کے اندر جا کر تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ وہاں جالب یا قدرت اللہ کا کوئی اور ساتھی تو موجود نہیں۔ قدرت اللہ کے ساتھی شای کو تو وہ ذاتی طور پر بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جالب اور شای وغیرہ کی شکلیں بھی دیکھی ہوئی تھیں۔ ان سب لوگوں سے اہمل کا یہ جتنا پرانا تھا اتنا ہی گہرا ابھی تھا۔

شانی اسے روکتی تھا وہ گئی اور وہ باہر چلا گیا۔ آخر شانی نے کہا۔ "اہمل! احتیاط سے..... اب میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی ہوں۔ نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچے۔ میری بات سن رہے ہو نا؟"

"مارا بہن بالکل بے فکر ہو جائے۔" اہمل نے مخصوص لہجے میں کہا اور دو جھٹس لگا کر مزک کے پار پچاس کے بیڑوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

ایسے موقعوں پر اہمل کی تمام حسیات پر پوری طرح بیدار ہو جاتی تھیں۔ اس نے اپنی قمیص کے اوپر سے نئول کرپٹول کی موجودگی کو جھنجھکیا بنایا اور مین کیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ پوزیکار بھی چھان ہی تھا، وہ اہمل کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔ اہمل نے دیکھتے ہی ڈر لیا کہ پادروہ چار کی سائیکل کا ہے۔ اہمل نے اس سے اسی لہجے میں پستوبولی اور اسے بتایا کہ اس کا ماموں یہاں زیر علاج ہے۔ جو کچھ اہمل نے کر و نمبر پر پچھا۔ اہمل نے سگے سے سات نمبر بتایا۔ یہ نکلا چل گیا اور اہمل خان اس شاندار ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ اسے ہسپتال کے بجائے پرائیویٹ کھینک کہنا زیادہ مناسب تھا۔ عمارت بہت بڑی نہیں تھی۔ اہمل خان نے وہی پندرہ منٹ اندر اُدھر گھومنے گزارے۔ وہ جیچو میڈیوالے چار پانچ وارڈز میں گیا۔ پرائیویٹ کمروں کے اندر بھی "غلطی" سے جھانک لیکن کہیں کوئی شناسا یا مشکوک صورت دکھائی نہیں دی۔ جلد ہی اہمل خان کو اندازہ ہو گیا کہ کھینک کا ایک زیادہ "پرائیویٹ یٹ پرسن" بھی ہے۔ یہ قریباً پانچ گھنٹہ دو آئی ٹی رومز تھے۔ اُدھر سیکریٹری کا انتظام بھی تھا۔ پوری شناخت اور انکوائری کے بغیر کوئی اندر نہیں جاسکتا تھا۔

اہمل خان کی چھٹی جس نے کہا کہ اگر کوئی گز رہے تو یہاں ہے۔ یہاں سیکریٹری پر مامور لوگوں میں اہمل کو ایک در مشکوک افراد بھی نظر آئے جیسے یہ لوگ کھینک کے نہیں تھے، آؤٹ سائڈز تھے۔ اہمل سمجھ گیا کہ یہاں سے آگے جانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ ایک کالین پش راہدار سے گزرا کہ ایک بھلی دروازے سے عمارت کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ یہاں بلڈنگ ڈبل سٹوری تھی۔ اہمل نے اندازہ لگایا کہ شاید دوسری منزل کی کوئی کھڑکی کھلی مل جائے اور وہی آئی ٹی رومز تک جانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے ورزشی جسم کو کچن پر توڑا سا اچھال کر ایک چیمبے سے لٹکا یا اور چند ہی سینکڑ میں بالائی منزل کی چروٹی کارنس پر پہنچ گیا۔ اس ٹھگ کارنس پر پاؤں جگا کر چلنا خاصا دشوار تھا۔ اہمل نے یہ خطرہ مول لیا اور دو بار سے چٹ کر کارنس پر چلا ہوا مختلف کھڑکیوں پر قسمت آزمائی کرنے لگا۔ چوتھی یا پانچویں کھڑکی میں سے ایک پٹ اسے کھلا مل گیا۔ کمرے کی گن لینے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔

یہ شاندار گھڑی کمرہ خالی تھا۔ مریض اور تیماردار دونوں کے بیڈ خالی تھے۔ میڈیکل آلات نہایت حدید تھے۔ ایک مہنگی نفاست ہر طرف جلوہ گر تھی۔ اہمل خان اس کمرے سے

گزر کر خاموش کور بیڈور میں آگیا۔ فرش پر فراشی بکتر دیا اور بڑا پورٹو لگ، امریکین دروازے اور اعلیٰ کے گلائی پنڈل۔ یہ جیسے ہسپتال نہیں کسی یورپین پرش یا ڈیوٹیک کا محل تھا۔ عزرائیل کو ایسی چیزوں سے کہاں مرعوب کیا جاسکتا ہے۔ امہل خان نے دل میں سوچا۔

اچانک اسے اپنے سامنے والے کمرے میں کسی آہٹ کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی شرع نسوانی ہنسی سنائی دی۔ کمرے کے دروازے پر جبر نکلتا تھا۔ انسل نے ہمت کر کے کی بول سے آنکھ لگائی۔ اسے کمرے کا وسطی حصہ نظر آئے گا۔ اندر نینکوں کا تانت بلب روشن تھا۔ امہل خان نے میں رو گیا۔ اس نے جبر قدرت اللہ کے دیہاتی چلے جاب کو دیکھا۔ بے شک وہ جاب ہی تھا۔ کھوئی گاؤں سے آئے تھے بہت سنی میں یہی جاب، جبر قدرت اللہ کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ وہ قدرت اللہ کے دوسرے نامور چیلے شادی کا ہم منصب تھا۔ وہ بھی کھار شادی کے ہمراہ امہل خان کے گاؤں میں بھی آیا کرتا تھا۔ اس سانولے بعد سے شخص کو امہل بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے چٹون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس کی قمیض آگے سے چٹون کے اندر تھی اور پیچھے سے نکلی ہوئی تھی۔ ثانی کی تانت بھی ڈھیلی ہو کر بننے کے وسط تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس نہایت قمیض کمرے میں اچانک جاب ایسے ہی لگتا تھا جیسے خوب صورت کراکری کی دکان میں بیل گھسا جینا ہو۔ قریب سی میز پر دو شاہ پڑے تھے۔ ایک میں جوس اور دودھ کے ڈبے تھے۔ دوسرے میں فروٹ۔

ایک قبول صورت نو جوان نرس ہاتھ میں غالباً ندر و بیان کا سرخ پنکشن لئے کھڑی تھی۔ جاب نے غیبت بچانی لیے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری شیرادی پر نیچے کی گولی بھی تو بنی ہوئی ہے۔ گولی کھلا دیا کر۔“

”گولی سے معدہ خراب ہوتا ہے مختار صاحب۔ ویسے آج درویش ہوگا۔ بڑے پوٹے ہاتھ سے لگاؤں گی۔“ نرس نماز کی مسکرائی۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں آج پھر۔“ جاب نے کہا جو یہاں ”مختار صاحب“ کے نام سے موجود تھا۔

وہ اندھ حالت گیا اور چٹون پیچھے کھسکا دی۔ اس کا کلا کلوٹا کوہا نمایاں ہو گیا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے لیکن بڑی احتیاط سے نینل جاب کے چہرے پر دیر کوشت میں اتاری۔ وہ باخانی میں تقریباً چلا اٹھا۔ ”اوئے مار دتا ائی خالے۔“

اس نے ٹانگ اکڑائی اور مضیاں بھیجنے لیں۔ شکل دیکھ کر بول لگتا تھا کہ اسے سوئی نہیں

خیز کھوٹا گیا ہے۔ اس کی کم دلی پر لڑکی کی مسکراہٹ ذرا گہری ہو گئی۔

آنکھیں لگ چکا تو جاب نے گھور کر لڑکی کو دیکھا۔

”آپ بھی بس ایویں ہیں مختار جی۔“ وہ قدرے شوخی سے بولی۔ لگتا تھا کہ ان کے درمیان خاص قسم کی بے تکلفی موجود ہے۔

”اچھا، میں ایویں ہوں۔“ وہ متوجہ کر بلا ہوا اس نے چٹون برابر کی اور لڑکی پر ہل پڑا۔ اسے دو بج کر اس نے بند پر پیچکا اور اسے دھانپ لیا۔ وہ حراست کرنے لگی اور ساتھ ساتھ دہلی واڑ میں ہنسنے لگی۔ جاب کے ہاتھ شیطانی انداز میں چلنے لگے اور لڑکی اپنے لباس سے محروم ہونے لگی۔ انسل نے سرخ چہرے کے ساتھ اپنی گلاہ کی بول میں سے بنا لی۔

یہ ہٹا سکتا جاب تیار تو ہرگز نظر نہیں آتا تھا۔ جو پنکشن اس نے لگوا دیا تھا وہ بھی طاقت کا تھا۔ جو بعض لوگ شوخی بھی لگوانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شخص یقیناً یہاں کسی جیکر میں موجود تھا۔ اچانک رابہاری کے سامنے والے دروازے کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔ بلکہ شاید یہ دو افراد تھے۔ امہل پھرتی سے واپس اس کمرے میں چلا گیا جہاں سے نکلا تھا۔ کمرہ ابھی تک بالکل خالی تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا تاکہ اگر کوئی اس کمرے میں آئے اور دروازہ کھولے تو اسے فوری طور پر نہ دیکھا جاسکے۔

خیریت ہی گزری۔ اندر آنے والے دونوں افراد باتیں کرتے ہوئے کمرے کے سامنے سے گزر گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا اور دوسرا جوہری ٹوپی والا۔ وہ اٹھ بیٹا ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈاکٹر دوسرے شخص کو تار ہاتھا۔

”کسی مختار صاحب کے نام بلگ ہے۔ اس وقت یہ پورا بلاک ہی ان کے استعمال میں ہے۔ وی آئی پی لوگ ہیں۔ مریض تو صرف وہ ہیں باقی کمرے غازیمن کے استعمال میں ہیں۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ امہل نے ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ شیشے کے ایک سلائیڈنگ دروازے کے سامنے ایک سیکورٹی گاڑڈ ڈاکٹر کے ساتھی کا شناختی کارڈ چپک کر رہا تھا۔ اس جانچنے پر تال سے سیکورٹی کی سختی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اور انہیسیا والا اندر چلے گئے۔ گاڑڈ پھر چپک کر اٹھ گیا۔

اب امہل کا دل اندر جانے کو پھٹنے لگا تھا۔ اس نے دوسریوں والی بات سن لی تھی اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مریض انہی اندرونی کمرہ میں ہیں جہاں یہ دونوں حضرات

گئے ہیں۔ اہمل اندر ہی رک کر سوچتا رہا اور بہتر موقع کا انتظار کرتا رہا۔ بس غزال کی ابھی تک اندر ہی تھی اور یقیناً بہرہ پہنچے جانب کے ساتھ ”مصروف“ تھی۔ چار پانچ منٹ اسی طرح گزار گئے۔ پھر ایک اہمل خان کو ایک موقع ملا۔ دروازے کے سامنے موجود گاڑو دائیں جانب گیا۔ دراصل ٹیلی فون کی مدد سے ٹھنی سنائی دی تھی اور وہ شاید فون سننے ہی گیا تھا۔ اہمل نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور دس پندرہ قدم کا فاصلہ طے کر کے خشے کے سلائیڈنگ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ اس پرانیوٹ ٹیکنک کا خاص اہتمام تھا۔ یہاں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز دیتی۔ گرد و پیش نہایت صاف تھیں تھے۔ اہمل خان ہر قسم کی صورت حال کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کا ہاتھ اپنے اہمل تک پہنچا سکتا تھا اور وہ صورت حال کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ایک دیوار گیر کمر کی کے سامنے پہنچا۔ اس میں مویشا پیش فکس تھا اور اندر کی طرف نہایت قیمتی کمرن نظر آ رہا تھا۔ اہمل خان نے اندر جھانک کر دنگ رہ گیا۔ یہ ایک خاصا وسیع کمرہ تھا۔ میڈیکل اینڈ کے جدید ترین آلات یہاں موجود تھے۔ بڑے بڑے ایک عورت لیٹی تھی۔ ایک نرس ہاتھوں میں دھتارے چڑھائے عورت کے ہاتھوں پر کوئی دو لاکھ روپی تھی۔ عورت کو دیکھ کر اہمل خان کی آنکھیں کھلی رہ گئی۔ وہ اس بات پر حیران رہ گیا کہ عورت کو جانتا تھا۔ یہ قدرت اللہ کی پہلی بیوی تھی اور اس کا چہرہ عارض زرد تھا۔ چھپا کی طرح کے سرخ اجڑے ہوئے نشان اس کے پورے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر موجود تھے۔ اہمل خان کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وہی جلدی بیماری تھی۔ ہاں، وہی جلدی بیماری تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے چودری انجیر اور اس کے سگی ساتھیوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ اس بیماری کے کچھ مریض ابھی تک نہیں کھیں موجود تھے۔

اہمل نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ بے شک یہ قدرت اللہ کی بڑی بیوی ہی تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بیویاں تو سخت پردے میں رہتی تھیں لیکن یہ عورت بہت زیادہ پابند نہیں تھی۔ ایک مرتبہ جب اہمل خان کے گاؤں میں قدرت اللہ اپنے چیلے شادی کے پاس آیا تھا تو یہ بی بی بھی قدرت اللہ کے ساتھ تھی۔ اہمل خان نے اس میں رہ گیا۔ وہ ٹیکنک کے اس سے کی سیوریٹی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اب اسے اس کی سیوریٹی کی وجوہات بھی کچھ میں آ رہی تھیں۔ قدرت اللہ کے بڑاڑوں سامنے والے اس جلدی تکلیف کو قدرت اللہ کے کرشمے کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ وہ اس تکلیف کو قدرت اللہ کے گستاخوں پر قہر لائی قرار دے

رہے تھے اور اب یہ قہر لائی قدرت اللہ کے اپنے گھر میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ ایک ناک اہمل کو وہ فقر و پادیا جوتھوڑی دیہ پہلے اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ”یہاں دوسری نسل ایٹم منت ہیں۔“
”یہ دوسرا نسل کون تھا؟“

اہمل خان دائیں طرف کے کوریڈور میں داخل ہوا۔ سامنے سے ایک خوش لباس وارڈے ایک ٹیس ٹرائی دکھائی دیا۔ وہاں بڑا ہوا۔ اہمل خان کو کچھ گرد و راجہ لگا۔ اہمل سفید شلوار قمیض اور شادری پہن چکے ہوئے تھے۔ وارڈے ہوائے اہمل کو ابھی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے چلا گیا تاہم اس نے اہمل سے کچھ نہ پوچھا۔

چند قدم آگے اہمل نے ایک دوسری کمر کی میں جھانکا اور ایک بار پھر چونکا۔ یہاں بھی ایک عورت سفید اچھے بسز پر موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بھی بیماری کے آثار و راکم شدت سے موجود تھے۔ ایک خدمت گزار کی اس کے قریب پہنچی کوئی انگلیش میگزین دیکھ رہی تھی۔ اہمل اس عورت کو محسوس سے نہیں جانتا تھا لیکن اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ قدرت اللہ کی دوسری زوجہ ہوگی۔ اہمل کی معلومات کے مطابق قدرت اللہ کی اس پہلی بیوی کا نام عریسہ تھا۔ عریسہ فراتی۔

اہمل خان کا خون کھو لگے لگے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اسے گاؤں بدر کیا تھا۔ جن کی وجہ سے اس نے اپنے بچپن کی گلیاں چھوڑنا پڑیں، اپنے قریبی رشتے داروں سے دور جانا پڑا اور اپنی مختصر چھوڑنا پڑی۔ یہ بہرہ پہنچے، یہ دھوکے باز ہوس کا راس کے مجرم تھے۔ یہ ستم بھی اہمل کا بہرہ داسی نے لگایا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بدمرچہ پکارتا تھا۔ اہمل کے جی میں آئی کہ وہ اپنے کرتے کے نیچے سے بھرا ہوا ہسپتال لگالے۔ اس پر سائیکسز چڑھائے اور ہسپتال کی دو دو گولیاں اس دونوں عورتوں کی کھوپڑیوں میں ڈال دے پھر یہاں سے لنگے اور باقی دو گولیاں دو نمبر کمرے میں دو نمبر کمرے کے ہوائے جانب کے بیچے میں بیوست کر دے۔

نہیں یہاں آنے سے پہلے بی بی نے اسے کسی لڑائی جھگڑے اور خون خرابے سے یکسر منع کر دیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ خون خرابے کا موقع بھی نہیں تھا۔ یہ تو غصہ سے دل سے اپنی حکمت عملی سے پٹنے کا وقت تھا۔ قدرت نے قدرت اللہ پر بڑا کاروبار کیا تھا۔ قدرت اللہ کی ساری پال بازی آپوں آپ اس کے اپنے اوپر الٹ رہی تھی۔ اہمل نے آج بوہتہ یہاں دیکھا تھا، یہ قدرت اللہ کے لئے بہت بڑا جھوٹا ثابت ہو سکتا تھا۔

اہمل زیادہ دیر یہاں رکا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خشے والے بڑے دروازے کی طرف

آگیا۔ یہاں چوس گاڑ موجود تھا۔ اجمل نے اس پر دھیان دے بغیر تیزی کے ساتھ دروازے سے نکلتا چاہا۔ گاڑ کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے اجمل کو روک کئے گاڑ ارادہ کیا۔

”آپ کہاں سے آئے ہو بھائی صاحب؟“ گاڑ نے تعجب سے کہا۔

اجمل نے اپنا منہ پہلے ہی دائیں بائیں جھانک کر دیا تھا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا اس نے منہ میں کوئی دوا وغیرہ لگا رکھی ہے یا پیچھے منہ میں خون وغیرہ جمع ہے اور وہ بات نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ گاڑ اپنی آنکھوں سے نکلتا، اجمل لمبے ڈگ بھرتا ہوا دغیر کر کے کے پاس سے گزرا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔

اگلے دروازے پر موجود دو گاڑز نے بھی اسے قدر سے حیرت سے دیکھا۔ تاہم اسے کسی نے روک نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بارنگل رہا تھا، اندر نہیں گھس رہا تھا۔ اس نے تیزی سے احاطہ پار کیا۔ جب وہ بیرونی گیٹ کے قریب تھا، معتب سے ایک گاڑز نے اسے آواز دی لیکن جب تک اجمل ان کی گنجی سے دور نکل چکا تھا۔ اس نے باہر والے پٹھان گاڑز سے مستراہٹ کا تبادلہ کیا اور بھاگ کر سڑک پار کیا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں دھندلکے ڈرا نیور کر پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔ جو بھی وہ وہاں میں چڑھا وہیں تیزی سے روانہ ہو گئی۔

”کیا بات ہے اجمل؟“ شانی نے پوچھا۔

”بہت بڑا بات ہے شانی بھئی۔ ایک دم تھلکے چا دیئے والا۔ انٹرمیوٹی طرح۔“

اس کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔

”کچھ بتاؤ بھئی۔ کون ہے وہاں؟“

”قدرت اللہ کا وہ بندہ بیوہ پال۔“ انہوں نے سرگوشی کی۔

”وہ وہاں کب رہی ہیں؟“

”اللہ کی قدرت کا قمار شادی خیر ہی میں اور دوسروں کو بھی دکھائی ہیں۔“ اجمل نے گھر ڈرا توقف سے بولا۔ ”ام آپ کو کیا بتائے۔ کہتے ہیں کہ کسی کی تکلیف بخوشی نہیں ہو جاتی ہے۔“

”کچھ بتاؤ بھئی۔“ شانی نے اجمل کا سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اجمل نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ”میں کلینک میں قدرت اللہ کی وہ بیویوں کو دیکھ کر آیا ہے۔ وہ دونوں بیمار ہیں اور آپ کو پتا ہے ان کو کون سا بیماری ہے؟ وہی بیماری جس کا نام لے لے کر قدرت اللہ اور اس کا حرامی چیلانگوں کو ڈرا رہا تھا۔ وہ دونوں

عورتیں غارٹھ کا تکلیف لے کر اس کلینک میں پڑا ہوا ہے۔ وہ حرامی جالب بھی یہاں مقام کے نام سے موجود ہے۔ ام کو پکا یقین ہے یہ دونوں بیویاں بھی پریشی (فرضی) نام سے یہاں داخل ہوا ہوں گا۔ ام سب پکا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔“

شانی کو اپنے نسیم میں عجیب سنناہٹ محسوس ہوئی۔ اجمل کی اطلاع واقعی حیران کن اور سنسنی خیز تھی۔

اجمل بتا رہا تھا۔ ”کلینک کے اندر ایک پورا پکا ان لوگوں نے بک کر رکھا ہے۔ وہاں کسی کو آنے جانے نہیں دیا جاتا۔ ام بڑی مشکل سے اندر گھسا ہے۔“

پھر اجمل خان مختصر الفاظ میں شانی کو بتانے لگا کہ وہ اندر کیسے گیا اور اس نے وہاں کیا دیکھا۔

آنکھیں دین برقی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ شانی نے خاموش بیٹھنے ڈولے کو تھریلی نظروں سے دیکھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت نے ایک بار بھر اپنا آپ منوایا تھا۔ اگر ڈولے کی تائید شامل نہ ہوتی تو شاید شانی اس بار سے میں اتنی جتنو نہ کرتی۔

ان کی منزل دو کینال کی ایک بڑے سکون کوٹھی تھی۔ کوٹھی کو چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں نہتا، گرہیں اور یوس پہلے سے موجود تھے۔ منا بھاگ کر شانی کی ناگوں سے لپٹ گیا پھر گرہیں، شانی سے گھٹے ملی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے حال احوال سے آگاہ کیا۔ رات کا کھانا بائیں کیا تھا۔ کھانا خاموشی میں کھایا گیا مگر شانی کے ذہن میں ٹپٹپٹ پٹی ہوئی تھی۔ اجمل کی اطلاع معمولی نہیں تھی۔

☆=====☆=====☆

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔ عارف کیوہ راولپنڈی کی اس کوٹھی میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی نہیں جھپٹتا تھا کہ رسم ڈولے کے خون پر بڑائی میں جان سے ہاتھ دھو چکا ہے۔ (شانی نے اس بات کی تصدیق کی تھی نہ تردید)۔

حاجی حیات سے مشورہ کرنے کے بعد شانی نے عارف کیوہ کو خودی جو پرآد سے بلوایا تھا۔ چند ماہ پہلے کوچر انوالد کے بانی پاس سے شانی اور عارف نے راستہ جدا ہوئے تھے۔ عارف کوچر انوالد کے بازار سے کھانے کا سامان لینے گیا تھا اور شانی کو ریاض بٹلر کی کال پر اس کے پاس جانا پڑ گیا تھا۔

دونوں دیر تک ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ قریب ایک گھنٹے کی

گفتگو کے بعد جوہر آباد کا ذکر چھڑ گیا۔ عارف نے بھی وہی کچھ بتایا جو ماضی حیات بنا چکا تھا۔ جوہر آباد اور ارد گرد کے علاقے میں ڈاکٹر بہروز اور قدرت اللہ کے درمیان جنگ جاری تھی۔ ڈاکٹر بہروز اور اس کے ساتھی اس کو شش میں تھے کہ جوہر آباد کا ہسپتال نہ صرف موجود رہے بلکہ تیز رفتار ترقی کرے۔ دوسری طرف چودہ ماہیت اور دوڑیہ شاشی کے نمائندے قدرت اللہ کے ساتھ مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ ہسپتال اور اس کے ملحق سکول ختم ہو جائے اور ڈاکٹر و اساتذہ وغیرہ خوف زدہ ہو کر ہموگ جائیں یا اپنے کام سے توبہ کر لیں۔ وقتی طور پر ان لوگوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔

عارف نے کہا۔ "شاشی بی بی! جوہر آباد میں آپ کی جتنی ضرورت اب ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کے لئے بہت جگہ ہے۔ آپ وڈی آپا کی بنی ہیں۔ لوگ آپ کے گرد پروانوں کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے اور آپ کی بات مانیں گے۔" پھر عارف نے شاشی کو بتایا کہ علاقے کے لوگوں نے وڈی آپا کی بنی سے محبت کی وجہ سے ہسپتال کا نام "شاشی بی بی ہسپتال" رکھ دیا ہے۔

"جس میں پتا ہے عارف! اپنی ریاض مجھے ہر جگہ کھوتا پھر رہا ہے۔"

"مجھے پتا ہے، ماضی حیات صاحب اسے سنیا لیں گے۔ ویسے بھی فوٹی کی اصل دشمنی تو رسم بھائی کے ساتھ تھی۔ اب وہی نہیں رہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے عارف کا گلہ اتر چکا۔

شاشی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "عارف! قدرت نے ہمیں قدرت اللہ کا زور توڑنے اور اسے جھوٹا ثابت کرنے کا ایک بہترین موقع دیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں! بس انا۔"

شاشی نے عارف کو تفصیل سے وہ سب کچھ بتا دیا جو اہل خانہ کے ذریعے اس کے علم میں آیا تھا۔ عارف حیرانی سے سنتا رہا۔ جب شاشی گفتگو کے آخری مرحلے میں پہنچی تو عارف کی آنکھیں اندرونی جوش اور حرارت سے چمک رہی تھیں۔ اس نے چند سوالات کر کے شاشی سے پوری تفصیل جانی اور پھر نہ مزاح۔ لہجہ میں بولا۔ "اگر یہ سب کچھ ہو چکا ہے شاشی بی بی! تو پھر میں قدرت اللہ کو دن میں تارے دکھا دوں گا۔ یہ بہت بڑی خبر ہے اور سچ کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی سب آواز ہے۔"

"آپ کیا کر رہے؟" شاشی نے پوچھا۔

"آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ تم بتاؤ تمہارے ابو، میں کیا آ رہا ہے؟"

"ایسی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ بس دو چار لوگوں کو بتانے کی ضرورت ہے پھر خود ہی یہ اطلاع چل نکلتی گی۔ اس کے ساتھ ہی پریس والوں کو بھی بتا دیتے ہیں۔"

"یہ لوگ کوئی جوابی پانا کی رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی طرح پھلاوے کر اس ٹیکہ کے لئے کوشش کریں۔ بعد میں شور ڈالیں کہ یہ سب کچھ انہیں بدنام کرنے اور کچھڑ اچھالنے کے لئے تھا۔" شاشی نے کہا۔

"پھر ایک اور کام ہو سکتا ہے۔" عارف کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

"راؤ لینڈی کے علاقے میں مجھ، قدرت اللہ کے مائے والوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ یہاں بھی یہ خبر بڑی جلدی پھیل جائے گی کہ فلاں ہسپتال میں قدرت اللہ کی بیویاں داخل ہیں۔ ایک دو گھنٹے میں بہت سے لوگ ہسپتال کھینچ جائیں گے۔ ان کے پیچھے سے پہلے ہی پریس والوں کو بھی وہاں لے جاتے ہیں۔ لوگوں کے پیچھے تک پریس والے ہسپتال سے دور رہیں گے۔ پریس کے لئے یہ ہم خبر ہوگی کہ پھر قدرت اللہ کی بیویاں ہسپتال میں ہیں اور وہ محض بیماری جس کا ذہن دوا دینا چاہتا رہا ہے خود قدرت اللہ کے گھر میں داخل ہو چکی ہے۔"

"امارے ذہن میں بھی ایک کام کا بات آ رہا ہے۔" اہل خانہ نے کہا۔ "اگر ہڈی میں امارا ایک مائے والا نوذریہ ہو تو موجود ہے۔ ایک دم پھر سچا ہے اماری طرح۔ ام کو اطلاع کر دیتا ہے یا پھر اس وقت اطلاع کر دے گا جب اخبار والوں نے ہسپتال کے اندر جانا ہوگا۔ وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ لڑ جھگڑ کر بھی وہی آئی پی کمروں میں ٹھس بائے گا۔"

"ظاہر ہے خان بھائی! آپ کا دوست بھی آپ کی طرح کڑک ہوگا۔" ڈولے نے کہا۔

اہل خانہ نے ڈولے کو گواہ کر اس کا منہ چوما۔ "چھوٹا اتم جب بھی بولتا ہے اچھا سہرا پڑتا ہے۔"

شاشی نے عارف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھو عارف! تم اس معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اپنی کچھ کے مطابق جو بھی کر لو تمہیک ہے لیکن قدرت اللہ کے جھوٹ کا پل لٹنے کا یہ موقع پتا چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

”بالکل پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عارف نے کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ یہ نیا جھک قدرت اللہ کے لئے بڑا کارگر ثابت ہوگا۔ کمان والا جھک بھی اچھی لوگوں کو بھولا نہیں ہے۔ اپنے درجنوں دستاروں کے سامنے وہ اپنی زنجی بیوی کو اپنے جادو نوے سے بچائیں سکا تھا۔ اس واقعے کے چرچے ابھی تک ہوتے ہیں۔“

صلاح مشورے کے بعد عارف چلا گیا۔ اصل خان بھی اصرار کر کے اس کے ساتھ ہی گیا۔ شانی کو عارف کی صلاحیتوں پر مجبور تھا۔ وہ کبوتر پر اداری میں پڑھا لکھا شخص تھا۔ ایک جو شیخ لیزروالی ساری خصوصیات اس میں موجود تھیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت شانی کو اصل خان کا فون موصول ہوا۔ ”کہاں ہو اصل؟“ شانی نے پوچھا۔

”پھل الٹی کلینک کے سامنے۔“ اصل خان نے جواب دیا پھر بولا۔ ”شانسی بہن! عارف نے تو کمال کر دیا ہے۔ ایک دم کوک باندھ ہے یہ۔“

”کیا سوا؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے دو بوسوں میں بہت سادہ بپاتی لوگ یہاں پہنچا ہے۔ یہ سب کا سب ہسپتال کے اگلے اور پچھلے گیٹ کے سامنے جمع ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اندر جا رہے ہیں صاحب کا زیارت ہے۔ وہ بتا رہے۔ ام بکر مند ہو کر آیا ہے۔ ان میں بہت سا عورتیں بھی شامل ہے جو قدرت اللہ کی بیویوں کا قتل دیکھنا چاہتا ہے۔ اصل میں یہ سب کا سب عارف (عارف) صاحب کا اپنا آدمی ہے۔ اندر جو قدرت اللہ کا ساتھی لوگ ہے وہ ایک مریض ہے۔ وہ اس بات سے انکار کر رہا ہے کہ یہاں حضرت قدرت اللہ کا کوئی رشتہ ہے۔ بڑا دلچسپ صورت حال پیدا ہو گیا ہے۔“

”کوئی میڈیا والا بھی آیا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”چار یا پانچ اخبار والا کچھ چکا ہے۔ ایک ٹی وی چینل کا چھوٹا سائمن بھی ہے۔ ان کے ساتھ ہسپتال کا انتظامیہ جھڑا کر رہا ہے۔ ان کو اندر جانے نہیں دے رہا۔ ابھی تو ہسپتال والوں نے پریس کو دور رکھنے کے لئے پولیس بلائی تھی دھکی بھی دیا ہے۔ تو میری پہلے ایک اخبار والا بہت چلا کر پول رہا تو وہ کبیر پڑھا کہ یہ وہ میڈیا ہے۔ یہاں پنڈی کے کامیور زادے جوٹ موٹ کے بیچارہ بن کر آئے ہیں اور عیاشی کر رہے ہیں۔ یہاں بہت رولا پڑا ہوا ہے جی۔“

”کسی کو بتا چلا ہے کہ قدرت اللہ کی بیویاں یہاں کیوں داخل ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

”بالکل جی عارف صاحب نے اخبار والوں کو اپنا نام بتائے بغیر ٹیلی فون کے ہیں۔ بڑے بڑے عیاشی بات گھوم رہا ہے کہ غار خاں والا بھاری قدرت اللہ کے اپنے گھر میں آ گیا ہے۔“

بات کرتے کرتے اصل ایک دم چونکا۔ پھر اس کی آواز تھوڑے وقفے کے بعد ریسور پڑا۔ ”یہاں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو رہے ہیں! ابھی ایک فریٹر زلی پر کوئی تین درجن مرد عورتیں یہاں پہنچا ہے۔ مارا خیال ہے کہ یہ پنڈی کے آس پاس کے علاقے کا لوگ ہی ہے۔ شاید یہ قدرت اللہ کا اصل عقیدت مند ہے۔ ہسپتال کے آس پاس لوگوں کا رش بڑھتا جا رہا ہے۔ سامنے گیٹ پر قدرت اللہ کا ملازم لوگ نظر آرہا ہے۔ وہ خرابی جالب بھی ہے۔ یہ سب لوگ سخت شیشا ہوا ہے۔“

اصل خان فون پر جیسے رواں ٹھہر کر رہا تھا۔

ہسپتال کے ارد گرد رات تک کھٹکھٹ جاری رہی۔ پنڈی کے نواحی علاقوں سے بہت سے لوگ یہاں آ موجود ہوئے تھے۔ عارف کبوتر نے جن لوگوں کو جوہر آباد سے بلوایا تھا وہ بھی جھبک لیا ہسپتال کے گرد پکا ڈیم لٹے ہوئے تھے۔ مختلف افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ ”یہ بی طرف ہسپتال کی انتظامیہ اور قدرت اللہ کے ساتھی اس امر سے صاف انکاری تھے کہ حضرت قدرت اللہ کی فیملی میں سے کوئی شخص یہاں موجود ہے۔ اخبار والے اپنے طور پر وہ ہونے کی کوششوں میں مصروف تھے اور وہ اپنے ذرائع سے اس حد تک تصدیق کر چکے تھے کہ وہ جیسے ہسپتال کے دی آئی پی بلاک میں ایمرٹ ہیں اور غالب امکان یہی ہے کہ وہ جیسے رات اللہ کی بیویاں ہیں۔“

رات ہونے کے بعد کچھ لوگ ہسپتال کے ٹینس کے سامنے سے واپس جانے لگے۔ ان کے زبردہ روتی لوگ تھے جو پنڈی اور ارد گرد سے آئے تھے۔ اکثریت ہسپتال کے ارد گرد موجود رہی۔ کچھ لوگوں نے ہسپتال کے ساتھ ساتھ گرین بلیٹ پر قبضہ جما لیا۔ مچوائی ہسپتال میں چھپ رہے۔ کچھ مچ پھرواپس آنے کے لئے اندرون شہر کی طرف جانے کا ہوتے لگے۔ اصل خان ایک ایف ایکس سوزوکی کار میں موجود تھا۔ کار میں اس کا پرانا دست نڈر پورٹر لٹاف خان تھا۔ وہ نہایت گوربا چٹا خوبرو جوان تھا۔ لٹاف خان کو یار سے پیار تھی شانی بھی بولتے تھے۔ وہ ایک دلیر اور بڑے صحافی تھا اور ڈیمہ غازی خان کے قتل رکھتا تھا مگر تھوڑے فیروہ نہیں جانتا تھا۔

آج دن کے وقت لٹاف خان نے دو تین بار کوشش کی تھی مگر فھل الٹی کلینک کے اندر داخل

نہیں ہوسکا تھا۔ ایک مرتبہ تو گاؤں کے ساتھ اس کی ہاتھ پائی بھی ہوئی تھی اور اس کا چھوٹا کمرہ اونے اونے ہاتھ تھا۔ گاؤں سے اسے گھونسا دار تھا۔ جواب میں لگی خان نے بھی اس کے اگلے دانت بلا دیئے تھے۔ یہ پرانے مال کی چھوٹی گاڑی لگی خان کے استعمال میں رہتی تھی۔ سارا دن کا تھا بارگاہی خان نشست کو اس سڑج کر کے اگھر رہتا تھا۔ اہمل خان نے سواری چھوٹی سی لنگی لی اور اپنے ڈھپ پاؤں کو اٹھا کر دوسری کانگ کے کھینچے پر رکھ لیا۔ شانی سے سچ کر چوری پیچے دو بجی کبھی تھوڑی سی سواری لینا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل قدرت اللہ اور اس کی بیویوں میں الجھا ہوا تھا۔ ٹیکنک کی انتظامیہ صاف اٹکا کر رکھتی تھی کہ یہاں قدرت اللہ کی کوئی عزیز ہو سکتا ہے۔ اگر اہمل نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح شاید اس کا یقین بھی ڈال دیا ہوتا۔

رات کا قریب ایک بج چکا تھا۔ اچانک اہمل کی نگاہ ایک گاڑی پر پڑی۔ یہ گاڑی بیڈ لائسنس آن کے بغیر ہسپتال ٹھیک کے دائیں پہلو کی طرف جا رہی تھی۔ اہمل کی تیز چٹائی جس نے اسے خبردار کیا۔ اس نے لگی خان کا بازو ہلا کر اسے چکایا۔ ”کوئی گاڑی ہے یا۔ ام نے ابھی اس طرف ایک نوٹیاں کار دیکھا ہے۔“ اہمل نے اگلی سے تارک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

لگی خان بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنی سوزی کار ایسی جگہ پارک کر رکھی تھی جہاں سے وہ ٹیکنک کے دونوں ٹیکس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ خاص طور پر پچھلے گیت پر ٹیکنک اگلے گیت کی طرف تو گرین جیلٹ کے ساتھ ساتھ کافی لوگ موجود تھے اور چار پانچ اخبار والے بھی تماچا لے رہے تھے۔

اہمل خان اور لگی خان نے ایک ساتھ گاڑی چھوڑی اور ٹیکنک کے پہلو کی طرف گئے۔ وہ گھاس پھوس پر ایک اخبار نویس کے قریب سے گاڑی ٹیکنک کی عقبی سڑک پر پہنچے اور پھر دائیں پہلو کی طرف آگئے۔ یہاں مکمل سکوت تھا۔ باؤڈری والی خاص اونچی تھی اور اس پر نوک دار تین گول بھی لگی تھی۔ یہاں ایک چیز پر اس سے پہلے کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی چوکر کھڑی تھی جس میں آگنی پت لگا ہوا تھا۔ دراصل اس طرف رہائشی علاقہ تین سو چھوٹے چھوٹے میڈیکل سٹور تھے۔ غالباً ہر بعض میں یہاں سے دوا نہیں وغیرہ حاصل کی جاتی تھی۔ رات کے اس پہر یہ دونوں سٹور بند تھے۔

اہمل خان نے دیکھا، نیلے رنگ کی نوٹیاں کار اس کو سڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چاروں دروازے کھلے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی میں سے ایک سایہ رکوع کے انداز

میں جبکہ کر باہر آیا۔ یہ ایک چادر پوش عورت تھی۔ اس کے پیچھے دوسری عورت لگی۔ وہ بھی سرتاپا چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ ان دونوں عورتوں سے پہلے ایک مرد باہر آچکا تھا اور دو کار کے باہر کھڑا تھا۔ اہمل خان کے لئے اب یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ سراسیمہ سانسے میں لپیٹا اور دوڑتا ہوا نیلے کار کی طرف آیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہو تو لوگ؟“ دو قریب پہنچ کر باز۔

اس کے ساتھ ہی اس نے کار کے قریب کھڑے شخص کو دکھایا۔ لگی خان بھی شرم چٹاتا اہمل خان سے آگیا۔ ایک دم پھل پھل پیدا ہو گئی۔ سامنے والے گیت پر موجود افراد پر تک گئے۔ ان میں سے کچھ دوڑتے ہوئے موقع کی طرف آئے۔ لگی خان کے جدید کمرے کی فلیش گرین دو تین بار چمکی اور سنسنی مزید بڑھ گئی۔

کار کے قریب موجود افراد نے اہمل کو جواہر دیکھے دیکھے اور دونوں عورتوں کو کار میں بیٹھنے کی کوشش کی۔ اہمل خان نے پھرتی سے ہاتھ چلا کر ایک عورت کی چادر اس کے سر سے کھینچ دی۔ اس کے ساتھ ہی لگی خان کی فلیش گرین نے اپنا کار کیا۔ عورت کا چہرہ ہلکے سے لے روشنی میں نہا گیا۔ یہ قدرت اللہ کی بھلی بیوی عیسر فراقی تھی۔ اس کا یہ وہ بیماری کے اثرات سے داغ دار تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ جدید کمرے نے تین چار سیکنڈ کے اندر خود کار طرے سے اس منظر کی کئی تصاویر اتار لیں۔ اہمل نے دوسری عورت کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی جو جزوی طور پر نایاب تھی۔

قدرت اللہ کا سالو نا چلیا جالب چنگھاڑتا ہوا لگی خان پر پھیلا لیکن راستے میں ہی اہمل خان کی کانگ کام کر گئی۔ وہ اپنی پسلیوں پر ضرب کھا کر لڑکھڑاتا ہوا کار کی سائین سے باہر آیا۔ اب درجنوں لوگ موقع پر پہنچ گئے تھے اور حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ قدرت اللہ کے ایک مرید نے زمین پر گری ہوئی چادر اٹھا کر پھر سے عیسر فراقی کو دکھانا اور اس میں دھکیل دیا۔

دو اور افراد پور پور لگی خان پر پھینچے۔ ایک کی ناک پر لگی خان نے سر کی ٹکر رسید کی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گریا۔ دوسرے کو اہمل نے اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر اسٹریٹ کے کنارے چلے مارا۔ ”بھانگہ کی“ اہمل خان چلایا۔

دونوں آگے پیچھے سوزی کار کی طرف دوڑے۔ یہی وقت تھا جب نیلے کار کے عقبی ناکل کا پہلا فائر ہوا۔ دھماکے سے قریب دو چار گولہ اٹھے۔ دوسرا فائر بھاگتے ہوئے لگی

خان کے چہرے پر لگا۔ اجمل نے اسے منہ پکڑ کر دہرا ہوتے دیکھا لیکن وہ زخمی ہونے کے بعد بھی رکا نہیں۔

اصل نے دوڑتے دوڑتے اپنا سائیکسٹر لگا کر محل قیص کے بیچے سے نکال لیا تھا۔ اس نے نیل کار کی طرف دو قازر کئے۔ کار کے شخصے ٹھونے کی آواز میں آئیں۔ رائفل کی دو گولیاں اصل کے سر پر سے سستانی ہوئی گزر گئیں۔ اس نے پلٹ کر پھر دیکر کئے۔ اس کے بے مثال نشانے نے رائفل بردار کارڈ کو ڈی کھائی اور وہ گر گیا۔ دونوں ہلک کر دوڑتے ہوئے سوز کی کار تک پہنچے۔ اندر گھستے لی گئی محنتی سیٹ پر ڈھکے۔ دوخت زخمی ہوا تھا۔ اصل جانتا تھا کہ چالی ایشیوں میں ہی ہے۔ اس نے کار کی اوٹ کی اور پیچے آنے والوں پر مسلسل قازر کئے۔ جب دوسرے میگزین میں صرف تین گولیاں رہ گئیں تو اصل جیت کر کار میں سوار ہوا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔

گاڑی چلاتے چلاتے اس نے مڑ کر لگی خان کی طرف دیکھا۔ کیمرہ اس کے گلے میں تھا۔ وہ سیٹ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خون بہہ بہہ کر سیٹ کو بھگور رہا تھا۔

”آ...“ و... غوں... غاں۔“ کلکی نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ منہ کے اندر ہی گنڈھ ہو گئے۔

اجمل نے ذرا نیچے گرتے گرتے گاڑی کی اندرونی لائٹ آن کی اور لگی خان کا رخو رو چہرہ دیکھ کر کاپ گیا۔ کوئی اس کے ایک رخسار میں کسی خفیہ خانہ وائٹ توڑتے ہوئے دوسرے رخسار سے نکل گئی خفیہ۔ گولی کے گرنے کا ہلکا سا طریقہ ہوگا۔ یہ ہلکا ہوا سیسہ کہیں سے ٹھس کر کہیں سے نکل سکتا ہے باجم سے اندر یہ پھسل کر کہیں ٹھس کر سکتا ہے۔ چھچی چیزوں کی ترتیب ہوتی ہے، نمہ چیزوں کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ خون کی، جان توڑ لذت کی اور موت کی ہلکا سی ترتیب ہوگی۔ چند منٹ پہلے آرام سے اچنی نشست پر بٹھائے والا دلکش لگی خان اب چونچاں تھا۔ اس ساری معینیت کے باوجود دھمکی کی خان شاید لگی کی ثابت ہو تھا۔ گولی صرف ڈیزل آج اوپر لگتی تو اس کی کٹھنی میں ٹھس جاتی اور وہ اب تک ٹھنڈا بھی ہو چکا ہوتا۔

اچانک اجمل کو اپنے عقب میں ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ ہیڈ لائٹس طوفانی رفتار سے ٹیکسٹ کے عقب سے برآمد ہوئی تھیں اور سڑک کی کار کی طرف جھپٹ پڑی تھیں۔ یقیناً یہ قدرت اللہ کے پہلے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کب کب اور کب کب ان کے ہاتھ سے نکل

ہاں۔ وہ اندھا دھند تعاقب میں آ رہے تھے۔ یہ کم از کم دو گزیاں تھیں۔ اجمل کے پہلے
 میں اب صرف تین گولیاں تھیں۔ ان تین گولیوں سے وہ ہر قدرت اللہ کے ساتھیوں کو خود
 سے دو نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیا موقع پر موجود لوگوں میں سے کچھ لوگ مدد کے لئے ان کے پیچھے
 آئیں گے؟ اس نے غور سے سوچا۔

اس کا امکان بہت کم تھا۔ جو کچھ ہوا تھا بہت آناٹا ہوا تھا اور میڈیاں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی کئی سوڑ مز پکی تھیں۔

عقبی نشست سے زخمی کئی خان نے ناقابلِ فہم آواز میں کچھ پوچھا۔ اصل سمجھ گیا۔ وہ بانٹنا چاہ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔

اجمل نے کہا۔ ”یار! تم کوڈا کنز کا ضرورت ہے۔ ام تم کو سب سے پہلو ہسپتال پہنچانا پاتا ہے۔“

نکلی خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ایک دو الفاظ بولے اور کیمبر سے ہر ہاتھ مار کر اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کا رخ اخبار کے دفتر کی طرف موڑے تاکہ کیمبر محفوظ ہاتھوں میں پہنچ سکے۔

”لیکن برادر! ام دختر تک نہیں پہنچی تھکے گا۔ ادھر راستہ تنگ ہے۔ ام پکا جائے گا۔“

لگی خان نے ایک بار پھر بے قراری سے سر ہلایا۔ اس نے سر اٹھا کر عقب میں
دیکھا۔ متعاقب گاڑیاں اب بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ کسی بھی وقت کہہ سکتا تھا۔

کلی خان نے جیٹھ کر اپنی سائید والی کھڑکی کا کیشہ کھینچے اور ایسا اصل خان میں سمجھا کہ وہ کیا کر چاہ رہا ہے۔ یہ ہسپتال کا راستہ پکڑنے کے لئے اصل خان نے گاڑی کو جوئی ایک مطلق مزید چرخی دیا، گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ کلی خان نے اپنا جھومنا سکیورٹیز کے باہر پھینک دیا۔ یہ ایک فائدہ پہنچا۔ بہت سا کوڑا کرکٹ کارپوریشن کے جہاز ساز ڈے (کنسٹیبل) میں تھا اور بہت سا درگزر بھرا ہوا تھا۔ کیرا کوڑے میں گر اور اوپر مچھل ہو گیا۔

اجمل اور لکی خانہ میں شکل سو میٹر آگے تھے ہوں گے کہ عقب سے رانگل کا فائر ہوا۔
 بولی مقبلی سکرین کو تو ذکر چہرے میں محسوس کی۔ اجمل نے چلتی گاڑی سے ہاتھ نکال کر عقب
 میں بھٹل کا فائر کیا۔ پہلی گولی نے ہی عقب میں آنے والی کار کا ٹائر برست کر دیا اور دو گولی
 زخمت ہاتھ پر چڑھی پھر ایک بندہ دکان کے شے سے جا ٹکرائی۔ یہ شہر کا قدرے بارش علاقہ
 تھا لیکن ساری دکانیں وغیرہ بند نظر آ رہی تھیں۔ تعاقب میں آنے والی دوسری کار طوفانی رفتار

سے آگے بڑھی۔ یہ پرانے ماڈل کی لیکن بہت مضبوطیوٹا مارک ٹو تھی۔ گاڑی نے وحشتانہ انداز میں ہلکی پھلکی ایف ایکس کو سائیڈ ماری اور اپنے زور سے رگیدتی ہوئی ایک دکان کے تھڑے سے جا بکرائی۔ ایف ایکس کی وہ سکرین پختا ہوا ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ مارک ٹو میں سے قدرت اللہ کے پیچھے کو بیٹھے بغیر ہمارے ہوئے نکلے اور اصل خان پر چل پڑے، ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک اور کار چبھنے سے آئی۔ اس کار میں سے مارک ٹو پر براہ راست گولیاں چلائی گئیں۔ مارک ٹو میں سے ایک بندہ فوری طور پر زخمی ہو کر گر گیا۔ باقی نے اپنی گاڑی کی آڑ لی۔ پانچ دس سیکنڈ کے لئے دونوں طرف سے اندھا و حند فارنگ ہوئی۔ ہر طرف چنگاریاں مٹی چھوٹ گئیں۔ یہ پہل اور ماڈز کے فار تھے۔ وہ تین بارٹر ہل ٹو کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ اصل نے اپنی گاڑی میں دیکھ دیکھ دیکھا، اس کی مدد کرنے والے تین افراد میں سے ایک عارف کبھو تھا۔ وہ خود بھی گاڑی کے دروازے کی اوٹ سے ماڈز کا کارٹر کر رہا تھا۔ اجمل خان کا دل خوش ہو گیا اور بوجھ سے بھر گیا۔

اسی دوران میں عقب سے پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ شاید وہ گاڑیاں تھیں۔ جونہی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیکے مارک ٹو کے عقب میں پیچھے ہوئے افراد صورت حال سے بددل ہو کر بھاگ نکلے۔ اجمل نے انہیں ایک بغلی گلی کی تاریکی میں اوہل ہوتے دیکھا۔ عارف کبھو بھاگتا ہوا ایف ایکس تک پہنچا۔ اس نے پہلے خون آلود گلی خان کو دیکھا پھر اجمل خان کو پہنچا اور بولا۔ "اجمل خان! پولیس آگئی ہے۔ بھڑے کہ تم نکل جاؤ۔ میں یہاں سنبھالنا ہوں۔"

عارف ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اجمل خان نے زخمی گلی خان کا شانہ تھپکا اور بولا۔ "پریشان نہیں ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ارم بھارہ کیسرا بھی آجھوڑتا ہے ابھی۔"

پولیس کی گاڑیاں نزدیک آئی تھیں۔ اصل نے جست کی اور ایک مل کماٹی تار یک گلی میں ٹھس گیا۔

☆=====☆

شانہ اور اس جھمی جھمی صبح اسے ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی۔ رنگ والی ٹوئلی میں وہ اپنے لپائی کے ساتھ ننگے پاؤں شہر آگیا۔ وہ اس پر چلتی تھی۔ پرندوں کا چھپانا، پھولوں کا مسکراتا اور سنہری کرکوں کا نمودار ہونا۔ سب کچھ اسے اچھا لگتا تھا۔ ابھی اس کے ارد گرد وہی مناظر تھے۔ مگر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کوئی شے بھی جو اس کے اندر ٹوٹ گئی تھی اور کرچی کرچی ہو کر رگ و پے میں پست ہو گئی تھی۔ ان کرچیوں میں سے ہر کرچی پر ایک ہی تصویر

نظر آتی تھی اور اس کی جان کو ہلکان کرتی تھی۔

اجمل خان رات کو فضل الہی ٹھیک چلا گیا تھا اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے سنا جائزہ اخبار پڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ شانہ نے پہلے صفحے پر ایک خبر دیکھی اور نرئی طرح چونک گئی۔ لکھا تھا۔ "رات گئے فضل الہی ٹھیک کے سامنے بھگا۔ قدرت اللہ کی بیویوں کو چوری چھپے ٹھیک سے نکال لیا گیا۔" اخباری رپورٹروں سے ہاتھ پائی۔ کسیرے چھیننے کی کوشش۔ ایک رپورٹر شدید زخمی۔"

نچے تفصیل درج تھی کہ نصف شب کے بعد فضل الہی ٹھیک کے سامنے کیا اور کیسے ہوا۔ یہ سب کچھ مشنی خیر تھا۔ تاہم یہ مکمل تفصیل نہیں تھی۔ یہ انگریزی اخبار تھا۔ اس میں واقعہ کی بس ایک ہی دوکانی خبر تھی۔

قریب ہی مارکت تھی۔ وہاں سے اردو اخبارات مل سکتے تھے۔ حاجی حیات کا ایک ملازم چمٹی پر تھا۔ دوسرا تاشہ وغیرہ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ شانہ نوواں مارکیٹ کی سرف چل دی۔ کوٹھی سے نکلے ہوئے وہ مکمل پردہ کر لیتی تھی۔ وہ مارکیٹ میں پہنچی۔ بس سٹاپ کے ساتھ اخبارات اور رسائل وغیرہ کا شال تھا۔ اردو اخبارات میں اس واقعہ کی خاصی تفصیل آئی تھی۔ ابھی شانہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہ بس سٹاپ کی طرف گئی اور اس کی ساری حیات سمٹ کر اس ناکھوں میں آگئیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ حقیقت میں نہیں اپنے تصور میں کوئی منظور دیکھ رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ چکر کاہن بن گئی۔ اس نے رستم کو دیکھا۔ وہ ایک بیساکھی کے سہارے چٹا ہوا ایک لوکل بس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانہ نے اسے عقب سے دیکھا۔ اس کے لمبے بال اس کے ہموار کندھوں پر جمول رہے تھے۔ وہ ایک بکلی سی شلوار قمیص میں تھا۔ شلوار کا ایک بانچہ بے بسی سے ہوا میں جمول رہا تھا۔ پھر شانہ کا کستہ نوجا۔ وہ اخبار ٹھیک کرستم کے پیچھے لگی۔ "رستم۔ رستم۔" اس نے دور ہی سے آواز دی۔ اس کی آواز میں کرب کا جہان سنا ہوا تھا۔

رستم جب تک بس کے پیچھے دروازے میں سوار ہو چکا تھا۔ شانہ کے پیچھے پیچھے بس چل پڑی۔ شانہ بس کے پیچھے بھاگی۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی۔ "رکو۔۔۔ خدا کے لئے رکو۔"

یہاں بچوں کا سکول تھا۔ بس رفا نہیں پڑ رہی تھی لیکن رک بھی نہیں رہی تھی۔ شانہ اس کے پیچھے دوڑتی آئی۔ "رک جاؤ۔ خدا کے لئے رک جاؤ۔" اس کی ایک سینڈل آڑ گئی تھی۔ وہ ایک ہی سینڈل کے ساتھ ڈنگوٹائی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ پھر شادی بس کی سوار یوں میں سے

کسی کو ترس آیا اور تھوڑا آگے جا کر بس رک گئی۔ شانی بھاگ کر لیڈ پر دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ نری طرح پانی پانی ہوئی تھی۔ ”کیا بات ہے مس؟“ کنڈیکٹر نے تجب سے پوچھا۔

”کبک“ کچھ نہیں۔ میں اپنے ایک عزیز کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“

”کہاں ہے؟“

”پیچھے سوار ہوئے۔“ شانی نے کہا اور مردانے حصے کی طرف بڑھی جہاں محل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لوگوں نے تجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

شانئی مسافروں کے درمیان سے راست بناتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی۔ اس کے انداز میں انتظار دے رہی ہے تاہی تھی۔ مسافر خلی امامان حد تک سٹ کر اسے راست دینے کی کوشش کر رہے تھے پھر بھی اس کا آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ بس رکی ہوئی تھی۔ جلد ہی شانی جتنی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ اسے بیکسی نظر آئی۔ پھر بیکسی والے کے لمبے بال نظر آئے۔ پھر وہ خود نظر آیا۔ اس کے چہرے پر چمک کے چھوٹے چھوٹے داغ تھے۔ ناک قدرے پھولی ہوئی تھی۔ وہ رستم نہیں تھا۔

شانئی کے دل میں جیسے ایک زوردار گھونسا لگا۔ وہ گرا کر رو گئی۔ تماشادیکھنے کے لئے کسی ایک سوار یاں اپنی نشستوں سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ شانی بے دم کی ہو کر ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی۔ دکھ۔ شرمندگی۔ پریشانی۔ وہ جیسے اپنے ہی پسینے میں ڈوب گئی۔ کچھ لوگ بعد رومی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جیسے اس کی ذہنی حالت پر افسوس کر رہے ہوں۔ شانی اپنے دل ہی دل میں پکار کر کہی۔ ”دیکھ لو رستم! میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ کہاں کھو گئے ہو؟ کہاں؟“ وہ سسک اٹھی۔ ٹانگ سے معذور شخص بھی حیرت سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا پھر ایک اور شخص آگے بڑھا۔ اس نے بڑی نرمی سے شانی کے کندھے کو تھپھپھوایا۔ ”شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ کیا آپ مجھے آرتا جانتی ہیں؟“

شانئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شانی کے لئے راست بنانا ہوا اسے بس سے نیچے لے آیا۔ ”میں نے بھی بس یہاں پاس ہی آرتا تھا۔“ وہ شانت انداز میں بولا۔

شانئی کو ایک سینڈل کے ساتھ چلنے دیکھ کر شاید اسے کوشش ہو رہی تھی۔ وہ رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہ ایک خاصے لمبے قد کا بڑا پٹا شخص تھا۔ وہ شانی کو صورت سے بھلا مانس نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنی چری چیل اُتاری اور کہنے لگا۔ ”آپ کچھ دیر کے لئے یہاں

لیں۔“

اس کے اصرار پر شانی نے چیل پہن لی۔ ایک دم ایک نیا خیال شانی کے ذہن سے نکرایا اور وہ بڑے دھیان سے اس شخص کو دیکھنے لگی۔

وہ لیڈر سے چہرے والا ایک بڑا پٹا شخص تھا۔ شانی نے ایک بار پھر دھیان سے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ڈولے کی تیز لگا ہوں نے گورے کے پٹنگے کے پاس کسی ایسے ہی پاؤں کی نشاندہی کی تھی لیکن ایسا کسی ایک شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی شہر راہلپنڈی میں یقیناً درجنوں افراد اسی قسم کا غیر معمولی قد اور غیر معمولی پاؤں رکھتے ہوں گے۔

اس شخص کا طبع کھلاڑیوں جیسا تھا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کرکٹ کا کھلاڑی ہے۔ اس کے جوئے بھی کھلاڑیوں جیسے تھے جن کے نیچے پھوٹے پھوٹے نکلے ہوئے ہیں۔

”لگتا ہے کہ آپ کو بڑی شدت سے کسی کی تلاش ہے۔“ اس شخص نے بڑی ملاصحت سے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ شخص آپ کا بہت قریبی ہے۔“

شانئی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ کون ہیں؟“ شانی نے سوال کیا۔

”میرا نام زبیر ہے۔ یہاں پنڈی میں میری کھیلوں کے سامان کی شاپ ہے۔ زبیر سپورٹس کے نام سے۔“

”کس جگہ؟“

”صدر میں۔“ اس لمبڑھنگ نے کہا۔ شمرانی کو سر تا پا دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ”آپ نوکروں کو سنبھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کسی کے پیچھے بھاگنا آپ کے لئے مناسب نہیں۔ آپ فضل سے بہت سمجھ دار لگتی ہیں۔“

شانئی اسے کیا بتاتی کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے اور اس کی ساری کچھ بوجھ جذبات کے کس طوفانی ریلے کی زد میں ہے۔ دن دن اس کا دماغ ماؤف ہوتا رہا تھا۔ کسی کی جانیں چھائی اتنی شدت سے اثر انداز ہو رہی تھی کہ اس کے سارے اصول، ضابطے، تر تھے۔ وہ قریب آیا تھا۔ بہت قریب آیا تھا اور پھر بالکل اچانک غیر متوقع طور پر اس سے دور چلا گیا تھا۔ یہ عجیب جدائی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے اور اسے کب واپس آئے گا؟ وہ ڈھونڈنے والے شانی کو بس طفلانہ تسلیاں ہی دے رہے تھے۔ حاجی

حیات، سب انجیل پڑھنا، اصل خان اور عارف کبہ سب اپنے اپنے طور پر کوشش کر رہے تھے مگر کامیابی کسی کو نہیں ملتی تھی۔

کچھ دیر بعد شانی نے اس شخص کو خدا حافظ کہا۔ اخبار کے سنال سے اردو اخبار لیا اور واپس گھر آگئی۔ جب تک اصل خان واپس پہنچ چکا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھ پر چند ایک خراشیں تھیں۔ یہ خراشیں اس وحشیگانہ مشق کا نتیجہ تھیں جو رات کو اصل خان، لگی خان اور قدرت اللہ کے چیلوں میں ہوئی تھی۔ اصل خان کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ شانی کے ہاتھ میں اخبار دیکھ کر وہ قہقہے کی طرح اخبار پر جھپٹا۔ اخبار میں قدرت اللہ اور اس کی بیویوں کے بارے میں دعوں و دھار جبریں دیکھنے کے بعد وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

نامہ نگاروں نے رات والے واقعے کو خوب مہینے کے ساتھ بیان کیا تھا۔ ایک بڑی سرٹی کچھ اس طرح تھی۔ ”جوٹ کا پول کھل گیا۔ ہسپتال میں قدرت اللہ کی بیوی بی بی داخل تھیں۔“

”نیز فوٹو گرافر سے کیمرے چھیننے کی کوشش۔ رپورٹروں سے ہاتھ پائی اور فائرنگ۔ اندھی گولیاں لگنے سے ایک شخص ہلاک۔ تین افراد زخمی۔“

”زخمی فوٹو گرافر لگی خان کی ایلف ایکس گاڑی کا چارکلو میٹر تک تعاقب کیا گیا۔ لگی خان کا کیمرا غائب۔“

خبر کے متن میں تفصیل سے درج تھا کہ قدرت اللہ کی دونوں بیویاں بڑا سرا جلدی بیماری کا شکار ہیں۔ اس سے پہلے قدرت اللہ اور ان کے عقیدت مندوں کا دعویٰ تھا کہ یہ Skin Disease صرف انہی لوگوں کو لاحق ہوتی ہے جو ایک موقع پر ہیر صاحب کے ساتھ گفتگو کیے کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس بیماری کو خاص طریقے سے اسکیڈنٹ لائز کیا جاتا رہا ہے تاکہ ہیر صاحب کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔

اخبار میں ایک جگہ رات والے واقعے کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ تصویر بہت بھاگ دوڑ میں اتاری گئی ہے۔ اس تصویر میں ایک چادر پوش عورت کی پشت دکھائی دیتی تھی اور وہ گاڑی نظر آتی تھی جس میں اسے سوار کرایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ قدرت اللہ کے ایک مشتعل مرید کا چہرہ تھا۔ وہ کیمرے کے سامنے ہاتھ کی ڈھال بنا کر فوٹو گرافر کو تصویر بنانے سے منع کر رہا تھا۔ اس تصویر میں دو اہم چیزیں نمایاں تھیں۔ یعنی گاڑی کا نمبر اور چادر پوش عورت کا چہرہ۔

اخبار نے توازن قائم رکھتے ہوئے دوسرے فریق کا کتنا نظر بھی وضاحت سے بیان کیا

تھا۔ ہر قدرت اللہ کے ایک بیان کو سرٹی کی شکل دی گئی تھی۔ سرٹی یوں تھی۔ ”اللہ میرے مخالفین کو ہدایت دے۔ وہ اوتھے جھٹھلندوں پر اتر آئے ہیں۔“

پچھلے تھا۔ ”بے بنیاد الزامات لگانے والوں کی آوازیں بہت جلد دم توڑ جائیں گی۔ یہ لوگ قابلِ رحم ہیں۔“

متن میں درج تھا۔ ”ہر قدرت اللہ نے رات والے واقعے کو سرا سراً زراہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں۔ جو بے پردگی اڑا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ ان کی پشت پناہی کون لوگ کر رہے ہیں اور ان کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔ ڈکیتوں اور ناگمراہی قاتلوں سے قتل کر رکھنے والے لوگ اس نورانی تحریک کو کیسے دبا سکتے ہیں جو سورج کی روشنی کی طرح پھیل رہی ہے۔“ کل رات فضل الہی کینک کے چھوڑے پیش آنے والے واقعے کا دفاع کرتے ہوئے ہیر صاحب نے کہا۔ ”یہ واقعہ اس قابل نہیں کہ اس پر تبصرہ کیا جائے۔ میری اہلیہ کو پانی بلڈ پریش کی تکلیف تھی اور وہ علاج کے لئے چند روز سے مذکورہ کینک میں موجود تھی۔ دوسری اہلیہ اس کی دیکھ بھال کے لئے وہاں موجود تھی۔ اس بیان میں قطعی صداقت نہیں ہے کہ میری اہلیہ خدا خواستہ کسی خاص جلدی بیماری کا شکار ہے۔ ہسپتال میں اس کی میڈیکل فائل موجود ہے اور یہ فائل اس جھوٹ کے خلاف ایک کھلا ثبوت ہے۔“

ایک سوال کے جواب میں ہیر صاحب نے کہا۔ ”ہمارا اہلیہ کورات کے وقت کینک کے متقی دردواز سے لے کر لگنے کی کوشش اس لئے کی گئی کہ کینک کے گرد و پیر پند لوگوں کا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ وہ مختلف افواہیں پھیلا رہے تھے۔ نقص امن کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ کینک انتظامیہ بھی پریشان تھی۔ انتظامیہ کی خواہش تھی کہ صبح کے بجائے رات کے وقت ہی ڈسچارج شدہ مرید کو کینک سے نکال لیا جائے۔ درحقیقت اہلیہ کو بہتر حالت کے چڑب نظر شام کو ہی کینک سے فارغ کر دیا گیا تھا۔“

اس خبر کے علاوہ ہر قدرت اللہ کے حق میں ایک چھوٹی سی نیزہ موجود تھی۔ ایک مشہور سیاسی و سماجی شخصیت نے بیان دیا تھا کہ کچھ لوگ خواہ مخواہ ہیر صاحب کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس شخص نے بیان دیا تھا۔ ”اس اطلاع میں کوئی صداقت نہیں کہ خدا خواستہ ہیر صاحب کی دونوں بیویاں جلدی بیماری کا شکار تھیں اور غریب طریقے سے ہندی کے پرانیوے کینک میں داخل تھیں۔“ اس سوال کے جواب میں کہ کینک میں دونوں نواتین کی موجودگی کو چھپانے کے لئے پہلے جھوٹ کیوں بولا گیا۔ اس سیاسی شخصیت نے کہا

کہ ایسا سیکورٹی کے نقطہ نظر سے کیا گیا۔

یہ متضاد خبریں پڑھنے کے بعد اہمل خان کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا تھا۔ "یہ ایک دم وحیت اور بے غیرت لوگ ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں جیسے ڈال رہا ہے۔" وہ چوہنکار۔

شانی نے اس سے پوچھا۔ "نیز فوٹو گرافر کی خان کا ذکر اخباروں میں خاص طور سے آیا ہے۔ وہ کیسے ڈنڈی ہوا؟"

"ام اس سارے واقعے کا چشم دید گواہ ہے۔ شانی بہن۔" اہمل خان نے ڈٹوک سے کہا۔ پھر یہ سارا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ لکی خان نے کس طرح اپنا کیرا چلتی گاڑی سے کوڑے کے دھیر پر پیچیدہ دیا تھا۔

"پھر کیا بنا اس کیرے کا؟" شانی نے بے قراری سے پوچھا۔

"خو، یہی تو گزری ہوئی ہے شانی بہن! کیرا ابھی ملا نہیں۔" اہمل خان نے منہ لٹکا کر کہا۔

"تم خود صدمہ نے گئے تھے؟" شانی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ام رات کو فائرنگ والے واقعے کے کچھ ہی دیر بعد واپس اس کوڑا ڈرم (فٹھ ڈپ) تک پہنچا تھا۔ لیکن انمارا بد قسمتی کرام کوڑے کے دھیر تک نہ پہنچ سکا۔ وہاں پولیس نے ناکر لگایا تھا۔ دس پندرہ بندے کی نفری تھی۔ یہ لوگ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہر آتی جاتی گاڑی کو چیک کر رہا تھا۔ ام نے کافی دیر انتظار کیا لیکن آگے جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ فجر کی اذان سے تھوڑی دیر بعد پولیس ناکر ختم ہوا اور ام کوڑے کے دھیر تک پہنچا مگر بہت اچھی طرح دیکھنے کے بعد بھی کیرا ام کو نہیں ملا۔ ام کو لگتا ہے کہ صبح سویرے کوڑا کرکٹ اٹھا کرنے والا کوئی لڑکا کیرا اپنے جھولے میں ڈال کر لے گیا ہے۔"

"تھراپ کیا کر رہے؟"

"ہمارے سنے وہ کیرا بہت جیتی ہو گیا ہے جی! ام کو پورا یقین ہے کہ اس میں چار پانچ پونو ضرور ایسا ہے جو قدرت اللہ کا بھانڈا اچھ پڑا ہے۔ ان تصویروں میں قدرت اللہ کی دونوں بیسیوں کا شکل بہت صاف طور پر آیا ہوگا۔ انہی تصویروں کی وجہ سے وہ قدرت اللہ کا حرامی چچا! ام دونوں کے چچے لگا تھا۔"

"تمہارے خیال میں اب وہ کیرا کس کے پاس ہو سکتا ہے؟"

"ام نے پچھلے تین چار مہینے میں تو زیادہ تر سیرج کیا ہے جی۔ ام ان لوگوں سے ملا ہے جو صبح سویرے علاقے سے کوڑا اٹھا کر لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک عیسائی لڑکا شفیق بھی

ہے۔ آج صبح سویرے وہی سائیکل لے کر لگتا تھا۔ وہ مرفیوں کے پڑ و غیرہ بیع کر کے مارکیٹ میں بیچتا ہے اور اس کے علاوہ لیکن کٹھ کیٹری بھی کرتا ہے۔ ام کی آبادی میں اس کا گھر بھی دیکھ آیا ہے لیکن اس سے ملاقات نہیں ہو سکا۔ ابھی تھوڑی دیر میں اس کا پھر جانے گا۔ ام کو پکا امید ہے کہ کیرا اسی لڑکے کو ملا ہے اگر وہ اس کے پاس ہے تو وہ چار سو روپے لے کر وہ ام کو واپس کر دے گا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ملا ہی نہ ہو۔ تم بتا رہے تھے کہ وہاں پولیس والوں نے ناکر لگا رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر پڑی ہو۔"

"نہیں جی! انمارا دل گواہی دے رہا ہے کہ کیرا لڑکے کو ہی ملا ہے۔ لڑکے کی والدہ سے انمارا ملاقات ہوا ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ شفیق آج صبح بہت جلدی کام سے واپس آ گیا تھا اور پھر کمرے میں جا کر اپنے چھوٹے بھائی سے بہت دیر تک کھسکھس کر بات کرتا رہا تھا۔ ناشتہ کے بعد دونوں بھائی کام پر چلا گیا تھا۔ وہ دونوں کٹھ کیٹری کا کام کرتا ہے۔"

"یہ کام بہت جلدی کرنے والا ہے، جمل۔ بہتر ہے کہ تم اس کی ماں سے دو بارہ ملو اور پوچھو کہ وہ کہاں مل سکتا ہے؟"

"اس کی ماں نے کہا ہے کہ اسے شفیق کی دیکھن کا پتا نہیں کہ وہ کس روٹ پر چلا ہے لیکن وہ کہیں بھی ہو وہ پھر کٹھ کیٹری دیر کے لئے گھر ضرور آئے گا۔"

☆=====☆

ناشتہ کرنے کے فوراً بعد اہمل خان ایک بار پھر کٹھ کیٹری کی طرف نکل گیا۔ اس نے شانی کے چہرے پر نظر پڑنے والی بے قراری پڑھ لی تھی اور یہ بے قراری بلا وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اہمل بھی بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ جن تصویروں کے لئے اس کے چہیتے دوست لگی نان نے اپنی زندگی فطرے میں ڈالی ہے، وہ کتنی جیتی ہیں۔ خاص طور سے موجودہ صورت حال میں ان کی قدر و قیمت کی گنا بڑھ گئی تھی۔

یہ آبادی نالائیقی کے بارہ واقع تھی۔ یہاں نیچی پتھوں والے کچے کچے مکانوں کی طویل قطاریں تھیں اور گلیوں میں نیم عریاں بچے کھیل رہے تھے۔ اہمل خان شفیق کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی ماں گہرے سانلو رنگ کی تھی اور تھوڑی دور واقع ایک متوسط رہائشی آبادی میں گھروں کا کام کاج کرتی تھی۔ اس کا نام نذران تھا۔ آج اتوار کے سبب نذران کی چھٹی تھی۔ وہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ اہمل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر چونک گئی۔ اہمل نے پوچھا۔

”ہاں ماسی! کچھ پتا چلا کر کا؟“

”میں نے کہا تھا خان جی! وہ دو پیرے پہلے نہیں آئے گا۔“

اصل نے اپنی بی بی بڑی آنکھوں کے ساتھ بڑے دھیان سے مذاہراں کو دیکھا۔ وہ لگا کہ چرائے لگی۔ اصل نے اس کے سامنے چار پانی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”ماسی! مجھے لگتا ہے کہ تو کچھ بچا رہی ہے۔ دیکھ، ام تم کو سختی پر مجبور نہ کر۔ اگر کسرا گھر میں پڑا ہے تو ام کو بتا دے۔ اگر پولیس یہاں آئی اور اس نے خود کسرا کو حوذا تو تم کو لوگوں پر بڑی مصیبت آ جائے گی۔ تمہارا انعام اگر ام کو بتا دیا جائے گا تو چار ہزار روپے ملے گا۔ دے کر بھی کیا نہیں چھوڑے گی۔“

مذاہراں کا رنگ پیکا پڑ گیا۔ وہ بھلائی۔ ”خان جی! میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ کک۔ کک۔ کک۔ میرا مطلب ہے۔ کک۔“ وہ بڑی طرح گڑبگڑائی۔

اصل نے اپنے تاثرات نرم کئے اور جنت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”دیکھ مذاہراں! ام تم کو برادرانہ مشورہ دے رہی ہے۔ تم تمہارا بیٹا کسرا بارہ سو روپے سے زیادہ حاصل نہیں کر سکو گے۔ ام تم کو اس سے کہیں زیادہ انعام دے گا۔ اور ایک دم نقد۔ لیکن اگر کسرا کہیں ادھر ادھر ہو گیا تو تم پر مصیبت بھی پڑ سکتی ہے۔“

مذاہراں کے تاثرات بدل گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”خان جی! اچھی بات یہ ہے کہ مجھے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ شفیق کو کڑے سے کا رنگ کا ایک چھوٹا سا کسرا ملا ہے۔ اس کے ایک دوست بالے نے مجھے بتایا ہے۔ بالے نے ایک چھوٹی ٹیپ دے کر اس سے کسرا لینا چاہا تھا پر شفیق نے کہا کہ وہ ہزار روپے سے کم میں نہیں بیچے گا۔“

اصل کو فہم آیا۔ وہ اب سمجھ گیا کہ یہ ساری بات مذاہراں کو سویرے سے ہی معلوم تھی۔ اگر وہ سویرے سے یہ سب کچھ بتا دیتی تو شاید اصل تک شفیق کو حوذا بھی چکا ہوتا۔ اب اس بات کا شاید فطریہ پیدا ہو گیا تھا کہ شفیق وہ کسرا ہزار بارہ سو روپے میں کسی انجان شخص کو بیچ دے اور وہ مزدور دیکھتے رہ جائیں۔

انگلے دو چار منٹ میں اصل نے مذاہراں ماسی اس کا لی بھنگ عورت کو اچھی طرح دھمکایا اور اچھی طرح لالچ بھی دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصل کے ہمراہ اپنے بیٹے کو حوذا نے نکل کھڑی ہوئی۔ انہوں نے بالے ماسی اس لڑکے کو بھی ساتھ لیا جس نے صبح سویرے شفیق سے کسرا کا معاملہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تینوں ٹکسی پر روانہ ہوئے۔ ان کی منزل اندرون شہر ایک دھنن اڑتھی۔ وہ اڑے پر پہنچے تو اس بجے کا وقت تھا۔ دیکھیں ایک خول قطار میں

کھڑی تھیں۔ آگے والی دیکھوں میں سوار پانی خونی جاری تھیں۔ مذاہراں اصل کو لے کر ایک بڑے سے چمکے شخص کے پاس پہنچی جس کے ارد گرد چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس کے پاس شفیق کینڈ کیٹری کر رہا تھا۔ اس شخص کی تین چار دیکھیں اس روٹ پر چلتی تھیں۔

مذاہراں نے اس شخص سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو وہ روانی سے شفیق کو ماں بہن کی کالیاں دینے لگا اور اس نے بتایا کہ وہ آج کام پر نہیں پہنچا۔

مذاہراں کان لپیٹ کر واپس ٹکسی کی طرف بڑھی۔ اس نے اصل کو بتایا کہ آج شفیق نے لیمن سے چمکی کی ہے۔ وہ یقیناً کینڈ بکڑے نہ لیا ہوگا۔

”کینڈ بکڑے؟“ اصل نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کام ہے؟“

”یہاں کلب میں لوگ کینڈ کھیلنے آتے ہیں۔ کبھی کبھی اتوار کے روز شفیق وہاں چلا جاتا ہے۔ کینڈ بکڑے کے لئے۔“

اصل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ شاید وہ منیس کا ذکر کر رہی تھی۔ ”کلب کہاں ہے؟“ اصل نے اٹھارے سے لے کر بیس پوچھا۔

مذاہراں نے اسے ایڈریس بتایا۔ وہ تینوں ایک بار پھر ٹکسی پر کلب کی طرف روانہ ہوئے۔

ایک پوش علاقے میں بڑی سڑک کے کنارے یہ ایک سرسبز گراؤ تھا۔ یہاں ان دور ہیز کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیکس کا انتظام بھی تھا۔ جہاں شائد اندازاً ہزاراں پارکنگ میں موجود تھیں۔ دو لیز پر اپنے کو بیچنے کے ساتھ کھیل کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ دور چلے جانے والی کینڈ کو بکڑے کے لئے یہاں ایک دو غربیب صورت لڑکے موجود تھے۔ مذاہراں کو پتا لڑکا شفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے بے قراری سے دائیں بائیں دیکھا پھر اس نے اسے حوذا لیا۔ وہ ایک بنین کے پاس کرسی پر بیٹھا بڑی شان سے کولڈ ڈرنک اور چیس انجوس کے کر رہا تھا۔

وہ انجوس آٹھ سال کا سا نولا لڑکا تھا۔ بال گھٹکھڑیلے اور لباس معمولی تھا۔ اپنی ماں کو خبر نہ کہ وہ حیران ہوا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوئے شفیق! کسرا کدھر ہے؟“ مذاہراں نے اس کے پاس پہنچتے ہی تیز سرگوشی کی۔ شفیق کا چہرہ ختم ہو گیا۔ اس نے ڈر سے ڈر سے انداز میں بارعب اصل خان کو دیکھا۔

”کون سا کسرا ای؟“

مذاہراں نے دانت پیسے۔ ”کون سا کدھر ہے؟“

”وہ تو میں نے دے دیا چھوٹے صاحب کو۔“

”کون چھوٹے صاحب؟“ نذیراں نے ہنر سیز گونگی کی۔

”وہی شاہ نواز صاحب جو یہاں ٹھہرتے ہیں۔ مکانی بنیم کے بیٹے۔ انہوں نے میرے ساتھ میں دیکھا۔ ان کو اچھا لگا۔ انہوں نے مانگ لیا۔ میں نے دے دیا۔ میں نے سوچا میرے کس کام کا ہے۔“

”دے دیا کچھ دیا؟“ اہمل نے تریخ کر پوچھا۔

”نہیں جی۔ بچا نہیں ہے۔“ شفیق کے کچے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

نذیراں اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور کچھ دیر تک غصیلے انداز میں کھسک پھسکرتی رہی۔ پھر وہ اہمل کے پاس آئی اور کھانپنے لگے میں بولی۔ ”خان جی! ہم نے آنے میں تھوڑی سی دیر کر دی ہے۔ شاہ نواز نام کے اس بابو جی نے شفیق سے وہ کھیرا لے لیا ہے۔ یہ ایک ہزار روپیہ دیا ہے شفیق کو۔ اس میں سے پچاس ساٹھ روپے اس نے خرچ کر دیئے ہیں۔“ نذیراں نے چند مزے ترے نوٹ کا پیٹے ہاتھوں سے اہمل کی طرف بڑھائے۔

اہمل قی کر رہ گیا۔ شاید آج کا دن ایسا نہیں تھا۔ بہر حال یہ بھی قیمت تھا کہ کھیرا کسی انجان خریدار کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ وہ نوٹوں کی طرف توجہ دینے بغیر پھٹکارا۔ ”اب خیر ستہ وہ چھوٹا صاحب کہاں ملے گا کام کو؟“

نذیراں ایک بار پھر شفیق کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اب خاصا گھبرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اہمل کو وہ زیادہ چالاک لڑکا دکھائی نہیں دیا۔ اس حد یہ کھیرے کی قیمت بازار میں چودہ پندرہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو اس کے بدلے چار پانچ ہزار حاصل کر سکتا تھا۔

ملکہ جینا جیٹن چار منٹ تک ڈرے ڈرے انداز میں کھسک پھسکرتے رہے۔ پھر نذیراں اہمل کے پاس آئی۔ ”خان جی! شفیق خان میں کوئی قصور نہیں ہے جی۔ اگر ہم تھوڑی دیر پہلے یہاں آجاتے تو اس نے ساتھ جوڑ کر کھیرا آپ کو دے دیتا تھا جی۔ اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ مکانی بنیم کی گونگی پر لے جاتا ہے۔ اگر چھوٹا صاحب ابھی گھر ہی ہوا تو ہو سکتا ہے کہ کھیرا ابھی آپ کو مل جائے۔ نہیں تو شام کو ضرور مل جائے گا۔“

”نہیں، وہ ابھی ملنا چاہیے۔“ اہمل نے سرسراہٹے لہجے میں کہا۔ ”بیٹے کو ساتھ لو اور ابھی چلو ماراے ساتھ۔“

سانولے رنگ کے دہلے پتلے اور کسی حد تک بد بو دار شفیق کے ساتھ وہ پھر چلتی کار میں آہٹھے۔ شفیق کی نگاہیں ایک بھرم کی طرح بھٹی ہوئی تھیں۔ چند بھری نہی سڑکوں سے گزر کر وہ

نہایت کشادہ علاقے میں داخل ہوئے اور پھر ایک شاندار رہائشی آبادی میں آ گئے۔ راستے میں شفیق نے اہمل خان کو بتایا کہ چھوٹے صاحب نے آج کہیں چمک پر جانا تھا اس لئے وہ بنیم میل کر جلدی واپس چلا گیا ہے۔ دو تین کیل کی شاندار گونگی کے سامنے پہنچ کر چلتی رہی۔ شفیق نے چلتی چلتی کھین گیت سے کچھ قاصلے پر ہی رکوا لیا تھا۔ وہ کچھ ڈرا ڈرا نظر آنے لگا، جیسے اہمل خان کو یہاں چھوٹے صاحب کی رہائش گاہ پر لاکر اس نے کوئی غلط کام کیا ہو۔

اہمل خان ان خود بخوبی سے آتر اور گونگی کے وسیع و عریض گیت کی طرف بڑھتے کا ارادہ نہ ہی رہا تھا کہ ایک شاندار دیکھار کار کا رولکارے مارنی گیت پر پہنچی۔ اس کا رولکاری رحمت دانی ایک بھٹی کٹی بارعب عورت چلا رہی تھی۔ اس کے بال زیادہ بڑے نہیں تھے اور اس نے دو پانسی مٹری طرح کچھ میں ڈال رکھا تھا۔ عورت کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔

گھڑی کے اندر سے شفیق نے دہلی آواز میں کہا۔ ”بھئی مکانی جی! ہیں۔“

گیت پر موجود وہ پھرے دار بافل انٹن شین نظر آنے لگے تھے۔ دونوں نے جلدی سے گیت کھولا۔ شاندار گھڑی جیسے سڑک پر تیزی سے بھٹی اندر چلی گئی۔ ڈرائیو دے پر دس پندرہ فیٹ آگے جا کر گھڑی رک گئی۔ یہاں ایک نوجوان لڑکی موجود تھی۔ وہ نوجوان صورت تھی اور شغل سے خادمہ ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر گھڑی کا دروازہ کھولا۔ بھٹی کئی دروازہ قد ماہی بنیم باہر آئی۔ اس نے ترش لہجے میں لڑکی سے کچھ کہا جسے اس نے سر جھکا کر مٹا۔ پھر

”ڈرائیو بنگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ اس نے گھڑی کو ڈرائیو کے قریب کھیرا جوں میں سے ایک تیراج میں پہنچا دیا اور مکانی بنیم کے پیچھے ٹوٹی میں چلی گئی۔

اہمل خان کو دیکھ کر ایک مسلح پھرے دار اس کے نزدیک آیا۔ ”جی خان جی! اس سے مانا ہے۔“

”چھوٹے صاحب شاہ نواز سے۔“

”پر وہ تو کہیں جا رہے ہیں۔ ان سے تم کیا تھا آپ نے؟“

”تا تم تو نہیں لیکن ملنا ضرور ہے۔“

”کام کیا ہے؟“ اس مرتبہ ڈرائیو لہجے میں پوچھا گیا۔

”کام ام ان کو بی بتاے گا۔“

اس سے پہلے کہ گاڑی زیادہ سخت لہجے میں اہمل سے بات کرتا، دو تین گاڑیاں گونگی کے

اور سے نکل کر گیت کی طرف بڑھیں۔ ان میں ایک مکمل چھت کی سپورٹ کار تھی۔ ایک انٹن دین اور ایک چپ تھی۔ تینوں گاڑیوں میں خوش باش لڑکے لڑکیاں بھرے ہوئے تھے۔

اہل کو دبوچ لیا۔ جس نگہی میں شفیق اور اس کی والدہ وغیرہ سوار تھے، وہ صورت حال کی گنجی کیچہ کر رہے ہو گئے تھے۔ جب اہل نے خود کو گھرا ہوا محسوس کیا تو اچانک قیصر کے بیچ سے اپنا ہجرا ہوا ہتھول نکال لیا۔ ہتھول والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اس نے اوپر سے تین فانز بکسے۔ دھماکوں سے فضا لرز گئی۔ فیض اہل لڑکے حواس باختہ ہو کر چاروں طرف بھاگے۔ بچوں نے صاحب یعنی شاہ نواز بھی ان میں شامل تھا۔ وہ سب خوف زدہ ہو کر بھاگے تھے۔ تاہم انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ بھی کوئی اختیار وغیرہ لینے کے لئے دوڑے ہوں۔

اسی اثناء میں اہل کی نگاہ کو بھی کے احاطے کی طرف گئی۔ پہلے والا گارڈ اندرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ یقیناً وہ اپنی راہ نقل لینے کے لئے لپکا تھا۔ اہل نے چند سیکنڈ کے لئے سوچا۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اب صورت حال سنگین تر ہو جائے گی۔ قریب سے ایک ہنڈ گاڑی گزر رہی تھی، اہل اس کے آگے کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کے پیچھے چرچاے اور دھڑکن گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ماڈرن لڑکی نے انھیں نکال کر اہل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا فیصلہ ادا کر رہی تھی، اہل نے پھرتی سے عقبی دروازہ کھولا اور گاڑی میں صدمہ کیا۔ اہل کے اثرات اور اس کے ہاتھ میں ہتھول دیکھ کر لڑکی کی منہ گم ہو گئی۔ اہل نے بلا توقف ہتھول اس کی طرف سیدھا کر لیا۔ ”خبردار۔ میں مہم رانی! گاڑی آگے بڑھاؤ۔“ گولی تھماری گوری گوری گردن میں گھس جائے گی اور سانسے کھینچے ہیں جب گولی اندر گھسنا ہے تو بہت تکلیف ہوتا ہے۔“

لڑکی کا چہرہ چند سیکنڈ میں ہلدی ہو گیا۔ اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیکن وہ دُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ دو تین سڑکیں کراس کرنے کے بعد ہی اہل کو اندازہ ہو گیا کہ وہ گاڑی کہیں ٹھوک دے گی۔ وہ جلد از جلد ملکی بنگری کی گنجی سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نے لڑکی کو حکم دیا کہ وہ گاڑی ایک طرف سڑک کے کنارے روک دے۔ لڑکی نے شہنی انداز میں مل کی اور گاڑی روک دی۔ وہ دھڑکنے والی سی تھی اور اہل کو پیشکش کی تھی کہ اس کے پرس میں جتنے روپے ہیں وہ رکھ لے۔ گاڑی بھی رکھ لے اور اسے جانے دے۔“

اہل نے کہا۔ ”اس بات پر ام بعد میں غور کرے گا۔ ابھی تم اپنا سیٹ چموز کر ساتھ لے کر پڑھاؤ۔“ گاڑی اس خود راہ تیار کر کے گاڑی۔ ”لڑکی کسمائی۔“ چلو، شاپش۔ جلدی۔“ اہل نے ہتھول کو حرکت دی۔

گاڑی کے اندر ہی اندر سیٹ کو تھیل کر نالڑکی کے لئے کافی مشکل ثابت ہوا۔ اس

”دیکھو بھائی! بات یہ ہے کہ تم نے۔۔۔۔۔“

”میں تمہارا بھائی وائی نہیں ہوں۔“ لڑکے نے درشتی سے اہل کی بات کاٹی۔ ”اور زیادہ بحث کرو گے تو جیت بڑھا دوں گا۔“

اہل شہنشاہی تاہم اس نے خود پر قابو رکھا اور بولا۔ ”چلو ایسا کرو ام۔۔۔۔۔“

خود سارا ہزاروں نے ایک بار پھر تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب میں ہزار میں دوں گا۔“

اہل گڑ بڑا کر رہ گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”یاد رہے خواہ وہ جھگڑا پیدا کر رہا ہے۔“

”اب پچاس ہزار سے ایک جیسہ کم نہیں لوں گا۔“ شاہ نواز بھڑکن چلا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”کس بات کا پچاس ہزار؟“ اہل بھی تنک کر بولا۔

”اب ایک لاکھ اور مزید بکواس کر دو گے تو ایک کا دلاکھ ہو جائے گا۔“ شاہ نواز کا لہجہ اہل اور خطرناک تھا۔ اس کے ذہن اور دوست قریب آ کر گنجی سے ملتا ہوا دیکھنے لگے تھے۔

اہل کے اعصاب تن گئے۔ وہ کافی برداشت کر چکا تھا۔ اس کے اندر کا جنگجو پٹھان اپنی تمام خطرناکی سمیت ابھڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ ”ام پوچھتا ہے، تم نے سیدھے ہاتھوں سے کسمرا دینا ہے یا نہیں؟“ وہ گہرا۔

شاہ نواز کا چہرہ انکارے کی طرح ہو گیا۔ اس نے اپنا چشمہ اتار دیا اور خطرناک لہجے میں بولا۔ ”اوسے تو بونٹا کس طرح ہے سوخو کی اولاد۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اہل کو دور سے دھکا دیا۔ اہل لٹکڑا کر ایک دو قدم پیچھے گیا۔ شاہ نواز کے دو ذہن اس پر فوٹ پڑے۔

اہل نے ایک اکھٹا جھٹک کر بچا لیا اور اس کے پیچھے پر لٹا رہا۔ وہ قریبی درخت سے ٹکرایا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو اہل نے بڑی شدت سے گھما کر شاہ نواز پر دے مارا۔ دونوں لٹکڑا رہے ہوئے انٹیشن وین کی سائیڈ سے لگے۔ اس تصادم میں زور دار دھکا ہوا۔ انٹیشن وین میں موجود لڑکیاں چلائی ہوئی وینوں سے ٹھکرائیں اور مین گیٹ کی طرف دوڑ پڑیں۔

اتفا کا کوئی کے دونوں پہرے دار غیر مستحکم تھے۔ ان میں سے ایک تھوڑا سا ڈھلنے اہل کو عقب سے دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ چند سیکنڈ میں ہی شعلہ جلاوا بن گیا تھا۔ اس نے یہ کوشش ناکام بنائی اور سامنے سے حملہ کرنے والے دو لڑکوں پر تیز توڑ کے برسا کر انہیں دن میں تار سے دکھا دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ دھاڑ رہا تھا۔ ”جان سے مار دے گا ام۔“

اچانک بھٹی گاڑی میں سے برآمد ہونے والے تین چار لڑکوں نے گاڑی کے ساتھ مل کر

نے توجہ بھرا کر دیا لیکن یہ معاملہ بعد میں اتنا گرم ہوا کہ لڑکی کی فیملی کو دن میں تارے نظر آئے۔ بہت کی بچی لٹکانی تھی چنانچہ نگران کوگوں کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ لڑکی کو کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ آٹھ دس مہینے کے اندر اندر لٹکانی نے ان دونوں بھائیوں اور ان کے بچوں کو فٹ پاتھ پر لا پھینکا۔ ایک بھائی پر ہسپتال کے فٹ مہین کا الزام لگا اور وہ جیل بھیج دیا۔ دوسرے بھائی کی نوکری چھین گئی اور مکان کی قرقی کے نوٹس الٹو ہو گئے۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ لٹکانی کے بال بچھیننے والی لڑکی کو لٹکانی کے پاؤں میں گر کر معافی مانگنی پڑی۔ لیکن لٹکانی جیسی ضدی عورت سے معافی لینا کون سا آسان کام تھا۔ اس معافی کی ممکنہ شکل یہ سامنے آئی کہ صلح کے نام پر سکول ٹیچر کو لٹکانی کے منہ بولے بیٹے سے شادی کرنا پڑی۔ منہ بولا بیٹا بھی بس نام کا ہی تھا۔ حقیقت میں وہ لٹکانی کا دیہاتی نوکر تھا۔ میں نے ایک بار گورنوالہ میں دیکھا تھا اسے۔ سوٹا سا بھدا سا۔۔۔ قد بھی درمیانہ ہے۔ دو کیا کہتے ہیں حور کے پہلو میں لنگور۔ جس کی لاجھس کی بیچیں۔ طاقت طاقت ہی ہوتی ہے۔ وہ لڑکی ابھی لٹکانی کے منہ بولے بیٹے کے پاس ہے اور لٹکانی کی کوٹھی میں ہی راتی ہے۔ اس عورت کی ضد اور آڑ دیکھو، میں نے سنا ہے وہ اس لڑکی سے اپنی گازی تک دھلاتی ہے، یعنی اسے جاتی ہے کہ جس گازی کو پار کرنے کے لئے تم نے جگہیں دی تھی اب اپنے ہاتھوں سے اسے صاف کر دو۔ ایسے لوگوں کی ضد ایک بیماری کی طرح ہوتی ہے۔"

وہیل خان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آگیا جو اس نے ملکان کی گلی میں دیکھا تھا۔
ایک جو اس سال لڑکی نے ملکان کی گاڑی خود ڈرائیو کر کے گریج میں کمزری کی تھی۔ شاید یہ
وہی سکول بچہ تھی جس کا ذکر عارف کر رہا تھا۔

”تمہارا کیا مشورہ ہے عارف بھائی! اس معاملے کو کیسے حل کیا جائے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ عارف نے الٹا سوال کیا۔

اجمل خان نے گنگے کی رکیں طیش سے الجھ آئیں۔ ”ام کو تو لگتا ہے کہ یہ سچی سیاحی
 انگلیوں سے نہیں لکھے گا۔ اس خبیث لڑکے کا صورت ہماری نگاہوں میں محسوس رہا ہے اور
 ہمارے اندر آگ بھڑکا رہا ہے۔ باقی آپ ام سے زیادہ سمجھ دار ہے اور شافی بین سے بھی
 مشورہ کر لیتا ہے۔“

”ان لوگوں کی گردن میں بڑا سخت سر یا ہے۔“ عارف نے کہا۔ اس کا اشارہ ملائی ٹیم
غیرہ کی طرف تھا۔

”تو تم کہنا چاہتا ہے کہ اموات کو زیادہ نہ بڑھائے؟“ جمل نے ذرا مایوسی سے کہا۔

ہے۔ وہاں گوجرانوالہ میں بھی اس کی ایک بڑی کوشی ہے۔ اس کا ایک بھائی سیاست میں پاؤں رکھتا ہے، ایک بھائی پولیس افسر ہے۔" عارف نے کہا۔

”جو کچھ بھی ہے لیکن اب ام بیچے نہیں ہٹ سکتا ہے عارپ بھائی۔ وہ کیرا تو ام کو واپس لے رہا ہی ہے، چاہے جیسے بھی لیں۔“

عارف کی کشادہ چشماں پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور پوچھ میں ہی چار پانچ قدم اہل کر رہ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ خانگی صاحب بھی اس سلسلے میں کچھ خاص تدبیریں کر رہیں گے۔ خانگی کا بڑا بھائی سینٹر پولیس آفیسر ہے اور خاصا اثر رسوخ والا ہے۔ شاید ایس ایس جی ہی ہے اس سے بھی اوپر ہے۔“

”تم ٹھیک کہتا ہے عارپ بھائی! ویسے بھی ہر معاملے میں حاجی حیات صاحب کو گھیننا ٹھیک نہیں۔ وہ پہلے ہی مارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔“

عارف کے روشن چہرے پر چمک بڑھتی چلائی تھی۔ دو دو لائن میں دو کرسیاں پر بیٹھ گئے۔ عارف نے سگریٹ سلاکتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں یہ بڑے ذہین اور ضدی قسم کے لوگ ہیں۔ خاص طور سے اس ملک کی تہکم کے ضدی پن کے بارے میں تو بہت کچھ تھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا لڑکا بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”ملک کی تہکم کے بارے میں کیا سنا ہے؟“ اسماعیل نے پوچھا۔

”پہلے اور بعد میں صدی اور پچھلے بازار عورت ہے۔ اس کا ایک واقعہ تو گوجرانوالہ میں بڑا مشہور ہوا تھا۔ گوجرانوالہ کی ایک خوب صورت سکول نیچر کی شاہی اس عورت نے زبردستی اپنے اپنے اند کو کر کے روادی تھی۔ یہ پچھلے سال کا ہی واقعہ ہے۔ معمولی سی بات تھی۔ صرف کار با رنگ کرنے پر جھگڑا ہوا تھا۔“

”ام سبھا نہیں۔“ اجمال نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”زلزلی اچھے بھلے شریف خاندان سے تھی۔ ایک بھائی ڈاکٹر تھا، دوسرا انجینئر۔ بڑے سے لوگ تھے۔ بس ابو یں چھٹا ہو گیا۔ مکانی بیٹھا اپنے ڈرائیو کے ساتھ ایک ہوٹل میں آئی۔ اس وقت وہ سکول ٹیچر بھی رہے اپنے بھائی کی گاڑی چلائی ہوئی دو سیٹیوں کے ساتھ وہاں پہنچی۔ وہ خالی جگہ پر اپنی گاڑی کھڑی کرنے لگی تو مکانی کے ڈرائیور نے بھی گاڑی وہاں کھسکادی۔ بس گاڑی کھڑی کرنے پر بات بڑھ گئی۔ زلزلے نے کوئی سخت بات کہی تو مکانی نے تھوڑے بڑے زلزلے کو بچا تھا کہ یہ کون ہلائے۔ اس نے اسے ہالوں سے بکڑایا۔ لوگوں

”نہیں..... میں کہتا چاہتا ہوں کہ آکڑی ہوئی گردن کو جھکانے اور تونے کا اپنا ہی حزمہ ہوتا ہے۔“ عارف کی آواز میں باد بادل جوش تھا۔

اصل خان کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ گئی۔ ”تم نے اندر سے دل کا بات کیا ہے عارف بھائی۔ اگر ان آکڑی ہوئی گردنوں کو جھکانے کا بات ہے تو پھر ام کو آگے کرو۔ اندر سے پہلے ہی ٹھیک ٹھاک قانون لکھنی ہو چکا ہے۔ اب پھانسی سے زیادہ سزا ام کو کیا ہو سکتا ہے۔ ام ان گردنوں کا ایک دم بہترین علاج کرو دے گا۔“

”نہیں..... یہ پھل انا آسان نہیں ہوگا، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ملک کی تنظیم کی کوئی میں زیادہ نہیں تو سات آٹھ مسلح بندے ضرور ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑائی کا خطرہ دیکھ کر اس نے مزید جیسے بلا لیے ہوں۔ ایسے لوگ آسانی سے ہار کہاں مانتے ہیں۔“

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

”اگر واقعی ان لوگوں سے ٹکر لینی ہے تو پھر کم از کم ایک درجن بندے ہمارے ساتھ بھی ہونے چاہئیں۔ دو تین بندے آگے لے کر ان سے بات کریں، باقی بالکل تیار حالت میں پیچھے رہیں۔ اگر کام خراب ہو تو نظر آئے تو پھر مرو بائل پران کو کال دے دی جائے۔“

”جیسے تمہارا مرضی۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے۔ وہ لڑکا اور اس کے ساتھی وغیرہ کہاں ہوں گے؟“

”وہ سب حرامی ٹینک پر جا رہا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کوٹھی پر ہونے والے پھنڈے کے بعد پروگرام کینسل ہو گیا اور امارا خیال ہے کہ ضرور کینسل ہو گیا ہوگا۔ میرے ہاتھ سے دو تین چھو کروں کو ٹھیک ٹھاک چس چس بھی لگا ہے۔“

عارف نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ ”اگر یہ کام کرنا ہے تو پھر اس میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ گیسرا بھی تو لڑکے کے گھر میں ہوگا پھر ہو سکتا ہے کہ کہیں اور چلا جائے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اگر اس کی پھوٹن دیوی کا فیصلہ مل جائے تو پہلے اس سے خون پر بات کی جائے۔“

”کوئی۔“ شانی بہن بھی آسمیا۔ ”اصل میں اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شانی کے ساتھ مٹا بھی چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنے بال ٹوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہوئی لان میں ان دونوں کے پاس آ بیٹھی۔ ”کیا بات ہے؟ تم دونوں بڑے جوش نظر آ رہے ہو۔“ شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”کبیر سے کچھ پتا چلا؟“

جواب میں اصل اور عارف نے سب کچھ شانی کے گوش گزار کر دیا۔

شانی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر نا پسندیدگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ اصل سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میری بات کا نہ ماننا اصل، میرا خیال ہے کہ تمہاری جلد بازی سے کام خراب ہوا ہے۔ یہ کوئی ایسا اچھا ہوا مسئلہ نہیں تھا لیکن اچھا کیا ہے۔ اب تم دونوں اسے مزید بگاڑنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بات سوچنے کی ہے عارف! آخر ہم ہر مسئلہ کا حل طاقت کے استعمال میں ہی کیوں دھمکتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد پہلے ہی خون خرابہ ہو رہا ہے۔ اب تم اس ملک کی تنظیم سے ٹکر لینے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ میرے خیال میں تو یہ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے بلکہ بچکانہ سی ضد ہے۔ اس معاملے کو آسانی سے بات چیت کے ذریعے حل ہو جانا چاہیے۔“

”آپ کا بات ٹھیک ہے شانی بہن! لیکن کچھ لوگ لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں، وہ باتوں سے کسی صورت نہیں مانتے۔“

”اب اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ لاتوں کے بھوت کون ہے اور باتوں کا کون؟“ شانی کا لہجہ خشک تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، عارف نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا خیال ہے کہ ملک کی تنظیم سے بات کرنی چاہیے۔ ہم بھی اس سے ”بات“ کرنے کا پروگرام ہی بنا رہے ہیں لیکن احتیاط کے طور پر۔“

”احتیاط کے طور پر تم اپنے ساتھ دو درجن گمن مین لے جاؤ گے؟“ شانی نے بات کاٹی۔ ”جب لڑائی کی اتنی تیاری کر لی گئی ہو تو مسلح صفائی کے ساتھ بات چیت کا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“ شانی کا لہجہ تند و تیز تھا۔ چند لمبے خاموشی رہی پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم ملک کی تنظیم کے ساتھ بات کرنا چاہتے ہو تو پھر یہ بات میں خود کروں گی۔“

عارف نے قہر سے شانی کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ ”وہ بہت اپنی عورت ہے شانی۔“ خواہ مخواہ بندے کو بے عزت کر دیتی ہے۔“

”جب تک کسی شخص سے خود مل نہ لیا جائے اور اس سے بات چیت نہ کر لی جائے اس کے اچھے بُرے ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے زیادہ مسئلے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم کسی شخص سے ملے بغیر اس کے بارے میں بُری رائے بناتے ہیں۔ یہ رائے سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے یا ویسے ہی ہمارے اندر کا ڈر ہمارے ذہن میں غلطی پیدا کر دیتا ہے۔ بعد میں کسی چھوٹی سی بات کی وجہ سے یہ غلطی ایک دم بہت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے بے شمار دفعہ دیکھا ہے کہ ایک دوسرے سے ڈرتے رہنے والے اور ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے والے دو

بندے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور کچھ وقت اکٹھے گزارتے ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ ان کے درمیان تو کسی طرح کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

”لیکن ہر جگہ تو ایسا نہیں ہوتا نا..... بلکہ بہت جگہ ایسا نہیں رہتا۔ آخر اس دنیا میں قدرت اللہ تبارک و تعالیٰ کا حسم اور لڑائی ریاض جیسے لوگ موجود ہیں جب ہی خون خرابا ہوتا ہے۔“

”میں اس بات سے انکار نہیں کر رہی عارف..... یہ کہہ رہی ہوں کہ ہمیں کسی کو جانے
غیر ہر شخص کو قدرت اللہ یاؤ بیڑی یا بیڑی نہیں بھی لینا چاہیے اور اگر کوئی قدرت اللہ یاؤ بیڑی یا بیڑی
میں بھی تو آخر تک کوشش کرنا چاہیے کہ ہم اس کو چوہدری بابہ اور سجاد حشام اور راجو کی طرح
لے لے کر میں کامیاب ہو جائیں۔“

”اور اگر کوئی راستہ نہ رہے تو..... یا ویسے ہی اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو جائے؟“ عارف نے کہا۔

”تو پھر دوسرا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی حقائق کا انحصار دھندلا استعمال نہیں ہوتا چاہیے۔ نئی دلی میں نفرت اور انتقام کا جذبہ ہو... بلکہ یہ سوچ ہو کہ ہم نے بڑے کو نہیں مارا، برائی کا ثمار ہے اور ہماری لڑائی برائی ہے۔“

”یعنی آپ کا خیال ہے شانی بہن کہ آپ اس فیڑھی گرون والے لڑکے اور اس کی میٹ ماں کو بات چیت سے راضی کر لے گا؟“ اُجھل نے کہا۔

مٹانی نے اسے گھورا۔ ”اے اہل! تمہارا نانا ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر معاملے بگڑتے ہیں۔“ اہل نے ذرا شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ مٹانی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”جہاں شمش کی ضرورت ہوگی وہاں میں تمہارے جوش کی قدر کروں گی اہل لیکن جہاں جوش کی ضرورت ہو وہاں جوش ہی اچھا لگتا ہے۔“

عارف نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا: ”تو آپ وہاں اکیلی جا کر بات کرنا چاہتی ہیں؟“ جب سے شانیٰ رستم کی بیوی بنی تھی، عارف نے اسے زیادہ عزت کے ساتھ ”پاپا“ کہنا شروع کر دیا تھا۔

عارف کی آنکھوں میں ناراضا مندی دیکھ کر شانی نے کہا: "اگر تم مجھے ہو کر احتیاجاً چاہتے ہو تو میں جہاں ضروری ہے تو میں جہیں منع نہیں کروں گی لیکن یہ بندے یہ جذباتی اور شیلے نہ ہوں۔ وہ موقع سے دور رہیں اور کچھ مجھ کو سو میری اجازت کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں۔"

”اور یہی ہدایت ہمارے لئے بھی ہے؟“ عارف نے کہا۔

”بالکل۔ یہ اتنا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے پنڈل کر لوں گی۔“

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اس وسیع و عریض کونشی کے گیٹ پر موجود کچی جسے کھائی بیگم کی کونشی کہا جاتا تھا۔ شانی اہل کو اپنے ساتھ نہیں لاتی تھی۔ ہاں عارف کہہ دو اس کے ہمراہ تھا۔ عارف کہہ دو کہ قریباً چھ سو سالہ کونشی کے تھوڑے سے عیاض طے پر رک گئے تھے۔ وہ ایک اسٹیشن دین میں سوار تھے۔ عارف سے ان کا سوا پائل کے ذریعے رابطہ تھا۔ شانی اور عارف میں طے ہوا تھا کہ بدترین صورت حال میں ان ان لوگوں کو کال کیا جائے گا۔

گیت کے ارد گرد شانی کو تھکاؤ کی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ گیت اس ہنگامے کی طرف اشارہ کرتی تھی جو جوہری دہریے پہلے اہل خانہ اور مکانی کے لوگوں میں ہوا تھا۔ ایک سبب گیت کے پاس موجود تھی۔ اس میں دو تین خطرناک صورتوں والے افراد بیٹھے تھے۔ گیت پر گارڈز بھی بالکل پکڑے تھے۔ جوہی شانی اور عارف کی سوزو کی کار گیت پر پہنچی دو افراد تیزی سے باہر آئے۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ ایک گارڈ نے انھیں درشت لہجے میں درپافت کیا۔

عارف نے اپنا تہاف نگہرا احمد کے نام سے کر پایا اور بتایا کہ وہ مکلفی جی سے بات کرتا ہے۔ مگر ڈرنے کا کافی چھان چھگ کی اور آخر مکلفی سے فون پر رابطہ کرنے کے بعد ان دونوں کو مکلفی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچایا۔ چند منٹ بعد اونچی لمبی مکلفی گولے کی طرح ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ شولہرقیس میں ہونے کے باوجود دوپٹے سے نماز تھی۔ ایک حقیقی شال اس کے دائیں کندھے پر بڑی تھی۔

اس نے شانی اور عارف کو سرتاپا گھورا اور انہیں ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے بولی۔
 ”گھارو نے بتایا ہے کہ تم کچھ دیر پہلے ہونے والے مجلے کے بارے میں بات کرنا
 جانتے ہو؟“

”جی، ایسا ہی ہے۔“ شانی نے کہا۔

”پہلے یہ بتاؤ وہ پیمانہ کیا تھا؟“ ملائی کا لہجہ کچھ مزید درشت ہو گیا۔
 ”وہ ہمارا ساتھی ہے۔ ذرا سادہ جاتی ہے۔ ہم اسی کی قلعی پر معذرت کرنے کے لئے آئے ہیں۔“ شانی نے کہا۔

”میں یوچ جھتی ہوں، وہ ہے کہاں؟“ ملکائی دہاڑی۔

”میں اسے اسی لئے اپنے ساتھ نہیں لائی۔ اسے دیکھ کر آپ کو مزید غصہ آتا۔ اس کی طرف سے ہم دونوں آپ سے معافی مانگنے کے لئے یہاں موجود ہیں۔“

”میں نہیں دیتی کسی کتے لمے کو معافی..... میں سزا دوں گی۔ میں اس حرامی کی چڑی

بار پھر آپ سے معذرت کرتی ہوں۔ اپنے ساتھی کی طرف سے بھی میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔

مکائی نے نوٹ لے کر اپنے بیٹے شاہ نواز کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے گردن اگڑا کر فخریہ انداز میں شانی کی طرف دیکھا اور ماں کے سامنے ہی سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

”کیمرہ کہاں ہے شاہ نواز؟“ مکائی نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے راک کے پاس بھیج دیا تھا۔“ وہ بے پروائی سے ہلکا۔

”تو منگوا لو۔“ مکائی نے کہا۔

شاہ نواز نے پتلون کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اس پر رابطہ کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

عارف دوسرے پر بیٹھا تھا۔ اس نے اشارے سے اشارے میں شانی سے کہا۔ ”یہ سب ڈرامہ لگتا ہے۔ لڑکا کیمرہ نہیں لوٹا ہے گا۔“

شانی کے اپنے دل میں بھی شبہ موجود تھا کہ کہیں شاہ نواز کی طرف سے مزید بلیک میسج شروع نہ ہو جائے لیکن مکائی کی خصلت میں اسے زبان کی تصویر بہت پاسداری نظر آتی تھی۔

شاہ نواز کے جانے کے بعد مکائی نے پہلی بار شانی کو جینے سے لے کر کہا۔ شانی شکر یہ ادا کر کے موٹے پر جینے لگی۔ اپنی بات منوانے کے بعد مکائی کے چہرے پر اب قدرے نرمی آ رہی تھی۔ وہ شانی سے بات چیت کرنے لگی۔ اس نے شانی سے تصویروں کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ شانی نے اسے بتایا کہ ان تصویروں کا تعلق تو یہ کنڈے کرنے والے ایک جھوٹے بھروسے سے ہے۔ اس بھروسے کے خلاف اخبار میں خبر لگانے کے لئے یہ تصویریں ضروری ہیں۔

شانی کا خیال تھا کہ شاید مکائی بھر قدرت اللہ کے حوالے سے کچھ جانتی ہوگی یا شاید اخبار میں چھپنے والی خبروں پر اس کی نظر پڑی ہوگی لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مکائی عموماً انداز میں بات کرتی رہی۔ ذاتی طور پر وہ بھی بھروسے کے خلاف تھی اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے عاملوں کو برا سمجھتی تھی۔ اس نے شانی کو ایک دو ایسے واقعات بھی سنائے جن کا تعلق عاملوں کی شیعہ بازی سے تھا۔ عارف بدستور دروازے کے پاس موٹے پر تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی صرف ایک مختصر کال پر مکائی کی گونجی میں تھمک خیز ہچکامہ شروع ہو گیا تھا۔ اس ہچکامے کو شانی کی فراست نے روکا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس شخص کا شبہ

تجربہ لگے گا۔

اور پھر یہی ہوا۔ شاہ نواز کیمرہ لے آیا۔ اس نے کیمرہ دور ہی سے بے پروائی کے ساتھ سونے پر اچھال دیا۔ مکائی نے اٹھا کر کیمرہ شانی کو تھما دیا۔

”شکر ہے۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔“ شانی نے کہا۔

”نہیں تم کھانے کے وقت پر آئے ہو۔ ہم لوگ کھانے کے وقت کسی کو اپنے ڈرائنگ روم سے کھانا کھانے بغیر نہیں جانے دیتے۔“ مکائی جھج رہی تھی۔

شانی دل ہی دل میں مسکرائی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہ میزبانی عورت مرنے مارنے پر آمادہ تھی۔ شانی نے کھانے سے انکار کیا لیکن مکائی کا تھکانا اصرار دیکھ کر چپ رہی۔

تھوڑی سی دیر بعد شانی اور عارف مکائی کے ساتھ کھانے کی میز پر تھے اور پُر کلف گچ کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں شانی کو مکائی کی منہ بولے بیٹے کی بیوی بھی نظر آئی۔

وہ خوش شکل لڑکی تھی جو ہم اس کے بھروسے سے مظہریت لپک رہی تھی۔ اس مظلومیت کی وجہ بھی شانی کو جلد ہی نظر آ گئی۔ یہ اس کا خاندان تھا۔ عارف نے شانی کو بتایا تھا کہ یہ مکائی کا منہ

ہوا بیٹا ہے۔ تاہم وہ جس طرح مکائی کے اور گرد مگھوم رہا تھا اس سے وہ منہ بولا بیٹا کم اور چیتا

نہ کر زیادہ معلوم ہوا تھا۔ اس کی شکل و شاپہت بھی ملازم پیشہ افراد کی طرح تھی۔ قدر درمیانہ

بل اور رسیانے سے بھی کم تھا۔ مشکل سے اپنی خوب رو بیوی کے برابر ہوگا۔ رنگ پتلا اور نقوش

معدے سے تھے۔ سہر حال کچھ بھی تھا۔ وہ لڑکی کا منہ شہر تھا۔ شانی اور عارف کے سامنے ہی اس نے کسی بات پر لڑکی کو ٹہری طرح جھجکا اور وہ کان لپیٹ کر اندر چل گئی۔ شانی نے سوچا

ایک ڈراما کی بات سے بگڑ جانے والا معاملہ بالآخر کہاں تک پہنچا ہے۔

کھانے کے بعد مکائی کے باوردی ملازم نے چائے پیش کی۔ مکائی بھی اب نرم لہجے

میں بات کر رہی تھی۔ چائے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لئے تیار ہوئے تو مکائی اندر

آئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لاکھ روپے کے کئی نوٹ تھے۔ نوٹ اس

نہایت جلدی شانی کو تھما دیئے۔

”یہ کیا ہے بی؟“ شانی نے حیرت سے کہا۔

”تمہارے روپے۔“ وہ میرے بیٹے کی ضدھی جو تم نے پوری کر دی۔ یہ میرا اخلاقی

دوسرے ہے۔ تم لوگ مجھے اچھے لگے ہو۔ میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا غلطی کی وجہ سے ہوا۔

میرا نام تم لوگوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ اس کے لئے میں بھی شرمندہ ہوں۔“

”نہیں مکائی جی! ایسی بات نہ کریں۔ غلطی تو میرے بھائی کی تھی۔ اس نے چھوٹی سی

بات پر آپ کے بچوں سے مار پیٹ کی۔ وہ بڑا احساس کی دسے داری زیادہ تھی۔ مجھے دلی طور پر اس کے رویے کا بڑا افسوس ہوا ہے۔“

”میں جانتی ہوں، میرا شاہ نواز بھی چھوٹی سی بات پر ہلچل جاتا ہے۔ اس کا ایک دوست کمال ہے۔ اسی نے اسے زیادہ زہری بنا دیا ہے۔ میں اسے درست کروں گی۔“

”کچھ بھی ہے ملکائی جی۔ لیکن یہ روپے۔“

”بس! بس! آپ چپ ہو جاؤ۔“ ملکائی نے محبت آمیز ہنسنے سے اسے ڈانٹا۔ ”یہ تمہارے روپے ہیں تمہارے پاس رہیں گے۔ تم خود اخبار دہلی یا پھر بھی اس شہر میں کسی طرح کا کوئی کام آڑے تو بیٹھے جاؤ۔ تمہاری مدد کر کے مجھے خوش ہو گی۔“

”آپ کا بہت شکر ہے۔“ شانی نے کہا۔

عارف حیرت سے اس نہایت کرخت عورت کی کیا پلٹ کو کچھ رہا تھا۔ وہ انہیں باہر تک چھوڑنے آئی۔ اس دوران میں اتفاقاً شانی کی نگاہ ملکائی کی کوشی کی چھت پر پڑی۔ شانی کو اعزاز ہوا کہ کوشی کی چھت پر بھی کئی مسلح افراد موجود تھے۔ یعنی اگر یہاں لڑائی ہوتی تو کافی سنگین ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ اس لڑائی میں کامیاب ہونے کے باوجود بھی عارف اور اہمل وغیرہ کبیرے تک نہ پہنچ سکتے۔ کیونکہ بقول شاہ نواز کبیر یہاں موجود بھی نہیں تھا۔

حالی حیات کی رہائش گاہ پر واپس پہنچنے پر شانی نے سب سے پہلے اہمل خان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ملکائی بیٹم سے بات چیت کے دوران میں وہ دیگر مسلح افراد کے ساتھ کوشی سے باہر موجود رہا تھا۔ اہمل خان اس صورت حال پر جہاں حیرت زدہ تھا وہاں خوش بھی تھا۔ اہمل خان نے فوری طور پر ہسپتال میں کبیرے کے اصلی مالک یعنی لگی خان سے رابطہ کیا۔ لگی خان کی حالت اب بہتر تھی۔ اہمل نے اسے فون پر ہی خوشخبری سنائی کہ کبیر اور تصویر پر لگی ہیں۔ لگی خان نے کہا کہ کبیر اور اخبار کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ اس نے اپنے اس ہم کار کا نام بھی بتایا جس کے حوالے کبیر کیا جاتا تھا۔

اگلے روز کے اخباروں میں قدرت اللہ کی بیویوں کی تہلکہ خیز تصویریں موجود تھیں۔ ان میں سے دو تین تصویریں تو آتی واضح تھیں کہ ان سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ فلیش لائٹ نے نہ صرف چہروں کے خدو خال نمایاں کئے تھے بلکہ چہروں اور جسم کے عارضے کو بھی آشکار کیا تھا۔ جلدی بیماری کے آثار جسم کی جلد پر واضح تھے۔ ان میں ایک تصویر دیکھنا مشتاق کی بھی تھی۔ قدرت اللہ کا چہلا چال اب نیز فوٹو گرافر سے بچنے کے لئے لگی خان کو کھونٹا رسید کر رہا تھا۔

ان تصویروں کے ساتھ نیوز رپورٹر لگی خان کے زخمی ہونے کی خبر بھی دوبارہ نخصی کی گئی تھی اور تصویروں کے زوردار ٹکیشن لگائے تھے۔

ان تصویروں نے حیرت قدرت اللہ کی بنیادیں ہلکا کر رکھ دیں۔ اس کی طرف سے جوابی طور پر کوئی بیان جاری نہیں ہوا۔ شاید اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اور اس کے نہایت سخت سانسلے میں تھے۔ شانی اور عارف وغیرہ کے لئے بھی اہمل خان کے ہاتھوں پہ چری میچر کی سنسنی خیز موت کے بعد یہ دوسری بڑی خبر تھی۔

اگلے روز کے اخباروں میں پھر قدرت اللہ کے خلاف خبروں کی بھرمار تھی۔ قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے اڈے کی کوششوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں استانے یعنی آستانے کا کہا جاتا تھا۔ مختلف شہروں میں کم از کم چار استانوں کے سامنے شدید ہنگامے ہوئے اور وہاں توڑ پھوڑ مچائی گئی۔ ان میں سے ایک استانے کو آگ بھی لگادی گئی۔ وہ لوگ جو قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کی شہیدہ بازیوں کا شکار ہوئے تھے احتجاج ریکارڈ کرا رہے تھے۔ ایسے ہی کسی دل جلے نے بے رحمی حیوانت کا ایک کے تحت قدرت اللہ پر کیس کرنے کا اعلان کیا۔ تیسرے روز کے اخبارات میں حیرت قدرت اللہ سے منسوب ایک چھوٹا سا بیان شائع ہوا جس میں اس نے ان تصویروں کو جعلی قرار دیا۔ یہ آواز اور یہ دلیل بڑی کمزور تھی۔ درحقیقت قدرت اللہ اور اس کی شہیدہ بازی کو ناقابل طاقی نقصان پہنچ چکا تھا اور ہرگز کرنے والے دن کے ساتھ مزید نقصان ہو رہا تھا۔ قدرت اللہ کو بے حد کاری ضرب لگی تھی اور اس کا روناے کے اصل ہیرو اہمل خان، عارف اور لگی خان تھے۔

جس روز رنگ والی کے قریب جہر آباد سے قدرت اللہ کا خاص پیلا شامی خاموشی کے ماتھے اپنا ہسٹریوڈیا سیٹ کر عائب ہوا، اس روز جو ہر آباد کی 80 فیصد آبادی نے باقاعدہ جشن منایا اور جو ہر آباد کے ہسپتال کی عمارت پر چڑھاواں کیا کیا۔ راولپنڈی میں شانی، اہمل خان اور عارف کبیر کے لئے بھی جشن کا وقت تھا۔ اس روز اہمل خان نے شانی سے باقاعدہ اجازت لے کر مسالے دار نسوار کے دو بڑے چنگے میں سر رکھے اور ایک کف کیر (چنگے) کو تلواریں جاکر ننگے قفس میں چھپا دیا۔ شانی کے لئے بھی یہ خوش کا وقت تھا۔ وہ غابری طور پر خوش نظر آئی لیکن دل کی گہرائی میں تو خوشی کے لئے کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھی۔ وہاں صرف کسی کا انتظار تھا۔ کسی کا مشتق تھا۔ کسی کا ٹھکانا تھا۔ وہ مرہا چھٹی اور یہ آٹھ کی کی راہ پر تھی۔ وہ قیمتی دبی اور بس دیکھتی رہی۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ وہ سرکنا رہا۔ سورج ڈوبتا رہا اور پھر اترتا رہا۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ دن بھٹوں میں

اور ہٹے میمنوں میں بدلے گئے۔ وہ نہیں ملا۔ وہ نہیں آیا۔ وہ نہیں آیا۔ وہ پہاڑ جیسے حوصلے والی، وہ چٹان جیسے ہیرے برداری، اندری اندر موم کی طرح چلتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ نوہر دہبر کے دن تھے اور چاکر کی سر دہی تھی۔ یہ دوپہر پہاڑوں میں گھر ہوا ایک برف زار تھا۔ جہاں تک انسانی نگاہ جاتی تھی۔ سفید برف لٹکی چادر نے تھیب و فرزا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ زین پر اس سفید برف اور اس نیلے آسمان کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن نہیں۔ یہاں لوگ موجود تھے اور ایک وسیع رنج پر پھیلی ہوئی آباد تھی۔ اس وسیع و عریض ہستی کے کینوں نے کھال اور ان کے بھاری بھر کم لباس پہن رکھے تھے۔ ان میں سے بیشتر مردوں کے چہرے صاف تھے اور خود زور و اڑھیاں جھاڑ جھاڑ کی طرح ان کے کرخت چہروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بڑے دائرے کی شکل میں جمع تھے۔ کچھ لوگ ایک کھوکھوہ دبانے سے نکل نکل کر دائرے میں شامل ہو رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلپاڑیاں تھیں۔

دائرے کے درمیان کوہے کا ایک بڑا چوکور بچہ تھا۔ اس بچہ کے کی لمبائی چوڑائی ایک بڑے کمرے جتنی تھی۔ بچہ کے پیٹ میں ایک گول سوراخ تھا جس میں سے ایک موٹی ری نیچے لٹک رہی تھی۔ بچہ کے اندر کا منظر مستی خیز تھا۔ یہاں ایک نیم سفید رینچہ اور ایک نونہل شخص تیراڑا تھا۔ رینچہ کی طرح نونہل شخص بھی خالی ہاتھ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رینچہ کو بچاڑنے کی کوشش میں ہے۔ تاہم بچہ سے ہونے والی طرح کا پلہ واضح طور پر بھاری دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ایک ہتھ پڑے نونہل شخص کو اچھال کر بچہ کے ڈنگ آلود ڈنگے سے دے مارا۔ اس شخص نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ پوری طرح اٹھا نہیں تھا کہ تفصیل رینچہ اس کے سر پر پھینک گیا۔ اس مرتبہ رینچہ نے عقب سے اپنے ہاتھ مقابل پر وار کیا اور پھوٹے کے لباس کے ساتھ ساتھ اس کی کھال بھی کمر سے اوپر کر دکھادی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور پھر گریں گریں پلٹ کر ایک لات رینچہ کی تھوچی پر رسید کی۔ یہ بھاری بھر کم بوٹ کی ضرب تھی مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ زور آور جانور کو متاثر کر سکتی۔ وہ پھٹکارا ہوا اپنے ہاتھ مقابل پر آیا اور اسے چھاپ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے تیز خنوں اور دانتوں سے اسے اوپر ڈالتا، بچہ کے کا ایک سانپ کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ دو دراصل دروازہ تیزی سے اندر آئے۔ انہوں نے ایک ساتھ دو دو ہوائی فائر کئے۔ رینچہ نے دھک کر اپنے ہاتھ مقابل کو چھوڑ دیا اور ایک کونے میں صحت گیا جیسے وہ ایک باکسر ہو اور اپنے ہاتھ مقابل کو زمین بوس کرنے کے بعد دھڑکی کے

انداز سے پراسپےکٹ سٹول پر جا بیٹھا ہو۔ یقیناً یہ حریت یافتہ جانور تھا۔ رینچہ کی کامیابی پر کچھ لوگوں نے پُر جوش نعرے لگائے تاہم زیادہ تر نے مایوسی کا اظہار کیا۔ دو افراد زخمی شخص کو سہارا دے کر بچہ کے سے باہر لے گئے۔

چند من بعد ایک اور ہاتھ مقابل رینچہ کے سامنے آ گیا۔ یہ بھی موٹے چرمی لباس میں پہن ایک مقامی شخص تھا۔ وہ سر سے ٹھیک اور داڑھی بھری بھری تھی۔ نوروں کی گونج میں ایک بار پھر انسان اور جانور کا مقابلہ شروع ہوا۔ کچھ شخص نے شروع میں رینچہ کے منہ پر چند دروازہ کھولنے مارے اور اسے چاروں شانے چٹ کرنے کی کوشش کی لیکن جلدی رینچہ ایک بار بھر حاوی ہو گیا۔ کچھ شخص بڑی جلدی ہانپ گیا۔ وہ کچھ دیر بچہ کے اندر ہی ادھر ادھر ماک کر خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے ہپ لے کر محبت سے جھولتے ہوئے سے کو پکڑ لیا۔ باہر کھڑے افراد نے پھرتی کے ساتھ ایک چرتی کے ذریعے رے کو اوپر کھینچ لیا۔ یوں یہ شخص رینچہ کی مشتعل لپیٹ سے نکل آیا اور بچہ کے کی محبت پر ہنسی کر باہر کر دیا۔

اس کے چند من بعد ایک اور مقامی نوجوان کو تقریباً ایسے ہی مراحل سے گزرنا پڑا۔ بچہ کو زور کرنے کی کوشش میں اس کی ٹانگ پر ایک دروازہ بھی آئے۔ مگر اس سے پہلے کہ بچہ اسے تکلیف پہنچا کر وہ رے سے لٹک گیا اور رساوا پر کھینچ لیا گیا۔ رینچہ کی سستی جتنی جاری تھی۔ وہ دانت نکھڑ رہا تھا اور منہ سے فحش آوازیں نکال رہا تھا۔ غائب اسے بھوکا لگا رہا تھا۔ پھر ایک اور شخص بچہ کے میں داخل ہوا۔ اس کے داخل ہوتے ہی انجم نے جوش نعرے لگائے اور وہاں اسے اسلحہ لہرا کر اپنے جہات کا اظہار کیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص نہ صرف پہلے بھی ایسے مقابلوں میں حصہ لے چکا ہے بلکہ کامیاب بھی ہو چکا ہے۔ نو وارد کا اعتماد اور اطمینان دیدی تھا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں مشتعل رینچہ کے سامنے آیا اور بازو پھیلا کر گزرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد انسان اور جانور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ نو وارد کی ایک زوردار نگر رینچہ کے سینے پر لگی اور وہ لٹکڑا ہوا تنگ آلود آہنی ڈنگے سے باہر آیا۔ نگر سے پورا ہاتھ جیسے تھرا کر رہ گیا۔ قماشیاں نے اس شخص کی کارکردگی پر نعرہ دیاے شین بلند کئے۔

بچہ کے سے باہر سے ایک شخص چلایا۔ ”شاباش رستم بھائی۔ شاباش۔“
باہر سے چلانے والا شخص ڈاکٹر ناصر اور اندر خونخوار جانور سے برسر پیکار رستم سیال تھا۔ رستم سیال جو پانچ چھ ماہ پہلے تحصیل مری کی پہاڑیوں میں گورے کے ہٹکے کے اندر ایک شے بچہ سے گزرا تھا۔ ایک عجیب پریشان کے ذریعے اس کی کئی ہوئی ٹانگ کو وہ بارہ

سے اس کے جسم کا حصہ بنایا گیا تھا۔ اس تجرباتی آپریشن میں اس کی زندگی کا امکان چالیس فیصد اور موت کا امکان ساٹھ فیصد بتایا جا رہا تھا۔ آج وہی رستم ایک تومنہ شخص تھا۔ نہ صرف تومنہ بلکہ ایک ٹکھن کا سر بھی کر رہا تھا۔ دیکھ کے ایک طرفانی بچے سے بچنے کے لئے وہ تیزی سے پیچھے ہٹا پھر دیکھ کی مہلک قوتوں سے بچنے کے لئے دائیں طرف ہٹا چلا گیا۔ اس کے پاؤں میں بجلی سی لنگڑا ہٹ کے سوا کوئی نقص نظر نہیں آ رہا تھا۔

سفید برفانی ریچھ اپنے پیچھے دو پاؤں پر اڑنا توں کی طرح کھڑا تھا اور لپک لپک کر رستم کو بدبو پھینکے کی کوشش میں تھا۔ رستم نے اپنے دوزنی بوٹ کی ضرب دیکھ کر دووں پچھلی جگہوں کے درمیان لگائی۔ وہ تکلیف سے تھمکا یا اور جھب آواز میں پھنکارا۔ چوتھ کھانے کے بعد ریچھ کی نگاہ چند سینکڑے کے رستم پر سے ہٹ گئی۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھا یا اور بھاگ کر کندھے کی تھیل سے ریچھ کو پیچھے کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پاؤں سے ریچھ کو اڑا لگا تو ہی ابلجی جانور ایک دھماکے سے پشت کے بل گر اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ بچھرے کے باہر سے جو شیفے نرے بلند ہوئے اور قماشائیوں کے رومل سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے اس خوبی تھیل کے قواعد کے مطابق رستم کو قانع قرار دے دیا ہے۔

رستم تیزی سے اٹھا اور سر سے لٹک کر بچھرے سے باہر آ گیا۔ اس کی پوتین شانے پر سے اڑھنی تھی اور ایک ہاتھ پر بھی خوبی خراش آئی تھیں۔ تاہم اس کے سوا وہ بالکل محفوظ رہا تھا۔ وہ نیچے آڑا کھڑا ناصر اور شریف کی طرف بڑھے۔ وہ دونوں بھی مقامی طرز کے بھاری بھر کم لباس میں تھے۔ ان کی داڑھیاں بڑھ چکی تھیں اور کئی ماہ سے جاسٹیں نہیں ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے پاؤں میں آگنی جڑیاں تھیں۔ ان جڑیوں کے سبب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے رستم تک پہنچے اور اس کی پیچھے تھکیں۔ ڈاکٹر ناصر نے رستم کی خراشوں کا معائنہ کیا۔ ”معمولی خراشیں ہیں۔ میرے پاس اسپرٹ ہے میں لگا دوں گا۔“ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

”اس وفد کو کمال کیا گیا آپ نے۔“ دھوت میں ہڑا کر دیا۔“ شریف نے بھی تعریف کی۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اس لڑائی پر شریف وغیرہ بھی لگائی گئی ہیں۔ جو لوگ شریف جیت گئے تھے وہ دوسروں سے غوث وصول کر رہے تھے۔ سامنے دو مقامی طرز کی نشستوں پر دو تومنہ نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ خامی حد تک نظم عمل تھے۔ دونوں کے چہرے گول اور سرخ و پھل

تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی داڑھیاں اور چھوٹی چھوٹی اوپر کو ابھی ہوئی مونچھیں تھیں۔ رستم کی جیت پر وہ بھی خوش نظر آتے تھے۔ تاہم یہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے اپنے کسی پالتو جانور کی جیت پر ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک نے اپنے قریب کھڑے سوزب خادم سے کچھ ٹکڑے پھسکی اور ساتھ ہی رستم کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر ناصر نے رستم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”رستم بھائی! لگتا ہے آپ کے بارھتے میں ہی بات ہو رہی ہے۔“

”ہوسکتا ہے کہ آپ کے کھانے میں پاؤ ڈھڑ پاؤ کبرے کا گوشت بڑھا دیا گیا ہو۔“ شریف نے خیال آرائی کی۔

چند سینکڑے کھسکے پھسکے سننے والے شخص رستم کے قریب آیا۔ اس شخص کا نام واس تھا اور یہ یہاں مترجم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس نے رستم کو رومل میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”رستم! تمہارے دو سپر کے کھانے میں ایک پاؤ گوشت بڑھا دیا گیا ہے۔ رات کو تمہیں ایک پیالہ دو دھنیاں ملا کرے گا۔ ارفا خان اور سامی خان تمہاری پھرتی پر خوش ہوئے ہیں۔“

رستم نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کی سانس ابھی تک پھول ہوئی تھی۔ ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے دیکھی سے ایک جڑی رستم کے پاؤں میں پہنا دی تھی ناصر اور شریف کے پاؤں میں تھی۔ رستم نے جڑی پہننے میں کئی پس دوشیں نہیں کی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس کا مادی ہو چکا ہے اور اس بات کو بھی ابھی طرح سمجھتا ہے کہ یہاں مزاحمت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر موجود لوگ رستم کو جیتیں آجین لگاؤں سے دیکھ رہے ہیں۔ تاہم اس جھین میں عزت و احترام کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ لوگ رستم کو اور مکمل میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کو پس مناش کی چیز سمجھتے ہیں۔ اس مکمل میں تین چار افراد ڈھکی ہوئے تھے۔ خاص طور سے کمر پر پونڈ لگنے والے شخص کا رخ نگین تھا۔ یہ چاروں افراد ایک کشادہ دھو کے اندر ایک اونٹنی گدے پر بڑے تھے اور ان کے قریب دیواری ٹکڑی کی آگ میں رلی تھی۔ ایک مقامی معالج مقامی دواؤں کے ذریعے ان کی مرہم بنی کر رہا تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ لوگ ایک اندرونی طار میں چلے گئے۔ اس اندرونی طار کا پاند ایک رنگ آہستہ آہستہ چنگے کے ذریعے بند کیا گیا تھا اور اس دروازے میں باقاعدہ قفل لگا ہوا تھا۔ ایک اعلیٰ برادر شخص نے قفل کھول کر رستم، ناصر اور شریف کو اندر جانے کا راستہ دیا۔

پس نہایت سرد چمڑے خار کے اندر چلی کے چراغ روشن تھے اور دن میں بھی مکمل آفتاب کا سا لگتا تھا۔ قریب ایک درجن مزید افراد یہاں موجود تھے۔ ان میں بڑا دھڑ کو ہستانی

تھے۔ ایک دو پٹھو باری بھی نظر آتے تھے۔ یہ سب کے سب بھاری بھرکم اہلی اور چری لہاسوں میں تھے۔ ان میں ایک شے مشترک تھی۔ سب نے پاؤں نہایت مضبوط اور وزنی آہنی تیز میں بکڑے ہوئے تھے۔ ان کے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر جینز یوں کے نشان اُن مٹ مبروں کی طرح نقش ہو چکے تھے۔ یہ نشان اس بات کے گواہ تھے کہ یہ آزاد انسان نہیں ہیں۔ اس برف دار میں ان نامعلوم لوگوں کے درمیان ان لوگوں کی حیثیت محض غلاموں کی سی ہے۔

غار میں آنے کے بعد ڈاکٹر ناصر نے ایک چھوٹے چتر کی اوٹ سے ایک لیڈر شولڈر بیگ نکالا۔ اس میں بیگ کی حالت دیکھ کر چند ماہ میں بہت نرمی ہو چکی تھی۔ ناصر نے بیگ میں سے اسپرٹ کی ایک چھوٹی بوتل اور تھوڑی سی روٹی نکالی۔ اس روٹی کی مدد سے اس نے رستم کے دائیں ہاتھ کی تازہ خراشوں پر اسپرٹ لگائی۔ "یہ تھوڑی سی تکلیف تو دیتی ہے لیکن اچھی گراہیم کس ہے" ناصر نے کہا۔

"اور ڈاکٹر یالینا کی یاد بھی دلانی ہے۔" شریف نے کہا۔

یہ شولڈر بیگ اور یہ چند ایک درائیاں دراصل خود برولینڈی ڈاکٹر یالینا سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر یالینا دیگر افراد کے ساتھ ان ٹھوٹی کلبازی برداروں کے جیسے چڑھ کر چلیاں اور اسکرودے آگے اس برف دار میں پہنچی تھی۔

رستم گنگی دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دروازہ ہو گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے لیے بال اس کی پیشانی پر جمول رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی جیسے ایک برف دار تھا۔ ایک خاموش اور سنسان برف دار۔ اس برف دار کی تہ میں کیا ہے، کوئی جگہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کسی سوچ میں غم رہا۔ ڈاکٹر یالینا کی موت کے مناظر اس کی نگاہوں میں تازہ ہونے لگے۔ اسے مری کے نواح میں گورے کے بچلے کے واقعات یاد آئے۔ کلبازی برداروں کا وحشیانہ حملہ، اس حملے میں سفید غلاموں کا قتل عام۔ نیم گول دھار والی کلبازیوں سے متھلوں کا ذبح کیا جانا۔ قاتلوں کے خوفناک لٹکارے اور بھر پور پیش ڈاکٹر یالینا کی خوش قسمتی۔ تین قربان گاہ پر اس کی موت کا ٹھکانا۔ ان خون ریز واقعات کے بعد گورے کے بچلے میں زبردست آشوب ہوئی تھی اور کلبازی برداروں کے گرد وہ انہیں آہنی زنجیروں میں بانڈھ کر وہاں سے نکال لیا تھا۔ نہایت دشوار گزار پہاڑی راستوں پر راتوں کے اندھیروں میں سفر کرتے ہوئے وہ کسے کسے دھک پیچھے اور بھر کیسے اس ویران برف دار تک آئے، یہ ایک لمبی کہانی تھی۔ اب وہ کئی ماہ سے اس لٹق دتق برف دار کے اسیر تھے۔ یہاں دور..... بہت

دور شمال مشرق کی طرف جو سفید چٹانیں نظر آتی تھیں ان کے بارے میں مترجم واس کا کہنا تھا کہ یہ کھنڈراتوں کے ارد گرد کے پہاڑ ہیں۔ یہاں رستم، ناصر اور شریف کی طرح کئی درجن افراد جو بیس تھے۔ ان سب کی حیثیت زرخیز غلاموں کی سی تھی۔ رستم کی معلومات کے مطابق انٹرین ڈاکٹر پوسٹ اور گریس کا خاندان آسٹین بھی ان کوہستانوں کی قید میں تھے۔ ان جنوری لوگوں نے سب سفید غلاموں کو مار ڈالا تھا تاہم آسٹین ابھی تک زندہ تھا۔ اس کی جان بچش کی وجہ ابھی تک رستم اور ناصر وغیرہ کی کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کوہستانی قبیلے کا کرتا جڑتا شونم خان نامی شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سرخ و سپید چروں کے ساتھ جو دو نیم شکل نو جوان رچھہ کی لڑائی دیکھ رہے تھے وہ شونم خان کے بیٹے ارفا خان اور ساسی خان تھے۔ اب تک رستم کو جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کے مطابق یہ پاؤندہ قبیلہ تھا۔ واس نے بتایا کہ پاؤندہ نہایت سخت جان قسم کے پہاڑی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عموماً کھیت کر یا پالتے ہیں، حکم کرتے ہیں اور موسم تبدیل ہونے پر اپنے علاقے سے نقل مکانی بھی کر جاتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے پاؤندہ بھی ہوتے ہیں جو کسی علاقے میں لٹک لٹکا نہ جاتے ہیں۔ یہ گارے، چتر اور کلبازی کے مکانات میں رہتے ہیں۔ بڑے بالوں والے ٹھٹھے پاننا ان کا پسندیدہ مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس برف دار میں رہنے والے لوگ بھی گھنے وقت میں افغان علاقے سے نقل مکانی کر کے یہاں پہنچے تھے اور اب تکیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ کوہستانی قبیلہ فیصلہ مسطر تھا اور ایک خاص قسم کے قدیم درخت کی پوجا کرتا تھا۔ یہ نجانوس پہاڑی درخت رستم نے یہاں کئی جگہ دیکھا تھا۔ اس کی شکل و شباهت بہت حد تک دیوار سے ملتی تھی تاہم یہ دیوار نہیں تھا۔ اس درخت کو مقامی زبان میں آبوک کہا جاتا تھا۔ آبوک نامی اس درخت کے علاوہ یہ لوگ ایک اور چیز کو بھی بے حد عقرد اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آبوک کی طرح اس چیز کی بھی پوجا کی جاتی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اس دوسری چیز کا تعلق بھی نباتات سے تھا اور یہ تھا ناب یا بھادسپ گندل۔ سخت سردی میں جہاں ہر طرح کی حیات ختم ہو جاتی ہے، کچھ نہایت سخت جان جانور اور پودے زندہ رہتے تھے۔ یہ سب گندل بھی غالباً اسی مزاج کا پورا تھا۔ کچھ علاقوں میں لوگ اس کے ایک ایک پتے کو ترستے تھے لیکن رستم نے یہاں اسے کئی جگہوں پر گھاس کی طرح اگتے ہوئے پایا تھا۔

رستم نے ایک طویل سانس لے کر کرودہ دل دی۔ ڈاکٹر یالینا کے خیال سے پیدا ہونے والی اہر اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔ وہ ایک بار بھر یالینا کی موت کے بارے میں

سوچنے لگے۔ اس ہستی کا نام کوہ مارا تھا۔ شوق خان یہاں کے باہر سفید کا مالک تھا۔ اس ہستی کے اصول اور ضابطے سے حد سخت اور عجیب تھے۔ خاص طور سے شوق اور اس کے خاندان نے اپنے اوپر بہت سی پابندیاں لگ رکھی تھیں۔ یہ لوگ ہندوں کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اپنے سر کے بال لازماً منڈوا کر رکھتے تھے۔ ریشمی کپڑا نہیں پہنتے تھے اور فقہ اپنے سے بڑی عمر کی عورت کے ساتھ شادی کرتے تھے۔ یہ آخری شرط کافی دلچسپ اور توجہ طلب تھی۔ شوق کے خاندان کا کوئی مرد بھی نوجوان عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی کے لئے ضروری تھا کہ اس نے اپنی عمر کی کم از کم تیس ہزار برس دیکھی ہوں۔ رحمت نے شوق خان کے نوجوان بیٹوں اور بھتیجیوں وغیرہ کی بیویاں دیکھی تھیں۔ وہ چالیس چالیس برس کی چمکی ماندی خواتین تھیں۔ سخت موسم کے سبب ان کے چہروں پر سولہویں دکھائی دیتی تھیں۔ مونا وہ اپنے چہرے بھاری چادروں کی اوٹ میں چھپائے رکھتی تھیں۔ شوق خاندان کے اکثر مرد و عورتیں عمر میں ہی رخصت ہو جاتے تھے۔ خود شوق کی بیوی بھی قریباً پچیس سال پہلے مرتی تھی۔ رحمت نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ کشی کے لئے عورت سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ نسل کو آگے چلانا بھی ضروری ہے اس لئے بڑی عمر کی بے کشش عورتوں کی شادی کرتے ہیں۔ یہ عجیب کنٹرول نظر تھا۔ جب ڈاکٹر مالینا ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آئی تھی تو اس کے ہمراہ ایک ڈچ نرس بھی تھی۔ شروع میں شوق خان نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ دونوں انگریز عورتیں خاندان کی حیثیت سے اس کے بھائی اور بیٹے کے گھر میں رہیں گی لیکن دو چار دن بعد ہی شوق نے فیصلہ بدل دیا تھا اور دونوں عورتوں کو نکل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ غالباً اس حکم کے چھپے یہی خیال کا دفرہ تھا کہ یہ خوب صورت لڑکیاں یہاں مردوں کے دلوں میں غور پیدا کر دیں گی۔ شوق کے چھوٹے بیٹے کا بھی یہی خیال تھا۔

رحتم کو وہ منظر ابھی یاد تھا جب شوق خان کے حکم پر ڈاکٹر مالینا اور ڈچ نرس کو چانور دیں کی طرح چھینٹ کر کھوہ سے باہر لے جایا گیا تھا۔ ان دونوں کے رنگ برف کی طرح سفید ہو رہے تھے اور خوب صورت ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر مالینا نے رحم طلب نظریے سے چانور طرف دیکھا تھا لیکن رحتم نہیں نہیں تھا اور نہ کیوں نہ دگا رہا تھا۔ رحتم، ناصر اور اسٹالین وغیرہ بیڑیوں میں بکڑے، بے بسی کی حالت میں اپنے زندان کے اندر تھے۔ پھر باہر پر فیصلہ میدان میں اوپر تلے دو فائر ہوئے تھے اور دونوں عورتیں اپنی تمام تر خوبصورتی، ذہانت اور تعلیم سمیت ان کو ہستانوں کے اہلکاروں کی گئی تھیں اور آج بھی ماہ بعد ڈاکٹر مالینا کے شوگر بیک میں سے برآمد ہونے والی اسپرٹ نے رحتم کی خونی خراشوں کو دھوا دیا تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے ہو؟“ صاصر کی آواز نے اسے چونکایا۔

”نہیں..... کچھ بھی نہیں“ رحتم بولا۔

”میں جانتا ہوں..... بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ شانی بھائی کی یاد آ رہی ہے۔“

”نہیں..... اب تو یوں لگتا ہے کہ دل آہستہ آہستہ مردہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں آتا۔“

”لیکن آپ کا چہرہ بتاتا ہے۔ آپ کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ آپ بھائی کو کسی لمبی نہیں بھولتے۔“

”جیسا اس وقت تو میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

”کیا؟“

”کیا بہر بھی اس ٹھنڈے دوزخ سے نکل سکیں گے۔ کیا بھی پھر آباد دنیا کو دیکھ سکیں گے؟“

”امید پر دنیا قائم ہے بھائی اور ہمارے دلوں میں امید باقی ہے۔ ہم ایک دن ضرور اس حصار کو توڑیں گے۔“

”لیکن وہ دن کب آئے گا۔ شاید دس سال بعد۔ شاید بیس سال بعد۔ تم نے دیکھا ہے یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بیس سال سے یہاں بند ہیں۔ وہ سرتوڑ کوشش کے باوجود یہاں سے نکل نہیں سکے۔ مجھے تو یہ گلہ کلا پانی لگتی ہے جہاں بند رہنے والے بس خیالوں میں باہر جاتے ہیں یا پھر مر گئے بعد ان کی رومیں ان کے جسموں سے نکل کر باہر جاتی ہوں گی۔“

”ہر بندے کی قسمت علیحدہ ہوتی ہے بھائی! ضروری نہیں کہ ہمارا مقدر بھی ان لوگوں جیسا ہو جو یہاں سے نکل نہیں سکے۔ تمہیک ہے کہ ہماری دو کوششیں ناکام ہوئی ہیں لیکن یہ ہماری آخری کوششیں نہیں ہیں۔“

”ایسی عجیب و غریب جگہ میں نے پہلے بھی نہیں دیکھی اور نہ کسی سے سنا ہے۔“ رحتم نے کھوہ کے دبانے سے باہر سفید براق برف کو دیکھتے ہوئے کہا اور غصہ کی سانس لی۔

”پتا نہیں رحتم بھائی! آج آپ اپنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

”اچھا ہمارا نہیں کرتا مایوسی کی باتیں۔“ رحتم نے کہا اور روٹ بول لی۔

شریف بڑی محبت سے رحتم کے پاؤں دبانے لگا۔ رحتم نے اسے دو دھنیاں بازو کیا لیکن جب وہ بیٹس ماٹا وہ خاموش ہو گیا۔

ہفتے میں دو بار انہیں طویل کھوہ سے ہاتھ جوڑنے پھرنے کی اجازت دی جاتی تھی لیکن اس اجازت کے دوران بھی ناقابل شکست بیڑیاں ان کے پاؤں میں ہی رہتی تھیں۔ وہ اس برف زار پر کئی کئی فرلانگ تک آزادی سے گھومتے پھرتے رہتے تھے لیکن اچھی طرح جاننے تھے کہ وہ اس حیرت انگیز کشیدہ مقام سے نکل نہیں سکتے۔ اس کے چاروں طرف عمودی کھائیاں تھیں جنہیں پائنے یا چننے میں اتارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس روز بھی ہفتے کا تیسرا دن تھا۔ کھوہ میں محسوس افراد آج خود کو نسبتاً آزاد محسوس کر رہے تھے۔ ہلکی دھوپ لگی ہوئی تھی۔ رستم نگرا کر چلا ہوا برفانی کھوہ سے کافی دور نکل آیا۔ برف میں سے کہیں کہیں چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور پھاڑی درخت دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک ایسے ہی جزیرہ کی درخت سے فلک لگا کر بیٹھ گیا اور اس دور ان نظروں سے جو بک کی طرف دیکھنے لگا۔ جنوب جہاں دنیا آباد تھی، جہاں کن موئے شہر تھے اور جہاں کئی چارو باری میں اس کی شادی بھی تھی۔

اچانک وہ چنگ کیا۔ اسے درختوں میں کوئی شخص متحرک نظر آیا۔ رستم نے اسے پہچان لیا۔ وہ شتم خان کا چھوٹا بیٹا سامی خان تھا۔ رستم نے سامی خان کو اس کی سواری صمدی سے بچا کر لیا۔ یہ وحاری دار صمدی اکثر سامی خان کے جسم پر نظر آتی تھی۔ سامی خان بڑی خاموشی سے مغربی کنارے کی طرف چارہ قاعدہ ستم چمکا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پیٹلے بھی سامی خان کو اس طرح رازداری سے مغربی کنارے کی طرف ہاتھ دیکھا تھا۔ چنانچہ رستم کے دل میں کیا آئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور احتیاط سے سامی خان کے پیچھے چل دیا۔ موسم نے بھی رستم کی مدد کی۔ دھوپ بند رہنا غائب ہو گئی اور قرب و جوار میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اپنی بیڑی کے سبب رستم نے زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا پھر بھی اس نے کوشش کر کے سامی خان کا تعاقب جاری رکھا۔ اسے کوئی اندیشہ نہیں تھا اگر سامی خان اسے دیکھ بھی لیا تو رستم اپنی موجودگی کے لئے کوئی مناسب بہانہ بنا سکتا تھا۔

سامی خان کے انداز میں چونکا پن محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ایک دو بار کمر اپنے عقب میں بھی دیکھا۔ رستم کو سامی کے ہاتھ میں ایک تھپڑا سامی بھی نظر آیا۔ سامی اور ارفا کا فی حد تک ہم شکل تھے اور بڑا دل نظر آتے تھے تاہم وہ بڑا دل نہیں تھے۔ دونوں کی عمریں میں ایک برس کا فرق تھا۔ دونوں اپنے باپ کے بے حد اطاعت گزار تھے اور اس کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے تھے اور یہ کیفیت فقط ان دو بھائیوں ہی کی نہیں تھی، شتم خان کے عزیز و اقارب اور بارگاہی کے بیشتر لیکن شتم کے احکامات پر بلا چون و چرا عمل کرتے تھے۔ ہر کوئی یہاں کے مذہبی عقیدے کے مطابق یہاں کے اصولوں، ضابطوں کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

کوشش کے باوجود رستم اپنا اور سامی خان کا درمیانی فاصلہ برقرار نہیں رکھ سکا۔ دھیرے دھیرے یہ فاصلہ بڑھ گیا۔ بطور ستم نے برف پر قدموں کے نشانات سے تعاقب جاری رکھا۔ جلد ہی رستم نے محسوس کیا کہ سامی خان ایک دھولوان پر آ کر گیا ہے۔

فیض کہاں جا رہا ہے؟

کیا یہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جسے دھروں سے چمپانے کی ضرورت ہے؟

کیا یہ کوئی ایسا کام ہے جس میں شتم خان کی نافرمانی کا پیلوٹا ہے؟

ایسے کئی سوال رستم کے ذہن میں کھلنے لگے۔ تھکے آگے جانے کے بعد رستم نے محسوس کیا کہ سامی خان اچانک کہیں غائب ہو گیا ہے۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رشتوں کے درمیان کوئی ایسا جگہ بھی نظر نہیں آتی تھی جہاں وہ چھپ سکتا۔ رستم نے قدموں کے نشانات پر غور کیا۔ اسے یہ نہایت مدہم نشانات ایک شیبہ میں اترتے دکھائی دیئے۔ رستم بڑی احتیاط سے بے آواز چلا ہوا ان نشانات کے پیچھے آ کر گیا۔ اس نے دیکھا کچھ فاصلے پر ٹھڑی کے بالوں اور خاردار تار کے ذریعے ایک پاڑی بنائی گئی تھی۔ اس پاڑے نے قریب ایک کینچڑ جگہ گھیر رکھی تھی۔ یہاں کئی ہوئی لکڑی کی بھاری بھر کمپلیاں بڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لکڑی طویل عرصے سے یہاں بڑی ہے۔ ان پر کئی جمی ہوئی تھی اور گلیوں کے کچھ حصے برف میں دبے ہوئے تھے۔ قدموں کے نشانات پاڑے کے چھوٹے سے پھانک تک جا کر اوجھل ہو گئے۔

رستم نے تقاریر درختوں کی اوٹ سے دھیان کے ساتھ دیکھا۔ اسے پاڑے کے اندر سامی نام نہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ان تقاریر گلیوں میں ہی کہیں اوجھل ہوا تھا۔ رستم وہیں رک کر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد لکڑی پاڑش شروع ہو گئی۔ سردی میں اضافہ تو ہوا لیکن رستم کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ برف پر قدموں کے نشانات مزید مدہم ہو جائیں گے اور سامی خان کو نظر نہیں آئیں گے۔ اگر وہ ان نشانات کو نہ دیکھ سکتا تو اس شک میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا کہ کئی نے اس کا تعاقب کیا ہے۔

سامی کی واپسی کے لئے رستم کو صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ وہ قریب ایک گھنٹے بعد دوبارہ نظر آیا۔ وہ لکڑی کی گلیوں کے اندر سے ہی کہیں سے برآمد ہوا تھا۔ یوں آبادی سے بچنے کے لئے اس نے اپنے اور ایک برساتی نمابہ اوڑھ رکھا تھا۔ جاتے وقت جوتھیل اس کے ہاتھ میں تھا وہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ خاردار پاڑے سے باہر نکل کر اس نے لکڑی کے پھانک کو باقاعدہ ٹالا لگا یا اور واپس روانہ ہو گیا۔

اس کی دایسی کمر باندھو منٹ بعد رستم درخت کی اوٹ سے نکلا اور پھاٹک تک پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک نر خطر کام کر رہا ہے اور اگر پکڑا گیا تو اس پر ٹھیک ٹھاک مصیبت آئے گی۔ اس کے باوجود وہ اپنے اندر کے جیس کو قابو نہیں پا رہا تھا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی اور کسی ذی فطن کی موجودگی کا اشارہ نہیں ملتا تھا۔ رستم کو قریب سے ایک مڑا تڑا آہنی تار مل گیا۔ اس تار کی مدد سے اس نے کوشش کی اور پھاٹک کا تالا کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ باطل ایک دم گہرے ہو گئے تھے اور دن میں بھی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ رستم بڑی احتیاط سے گیلیوں کے درمیان گھومنے لگا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی خاص چیز یا کوئی راستہ نظر نہیں آیا لیکن کچھ نہ کچھ تو تھا یہاں۔ لنگڑی کے ایک جھاس ساتھ فٹ لمبے بھاری بھر کم سے پاس رستم کو پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ اس نے کون سا جگہ سے بلا تا ایک درجن افراد کے پس کی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن رستم نے تھوڑا سا زور لگایا تو وہ ایک طرف سے اوپر کواٹھا چلا گیا۔ دراصل یہ بھاری بھر کم تانیا چھوٹی گیلی پر لیور کی صورت میں پڑا تھا۔ ذرا سی سہولت ملنے پر وہ اپنے ہی زور سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ رستم نے اس کے نیچے ایک لٹلا لٹکوی لٹکا دی۔ اس سنے کے نیچے برف میں ایک بہت ٹھک راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا۔ ایک آدمی بہ مشکل یہاں سے گزر سکتا تھا۔ یہاں برف ہی کی بڑھیاں لی گئی ہوئی تھیں۔ رستم چند لمبے تک سوچتا رہا پھر مرنے کے آگے بڑھا۔ بیڑی کے ساتھ بیڑی مگنہ سے اترتا اس کے لئے مشکل کام تھا۔ وہ سلائیڈ کر کے نیچے جا سکتا تھا۔ ابھی وہ ایک دوڑنے والی نیچے چھپا تھا کہ اچانک بجلی کی چمک گئی۔ ایک لٹلی تیزی سے اس کے سامنے آئی۔ "کون؟" وہ زور سے بولی۔

وہ مقامی لباس میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی پشت پر تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس نے کوئی اوزار چھپا رکھا ہے۔ رستم نے آنکھیں سکڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ لڑکی کا لباس بے شک مقامی تھا لیکن وہ خود مقامی نہیں تھی۔ رستم اسے پہچانتا تھا۔ وہ ڈاکٹر مالینا تھی۔ وہی نیکر پوش خوبرو ڈاکٹر جو چھوٹی سی عمر میں اسٹنٹن ہو، فیبر تھی اور گورے کے بچکے میں ڈاکٹروں کی مہم کا حصہ تھی۔ رستم کی نگاہ میں وہ سر بھیگی سی اور اسے سرے سے ہونے کا کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ابھی تک ہی رستم نے اس کا شلڈر دیکھا تھا اور اس کے بارے میں وریک سوچا تھا۔ آج رستم اسے زندہ و سلامت اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

غالباً مالینا نے بھی رستم کو پہچان لیا تھا۔ اس کی نینگوں آنکھیں حیرت سے داہو گئیں۔

رستم نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ "مالینا۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں؟" مالینا جیسے ایک دم چنگی۔ اس نے اپنے سر پر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کی دواڑ لگائی اور زور سے ہونے انداز میں دائیں طرف دیکھنے لگی۔

دونوں چند سیکنڈ تک خاموش کھڑے رہے۔ دونوں کے چہرے حیرت کی آماجگاہ تھے۔ مالینا نے اپنے پیچھے چھوٹے دستے کی کھڑائی چھپا رکھی تھی۔ یہ کھڑائی بہت ہونے سے اس نے ایک حجر پر رہی۔ کچھ برہنہ کھن لینے کے بعد مالینا نے رستم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں دیے پاؤں آگے بڑھے۔ یہ ایک پہاڑی دراز جی وائر سے کشادہ ہو کر غار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس غار کے دو تین چھوٹے چھوٹے جیبر تھے اور اندرونی دیواریں مسلسل استبدال کے سبب خوب ٹام ہو چکی تھیں۔ فرش پر بندے بچے تھے۔ ایک طرف ڈالٹین روشن تھی۔ ضروریات زندگی کا بیشتر سامان یہاں نظر آ رہا تھا۔ اٹلے اور پیاز کی بجلی بجلی خوشبو درمیانی جیبر میں پھرا رہی تھی۔

"کیا یہاں کوئی اور بھی ہے؟" رستم نے سر کوئی کی۔

"نہیں۔ ایک اولد عورت ہائیں۔ وہ ساتھ والے روم میں سوتا۔" ڈاکٹر مالینا نے گھائی اور وہیں جواب دیا۔ وہ بھی سر کوئی میں بولی تھی۔

وہ رستم کو لے کر ایک اونچی گدی پر بیٹھ گئی۔ دیکھنے میں یہ ایک آرام دہ ہنس نظر آتا تھا۔ یہاں قریب ہی رستم کو ایک جھیلما نظر آیا۔ اس نے قیافہ لگایا کہ یہ وہی تھا ہے جو کچھ پہلے سامی خان کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا تھا۔ قہقہے میں جھل اور خشک گوشت وغیرہ تھا۔ ڈاکٹر مالینا نے ایک، چھوٹے سے روزن میں سے ایک چوکور حجر بنایا اور ساتھ والے غلا (جیبر) میں بھانکا۔ یہاں سے دم خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ مالینا قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ اس نے پھر وہ بارہ چوکور روزن میں فٹ کر دیا اور رستم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مالینا! تم زندہ ہو۔۔۔؟" وہ بے حد حیرت سے بولا۔

مالینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا۔ "ہاں زندہ وہی اور تائیں بھی۔"

"میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ تم جیسی دو بارہ بیتا جاتا مگر۔۔۔ کیوں گا۔۔۔ دو گوت۔ تو تمہیں اور اس کو کوئی مارنے کے لئے لے گئے تھے؟" رستم نے سر کوئی کی۔

مالینا کی سمجھ میں رستم کا یہ قول فقرہ نہیں آیا۔ "ہم تم کو یہاں دیکھ کر بہت سر پر اندوڑ۔

لیکن یہ بہت ڈنبر۔۔۔ اگر ساری کو پتا چل گیا تو ہی دل گل یو۔"

"مجھے کسی کا ذکر نہیں لیکن مجھے بتاؤ کہ ساری تم کو یہاں کیسے لایا؟"

میں بتایا۔ "ہام کا لائف اس لئے بچا کہ کھینچا تانی میں ہام کی پاؤں پر چوٹ آ گیا تھا۔ چوٹ سے بہت لمبے تک ہوتا۔ مراد ز کا لیزر ہام کو چھوڑنا مانتا کیونکہ ہام قربانی کے لائق نہیں تھا۔ آفریڈیٹ یہاں آکر ہام کو فائرسے مراد ز کرنے کا فیصلہ ہوا۔"

اب بات رستم کی کچھ میں آ رہی تھی۔ اسٹیشن کی جان بھی شاید اسی لئے بچی تھی کہ بگے کے دوران میں اس کی ٹانگ پر گولی لگ گئی تھی۔

ساتھ والے جیبر سے عورت کے کراٹے اور نیند میں بڑا آنے کی آواز آئی۔ دالینا نے سرگوشی میں رستم کو بتایا کہ مراد ز آیا رہے۔ نشہ آور دوا کھا کر سوئی ہوئی ہے لیکن اب لگتا ہے کہ جاگ رہی ہے۔ اس لئے رستم کھانا بھرتا ہے۔

رستم نے دالینا سے پھر آئے۔ نہ کا وعدہ کیا اور اپنی موجودگی کے نقوش مٹاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر پائل بسٹور ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن میں شام کا گمان ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش پھر شروع ہو سکتی ہے۔ رستم نے کھلی درباری کے پھاٹک کو پھر سے تالا لگا دیا اور نہایت برف پر چومے چومے قدم اٹھا دوا داپس روانہ ہو گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رستم اور ناصر نے زندہاں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے لائین کی کڑی بہت چنگی کر رکھی تھی اور مونے مکمل اپنے جیسوں کے گرد پیٹ رکھے تھے۔ اس زندہاں کے بائیں شریف سمیت سکون کی نیند سو رہے تھے۔ کچھ سے باہر برف زار پر کبھی کبھی کسی جنگلی جانور یا برفانی مٹے کے چلانے کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

ناصر نے کہا۔ "رستم بھائی! آپ کو یاد ہے جب ہم یہاں پہنچے تھے تو شوقم خان کے بے بیٹے نے دالینا کو گلازمد کی حیثیت سے اپنے گھر میں رکھنا چاہا تھا۔"

"ہاں یاد ہے۔ اس وقت ارقا خان نے یہی کہا تھا۔"

"اور بوسا می خان نے دیپے مٹھوں میں اس کی مخالفت کی تھی۔"

رستم نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"اب یہی بوسا می خان دالینا کو اپنی عورت بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔"

رستم کی کشادہ چیشانی پر سوچ کی گہری نگاہ نظر آنے لگی۔ ناصر بھی کچھ دیر تک سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ "رستم بھائی! ہم نے اب تک جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہی ہے کہ مارگا (پاؤنڈ ہستی) دالوں کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے شوقم خان کے

برخلاف پر عمل کرتے ہیں۔ شوقم خان کے اپنے خاندان میں بھی زبردست قسم کا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ اگر کسی طرح اس ایک کو کم کیا جاسکے تو شاید ان لوگوں کا زور کچھ مٹے اور ہمارے لئے بھی کسی طرح کی آسانی پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔"

"تم کہنا چاہتے ہو کہ ارقا اور بوسا می کی طرح کا اختلاف پیدا کیا جاسکے؟"

"میں پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اختلاف تو موجود ہے، اس کو سامنے آنا ہے۔"

"مکمل کر بات کرو۔"

"اگر ارقا خان تک ہے بات پہنچے کہ اس کے چومے بھائی نے دالینا کو اب تک زندہ رکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ شوہر کی طرح رہ رہا ہے تو یقیناً اسے بہت تکلیف پہنچے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی پرانی چوٹ بھی تازہ ہو جائے۔ بے شک ہے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں زبان نہیں کھولتے لیکن رقابت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

رستم نے اپنے ساتھ ہارے کو بے خیالی میں سلاتے ہوئے کہا۔ "بات تو تمہاری کسی حد تک ٹھیک ہے۔"

دلوں کچھ دیر تک خاموش رہے پھر ناصر بولا۔ "لیکن ہمیں ایک مسئلہ بھی ہے۔ دالینا کا کیا ہوگا۔ اس کی جان پھر شہر سے میں پڑ جائے گی۔"

"نہیں..... میرے خیال میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔" رستم نے گہری سانس لی۔ "دالینا کو بچہ نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر کسی بھی مقامی یا غیر مقامی عورت کے ساتھ مراد ز خاندان کا کوئی مرد اور دوا جی رشتہ قائم کر لیتا ہے تو اس عورت کو کوئی نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی کسی طرح کی اور سزا دی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔ داس (مترجم) نے مجھے اس بارے میں بہت بتواتا ہے۔ ان پاؤندوں کی مقامی رہائشی جتنی عجیب ہیں اتنی ہی پرانی بھی ہیں۔ یہ بڑی سختی ان کو بھاتا ہے۔"

"لیکن اگر وہ حرامی بوسا می خان مانا نہیں کیا اس نے دالینا کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔"

"اس بارے میں عورت کی کوئی ایک دم تسلیم کی جاتی ہے پھر ان کے پاس بہت تجربہ ہے۔" مہ لوری تھیں جو اپنی جن کو "کھارباں" کہا جاتا ہے۔ وہ اس قسم کے معاملوں کو دیکھتی

بہت کمزور تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس کا کیس کمزور ہے۔ وہ صرف سزا کے خوف سے اپنی سیدھی بائگٹے لگا تھا۔

اسی دوران میں رستم، ناصر، شریف اور دیگر قیدیوں کو کھلی جگہ سے ہٹا کر کھوہ کے اندر بچکانہ یا گیا اور وہ بچا بچائی کارروائی کے آنکھوں دیکھے حال سے محروم ہو گئے۔

انگلے روز سترجم وہاں کی زبانی رستم اور ناصر کو بے خبریں ملیں۔ وہاں نے غلطی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جگہ کہتے ہیں عورت اور دولت نساہ کی بڑ ہوتی ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ سہائی جیسا نو جوان اپنے باپ کے عزم کے خلاف چلے گا اور یہ نہ سوچا تھا کہ ارفا اور سہائی جیسے بھائی ایک دوسرے کے خلاف زبان کھولیں گے۔“

”کیا ہوا ہے؟“

”کل جرے میں بہت ہنگام ہوئی ہے۔ ارفا خان نے اپنے باپ سے بہت کھل کر بات کی ہے اور کہا ہے کہ سہائی کو وہی سزا ملنی چاہیے جو اس جرم کے لئے مقرر ہے۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی ذور عایت نہیں ہونی چاہیے ورنہ ایک نوئی مثال قائم ہوگی۔ دوسری طرف ارفا اور سہائی کے درمیان بھی جھگڑا ہوا ہے۔ فیصلہ کل شام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر سہائی کو سزا دینے کا فیصلہ ہوا تو ہو سکتا ہے کہ یہ سزا سہامی مان لی جائے۔“ وہاں نے خلک خوبانی، گفتگو اور با دام رستم اور ناصر کو پیش کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”اگر عورت کے ساتھ زبردستی کی جائے تو اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے لیکن اس معاملے میں بہت حد تک زبردستی نظر نہیں آتی۔ عورت کی اپنی بھی خواہش تھی کہ وہ زندہ رہے اور زندہ رہنے کے لئے اس نے سہائی خان کی بات مان لی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس جرم میں اگر سہائی خان کو سزا دی گئی تو وہ بایاں باز دکانے کی سزا ہوگی۔ یہ بازو تیز کھانڈی کے ذریعہ کٹنے سے سکاٹ کر طیلہ کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ”بہار“ کے کم از کم تین آدمی اور زیادہ سے زیادہ چھ موموں کے لئے سہائی کو قید کی سزا بھی ہوگی۔“

”اوہ۔۔۔ یہ تو کیا سخت سزا نہیں ہیں۔“ ناصر نے ہونٹ کھینچے۔

”تم دونوں نے یہ نہیں پوچھا کہ بایاں باز وہی کیوں کاٹا جاتا ہے؟“

”فرماؤ۔۔۔ کیوں کاٹا جاتا ہے؟“ ناصر نے تھکے لکھی سے بولا۔

”بایاں باز وہی کی طرف ہوتا ہے اور یہی ہے جس سے پہلے عورت کی طرف کھینچتا ہے اور مرد کو خوار کرتا ہے۔“

”میر۔۔۔ تم سب سے پہلے آنکھوں میں گرم سلائی پھیرنی چاہیے کیونکہ

آنکھیں ہی عورت کی طرف دیکھتی ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”یہاں کے لوگ نظر سے زیادہ دل کی غلطی مانتے ہیں کیونکہ نظر تو اپنی ماں اور بہن وغیرہ کو بھی دیکھتی ہے۔“ وہاں نے دلیل دی۔

”اچھا۔۔۔ ڈاکٹر بایاں کہاں ہے؟“ رستم نے موضوع بدلا۔

”وہ شوق خان کی حفاظت میں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اب اسے کسی طرح کا خطرہ نہیں۔ یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ سہائی خان اس لیدی ڈاکٹر کے ساتھ اسی طرح رہ رہا تھا، جس طرح ایک مرد اپنی عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ کبھی بھی شوق خان کی بہنوئی شمار نہیں ہو سکتی لیکن اس کا ناتا ضرور سردار خاندان کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ اب اسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس کا کچھ ہوتا ہے تو اس کو زندہ رکھنے یا مار دینے کا فیصلہ بھی ایک خاص طریقے سے ہوگا۔“

دوسری سہرہ دیکھ ہوا جس کے بارے میں سترجم وہاں سے قیافہ لگایا تھا۔ شوق خان نے مقامی قانون کے مطابق اپنے بیٹے کو سزا سنائی۔ یہ بازو کاٹنے کے علاوہ پورے چار سال تک قید میں رکھے جانے کی سزا تھی۔ یہ سزا ایک بڑے جہوم کی موجودگی میں سنائی گئی۔ اس جہوم میں زیادہ تر مرد تھے۔ کچھ عورتیں بھی تھیں لیکن بچہ کوئی نہیں تھا۔ کئی سواٹراؤں نے ہمارے کی شکل میں ہواد برف پر کھڑے تھے۔ شوق خان اور جرے کے دیگر افراد موجود تھے۔ شوق کا چنانسا خان زنجیروں میں بکڑا ہوا موجود تھا۔ اس کا چہرہ پہلے ہی پیکا پڑ رہا تھا۔ باپ کے منہ سے اپنے لئے کڑی سزا کا اعلان سن کر وہ بالکل ہی سفید پڑ گیا۔

سزا سنانے کے بعد شوق خان فوراً ہی اندھ کر چلا گیا۔ جہوم میں سرگوشیاں ابھریں۔ شاید کچھ لوگ سہائی خان کی سزا میں کمی کے حامی تھے لیکن نظر ثانی کا وقت اب گزر چکا تھا۔ سفید زنجیروں والے دو افراد کچھ صاف پکڑا، شے کی تھیں اور دینی وغیرہ کے کرموقع پر پہنچ گئے۔

”یہ کیوں ہیں؟“ رستم نے سترجم وہاں سے پوچھا۔

”بھوہ۔۔۔ یہاں کے ڈاکٹر ہیں۔ سہائی خان کا بازو کٹنے کے بعد یہی اس کے جسم سے خون کا اخراج روکیں گے اور مرہم بنی کریں گے۔“ وہاں کے لیے جسے جگہ سکاٹا تھا۔

”کیا بازو سہامی مان کاٹا جائے گا؟“

”یہاں ڈاکٹر سزا نہیں سہامی مان دی جاتی ہیں۔“

کڑی کا ایک بڑا سخت لاکر ہواد برف پر رکھ دیا گیا۔ اس پر لوہے کے چھوٹے

چھوٹے قلعے سے تھے۔ مسلح افراد سامی خان کو تختے کی طرف لانے لگے تو سامی خان نے آخری کوشش کے طور پر جڑے کے ارکان سے کچھ بھگن کر اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

سامی خان کو تختے پر لٹا دیا گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں جھنجھوں میں کس دیئے گئے۔ اس کے چہرے پر تکلف کے واضح آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار خشک لبوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اس کا پایاں باز داغی ریش پر پھیلا دیا گیا اور اس کے نیچے کندھے سے قریب ایک وزنی لکڑی رکھ دی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد سزا پر عمل درآمد ہو گیا۔ ایک نومند پاؤندے نے چوڑے پھل کے کھانزے کے ایک ہی پتے تلے وار سے سامی خان کا جوان بازو کندھے سے کاٹ کر رکھ دیا۔ زیادہ تر قماشائوں نے دم بخود ہو کر یہ قماش دیکھا۔ تاہم چند ایک نعرے بھی سنائی دیئے۔ سفید داڑھیوں والے معالج بھاگ کر مضرب سامی خان کے پاس پہنچ گئے اور چابک دہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ سامی خان صدمے سے نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کچھ قاصلے پر اکڑاؤ بیٹھی تھی اور دروہی تھی۔ اس کے رونے میں بین کا سا انداز تھا۔ اس کے چہرے پر چادر تھی۔

”یہ کون ہے؟“ درہم نے اس سے پوچھا۔
 ”سامی خان کی اوجیز عمر بیوی۔ مگر اس نے اپنے شوہر کو سزا سے بچانے کے لئے اپنے سر کی بڑی تیشیں کیں لیکن یہ سب کچھ بے سود رہا۔“ وہ اس نے کہا۔
 کئے ہوئے بازو کو صائب کر موقع سے بٹایا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر درہم کو اپنی جانگم کے کانٹے جانے کا منظر یاد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ٹمکوں چہرہ بھی یاد آیا اور اس چہرے کے ساتھ اور بہت کچھ یاد آیا۔

ہجوم اب آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مسلح مخالفوں نے انہیں افراد کو بھی کھو میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اچانک ایک جانب سے شور اٹھا۔ یوں لگا کہ بہت سے لوگ غصہ اٹھا ہو گئے ہیں۔ بلند آواز سے بولنے اور چلانے کی آوازیں بھی ابھریں۔

اس صورت حال جاننے کے لئے تیزی سے اس جانب بڑھ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ بگڑے کی جگہ پر باقاعدہ کھڑائی چل رہی ہے۔ بہت سے افراد اس لڑائی کو رکوانے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔ دو چار منٹ بعد جگہ بگڑا۔ غصہ مٹ گیا اور شوق سے مسلح مخالفوں نے لڑائی جگہ سے انہام میں لکڑی اور کو پکڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی واپس آ گیا۔

اس نے حسب عادت ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”عورت واقعی فساد کی بنیاد ہوتی ہے

اور اگر وہ خوب صورت بھی ہو تو کام زیادہ خراب ہوتا ہے۔“
 ”کیوں؟ کیا ہوا؟“ ناصر نے پوچھا۔

”گلتا ہے کہ اس لینڈ ڈائریکٹر کی وجہ سے یہاں اتفاق کا جج ہو گیا ہے۔ پہلے دونوں برائیوں میں ان بن ہوئی۔ اب ان کے حمایتیوں میں ٹھن گئی ہے۔ جو لوگ سامی خان کے قریب ہیں انہیں اس کڑی سزا پر صدمہ ہوا ہے۔ جو بندہ پہلے ہی صدمے میں ہو اس کے سامنے کوئی مخالفت کی بات کی جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے۔“
 ”کس نے کی مخالفت کی بات؟“ درہم نے پوچھا۔

”ارفا خان کے کسی حمایتی نے کہا کہ جو بوا بہت اچھا ہوا۔ اس پر سامی خان کے ایک حمایتی کو تیش لگ گیا۔ اب اس سے بات ہو گئی۔ ایک ٹھنک نے گالی دی۔ دوسرے نے کھڑائی چلا دی۔ اس کے بعد کئی کھڑائیاں حرکت میں آئیں۔ دس بارہ بندے زخمی ہوئے ہیں۔ دو تین تو شدید زخمی ہیں۔“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ ناصر نے سر ہلایا۔
 ”یہاں لوگوں کا اتفاق مثالی ہے۔ برسوں گزر جاتے ہیں اور کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے حیران کن ہے۔ خاص طور سے لوگ اس بات پر حیران ہیں کہ سامی خان جیسے بیٹے نے شوق خان کی حکم دہولی کی ہمت کیوں کر کی؟“

ناصر نے قسطنطنیہ انداز میں کہا۔ ”دیکھو چا چا و اس! بندہ جب فطرت کے خلاف چلتا ہے تو باہر سے چاہے کتنا بھی اصول پسند اور پر بیڑگار ہو اندر سے کھوپھل ہی رہتا ہے۔ کھوپھل کھینچے ہو؟“ کیمینڈر ہو بھکا۔ ایسے پر بیڑگاروں کو جب کبھی اپنی بھوک مٹانے کا آسان موقع ملتا ہے تو وہ اپنے منانے ہوئے سارے قانون اور قاعدے بھول جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ یہ زلا اور راج کم از کم ہماری کچھ میں تو نہیں آتا۔ سامی خان اور ارفا خان جیسے نوجوانوں کو جب کبھی عمر کی عورتوں سے بیٹھا جائے گا تو ان کے اندر ضرور ہم عمر عورت کی چاہ رہا ہوگی۔ سامی نے جو کیا اسی دلی ہوئی چاہ اور خواہش کا نتیجہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں ہری چھپے ایسے اور واقعات بھی ہوتے ہوں گے۔ کچھ سامنے آ جاتے ہوں گے کچھ راز میں رہتے ہوں گے۔“

جہاں دیدہ وہاں خاموش رہا۔ اس کے مدق قیچہ سے سے میاں تھا کہ وہ ناصری کا توں نے نیم شوق ہے۔ ایک جگہ رستم فتح گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی رہائی کھوہ میں داخل ہوتے ایک جگہ لوگوں کا مجمع نظر آیا۔ چند افراد نے سفید رنگ کا ایک بڑا سا کپڑا ہوا رچھڑ پر

بچا رکھا تھا۔ اس کپڑے پر خون آلود ہاتھوں کی چھاپ تھی۔ چھاپ پرانی ہونے کی وجہ سے خون کا رنگ سیاہی مائل دکھائی دیتا تھا پھر ایک شخص کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک خون آلود شے سے گر آیا۔ بے شک یہ سیاہی خان کے جسم سے علیحدہ کئے جانے والا بازو تھا۔ کئے ہوئے بازو کا ہاتھ "خون آلود" تھا یا اسے خون آلود گردو دیا گیا تھا۔ اس ہاتھ کی ناز و چھاپ بھی کپڑے پر ثبت کر دی گئی۔

"یہ کیا ہے؟ کہیں یہ وہی کپڑا تو نہیں رستم بھائی جو آپ نے گورے کے بچنے میں دیکھا تھا؟" ناصر نے پوچھا۔

رستم نے انہماک میں سر ہلایا۔ "میرے خیال میں یہ وہی کپڑا ہے اس پر ان لوگوں کی ہاتھوں کی چھاپ ہے جنہیں وہاں ذبح کیا گیا۔ ڈاکٹر رابرٹ وگاڑ جیسک اور وہ اسے بی تراب کی مدد پر لایا۔ سب کے ہاتھوں کے نقش اس کپڑے پر ہیں۔ میں پہچان سکتا ہوں۔"

"اس کپڑے کو مقامی زبان میں "سزا کا آئینہ" کہتے ہیں۔" "وہاں نے کہا۔" اس کپڑے کو مقدس درخت آجوک کے تنے سے باندھا جاتا ہے اور یہ وقت ضرورت وہاں سے اُتارا جاتا ہے۔"

اچانک مقب سے ایک جوان لڑکی تیزی سے آئی اور بڑی بے تکلفی سے رستم کی پشت سے لپٹ گئی۔ یہاں عورتیں ہماری بھرم پردے میں سے نظر آتی تھیں لیکن یہ لڑکی اور اس طرح کی تین چار اور لڑکیاں پردے کے بغیر بھی نظر آتی تھیں۔ یہ لڑکیاں کھلے اور مونہ لہو دے بیٹھتی تھیں۔ سروں پر بھی اور مٹی نظر آتی تھی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ہر جگہ آزادانہ پھرتی تھیں۔ ان کی کسی بات کا کوئی اثر انہیں مانتا تھا اور نہ کوئی روک ٹوک کرتا۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔ یہ نہ ہی بھلی اردو بھی بول سکتی تھی اور اپنے لئے بڑے بھونچے سے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔ وہ رستم کو کچھ ہموڑ کر بولی۔ "تم بہت اچھا۔ بہت زیادہ اچھا۔ تم بہت زور والا۔ تم جس طرح دلچسپ سے لڑتا اور اس کو گراتا۔ کوئی اور نہیں گرا سکتا۔ میں تم کو بہت پسند کرتا۔"

"بہت مہربانی۔ بہت شکریہ۔" ناصر نے چنچل لڑکی کو رستم کی پشت سے ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ اور پست گئی۔ "لڑائی میں تمہارے ہاتھ پر بہت چوٹ آیا تھا۔ اگر تمہیں آرام نہیں آیا تو مجھ کو بتاؤ۔ میں تم کو دوائی لگاؤں گا۔"

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" رستم نے کہا۔

لڑکی نے شرارت سے رستم کا کان زور سے کھینچا اور کھٹکھٹا کر ہنسی ہوئی بھاگ گئی۔ مترجم داس کے چہرے پر شے کے آثار نظر آنے لگے وہ بی گیا۔ پھر حسب معمول وہ کچھ اور اس نظر آنے لگا۔ وہ جب بھی اس لڑکی کو دیکھتا تھا داس ہوس جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں رستم اور ناصر کو کئی بار محسوس ہوا تھا کہ اس لڑکی سے مترجم داس کا کوئی نزدیکی رشتہ ہے۔ بہر حال داس نے کبھی اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ ناصر، رستم اور داس اندر کھوہ میں چلے گئے۔ داس ایک دم خاموش رہ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں رستم کا دل چاہا کہ آج وہ اس سے اس لڑکی کے بارے میں ضرور کچھ پوچھے۔

کھوہ کے اندر گرم قبوے کا دور چل رہا تھا۔ ابھی قیدیوں کو ان کے مخصوص چیمبر میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ رستم اور ناصر یہاں لپٹا کر داس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

رستم نے کہا۔ "وہاں تم نے ایک دن بتایا تھا کہ یہ لڑکیاں کسی مذہبی رسم کو ادا کرنے کے لئے پالی پوری جاتی ہیں لیکن تم نے رسم کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔"

"چھوڑو داس ذکر کرو۔" داس کچھ اور داس ہو گیا۔

"کیا کوئی تکلیف دہ رسم ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

داس نے گہری سانس لی۔ "موت سے بڑھ کر تکلیف دہ کیا ہوگا؟"

ناصر اور رستم دونوں چونک گئے۔ "کیا کہنا چاہتے ہو داس؟" ناصر نے اسے کرید۔

داس نے اپنی آواز پست کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ضرور مجھے کسی چکر میں پھنساؤ۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کے ضابطے سخت ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ دیواروں کے بھی کان تے ہیں۔"

"اور تم بھی یہ جانتے ہو کہ ہم دونوں مکمل طور پر قابلِ ہراس ہیں۔" رستم نے آہستہ سے داس کے ہاتھ پر ہاتھ پڑا دیا تھا۔

داس کی گہری سوچ میں کمی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں سیاہ قبوے پر تھیں جس میں سے ان کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کھوہ کی چھت سے لٹکی ہوئی لائٹیں آہستہ آہستہ بھول رہی تھیں۔

داس نے اچانک کہنا شروع کیا۔ "ان لڑکیوں کو آجوک درخت کی بیجٹ چڑھانے کے لئے لایا جاتا ہے اور پال پوس کر جوان کیا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ مقدس لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہر ایک کے لئے قابلِ عزت ہوتی ہیں۔ کوئی ان کی طرف غلط دھاوا خانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہ تو دور کی بات ہے کسی کے دل میں بھی ان کے بارے میں کسی طرح کا غلط خیال نہیں آتا۔ یہ جہاں چاہے جاتی ہیں۔ جو چاہے کھاٹی جاتی ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ نہیں روکتا۔ نہ ان

پر کسی طرح کی کوئی دے داری ڈالی جاتی ہے لیکن ان کی عمر طویل نہیں ہوتی۔ عین جوانی کے عالم میں گارنڈوں کو دنیا چھوڑنی پڑتی ہے۔ شاید میں تمہیں بتانا بھول گیا، ان لڑکیوں کو مقامی زبان میں گارنڈیاں کہا جاتا ہے۔ ایک خاص موقع پر ان لڑکیوں کو بیعتنہ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ لڑکی زری بھی ایک گارنڈی ہے۔

”کیا اسے معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟“ رستم نے دریافت کیا۔

واس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ان لڑکیوں کو معلوم ہے۔ لیکن سے ہی ان کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کے ذہن اس بات کو قبول کر لیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ وہ آجوب کی چاکر ہیں اور ایک دن اس کے قدموں میں خرابا ہو جائیں گی۔ قربان ہونے کے بعد وہ ابدی زندگی پائیں گی اور ایک ایسی دنیا میں بنیں گی جہاں ہمیشہ آرام کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ جہاں ان کی ہر چھوٹی بڑی خواہش بہترین طریقے سے پوری ہوگی اور کسی بھی طرح کی محرومی ان کے قریب نہیں آئے گی۔“ بولتے بولتے واس کی آواز بھرا لگی۔

”کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟“ ناصر نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔
”میرے یقین رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں کنی موہرس سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ان علاقوں میں کنی چھوٹے جڑے غیر مسلم قبیلے آباد ہیں۔ ان کے عقیدے سے اسی طرح کے ہیں۔“

رستم نے قبوے کی چسکی لپیٹے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی تک بتایا نہیں واس۔ لیکن ہمیں لگتا ہے کہ اس لڑکی زری سے تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ تمہاری طرح یہ بھی ارادہ اور ہمتو وغیرہ کچھ لیتی ہے۔ تم دونوں کسی ایک ہی علاقے کے لگتے ہو۔“

واس ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آج تم دونوں مجھ سے بہت کچھ پوچھ کر چھوڑ دو گے۔“

”اس بات پر یقین رکھو واس! ہمیں بتانے سے تمہارا فائدہ تو ہو سکتا ہے، نقصان نہیں۔“ رستم نے اسے حوصلہ دیا۔

دبے پستے واس نے اپنی چھوٹی داڑھی میں اٹھکایاں چلائیں اور کہا۔ ”زری میری بہتی ہے۔ آج سے تقریباً بارہ سال پہلے وہ میرے اور میری بیوی کے ساتھ ہی یہاں بچی تھی۔ زری کی ماں بھی ہمارے ساتھ تھی۔ چاروہ تو بیمار ہو کر مر گئی اور ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے۔“

اس کچھ دیر خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا تعلق راولپنڈی کی ایک پریمی نسلی قبیلے سے ہے۔ میرا اصل نام وسم خان ہے۔ میرے بڑے بھائی انیس خان تھے۔ وہ خلد سیاحت میں ملازم تھے۔ انہیں ٹریکنگ اور ہائیکنگ وغیرہ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ فرصت ملنے ہی کو وہ بیانی کے ساز و سامان اور اپنی قبیلے کے ساتھ دور دراز کے ٹریکس پر نکل جاتے تھے۔ گرمیوں کے ایک موسم میں ہم لوگ کیسنگ کا سامان لے کر اسکر دو کی طرف گئے۔ اس پستلانی علاقے کے بارے میں ہم نے کافی پڑھا تھا اور ہمیں اس میں دلچسپی تھی۔ اس سفر میں کے ٹو کے نظارے ہمارے ساتھ تھے۔ پھر کمرام کے مطابق ہمارے سفر میں بارہ دن کا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک آبر آوردہ میں ہم راستہ بھول گئے۔ ہمارا کمپاس ٹھیک سمت نہیں بتا رہا تھا۔ ہم بھٹک کر ایسے علاقے میں چلے گئے جو ٹریک سے بہت بہت کر تھا۔ ہم جون آگے بڑھتے جتے اصل رخ سے دور ہوتے گئے۔ ہم کل پانچ افراد تھے۔ میں اور میری بیوی۔ بڑے بھائی اور ان کی بیوی اور بڑے بھائی کی بیٹی زری۔ بڑے بھائی صاحب کو اس سے بہت پیار تھا۔ وہ اسے بھی اپنی طرح مہم نگہ بنانا چاہتے تھے اور چھوٹی عمر میں ہی اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک رات ہم اپنے سفری خیموں میں تھے کہ کچھ افراد نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کی چمکیلی کھانڑیوں نے ہمارا گھبراؤ کر لیا۔ وہ ہماری کوئی بھی بات سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ انہوں نے ہمارے خیمے اکھاڑ دیے اور ہمیں کنی ٹھوہر تک پیدل چلانے کے بعد اس مقام پر لے آئے۔ ان دنوں یہاں ایک شخص بڑی مہلکی پشتو بٹول لیتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب بھی پشتو جانتے تھے۔ پشتو میں ہماری بات چیت ان لوگوں سے ہوتی اور ہم نے انہیں بتا دیا کہ ہم بالکل بے ضرر لوگ ہیں اور بھٹک کر اس علاقے میں آ گئے ہیں لیکن وہ ہم پر مسلسل شک کر رہے تھے۔ پھر ایک سنگین اتفاق یہ ہوا کہ بڑے بھائی صاحب کے رک سیک (قبیلے) میں سے اس مقامی پودے کے کچھ چرھانے ہوئے بچے نکل آئے جسے یہاں بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے سب مندر کے پتے؟“ رستم نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ یہاں اس کی باقاعدہ عبادت کی جاتی ہے۔ آجوب درخت کے بعد یہی جڑی یہاں سب سے زیادہ متبرک ہے۔ مقامی زبان میں اسے سوی کہا جاتا ہے۔ اسے توڑنا یا اسے کسی بھی طرح کے استعمال میں لانا یہاں سخت منکھ ہے۔ اس نایاب جڑی بوٹی کی تلاش میں کبھی کبھار کوئی سیلانی یا شکاری یہاں آ پھرتا ہے پھر یہ لوگ اسے یہاں سے جاتے نہیں دیتے۔ جنہیں اب تک اندازہ ہو گیا ہوگا تمہارے ساتھ جو لوگ یہاں بندہ ہیں ان میں سے

زیادہ تر کارجم ہیں۔ یہ کہ وہ اس علاقے کی حدوں میں پائے گئے ہیں۔
 ”کیا یہاں حکومت کا کوئی عمل نہیں؟“

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ دور دراز علاقے ایسے ہیں کہ سال میں آٹھ مہینے تو یہاں پہنچایا نہیں جاسکتا۔ ان بلند پہاڑوں پر کی جگہیں ایسی ہیں جہاں سے کوئی باہر نہیں جاتا اور نہ کوئی باہر سے آتا ہے۔ لوگ یہیں پر پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔“

”تم اپنے بھائی اور بھانج کے بارے میں بتا رہے تھے۔“ رستم نے واس کو پھر موضوع کی طرف کھینچا۔

”ہاں۔۔۔ تو میں بتا رہا تھا کہ بھائی صاحب نے یونہی سوی کے عجیب و غریب پتے اپنے سامان میں رکھ لئے تھے۔ انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس کا انہیں کیا فائدہ پہنچتا پڑے گا۔ مریجھاے ہوئے پتے برآمد ہونے کے بعد یہ پاؤں سے تلخ پڑ گئے۔ انہوں نے تم سب کو اپنی بیٹی چھت والے گروں میں بند کرنا چاہا۔ جب ہماری عورتوں کو ہم سے علیحدہ کیا گیا تو ہم نے زبردست مزاحمت کی۔ بھائی صاحب کی جینٹ میں ابھی تک ایک ریا اور موجود تھا۔ انہوں نے پاؤں کو ڈرانے کے لئے ہوائی فائر کئے۔ اسی دوران میں عقب سے ایک شخص نے کھباڑی کا زوردار وار کیا اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔ میرے کندھے اور میری پیوی کی ٹانگ پر بھی گھر اڑھن آ گیا۔“

واس نے دائیں بائیں دیکھا اور احتیاط سے اپنے کندھے پر سے اونی جینٹ کھسکا کر اس بارہ سال پرانا کھباڑی کا زخم دکھایا۔

”تمہارے بھائی صاحب موقع پر ہی ختم ہو گئے؟“ ناصر نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ وہاں بعد زخم کی تاب نہ لا کر چل بیٹے۔ ہمیں تین ہزار پینار کہ یہاں کے قیدیوں میں شامل کر دیا گیا۔ میری پیوی، بھانج اور زری عورتوں کے ساتھ تھیں اور میں مردوں کے ساتھ۔ زری کی عمر اس وقت مشکل سے آٹھ نو سال ہوگی۔ اس کے بعد ہماری طویل قید کا دور شروع ہوا۔ میری پیوی اور بھانج شوقم خاندان کے دو گھروں میں کام کا بج کرتی تھیں۔ مجھ سے بھی تھوڑی بہت بیگاری جاتی تھی۔ میرا کام بھیج کر بکروں کے چڑے کو صاف کر کے اسے استعمال کے قابل بنانا تھا۔ زری کی ماں شوہر کی موت اور اپنی قید کا صدمہ نہ جھیل سکی اور دو سال بعد بیمار ہو کر مر گئی۔ میری پیوی کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے کافی تکلیف جھیلی لیکن پھر صحت یاب ہوئی۔ زری ایک دوسرے گھر میں تھی۔ اس کی ماں گن بھی

ابھی عورت تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بارہ سال کی عمر میں ایک تہوار میں زری کی بچہ دوسری گھر لڑکیوں کے ساتھ گھامنی کے طور پر چن لیا گیا۔ یہ آج کے درخت کے نیچے ایک طرح ن قہ اندازی کی جاتی ہے جس میں درجنوں لڑکیوں میں سے چھ یا سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔“

زری کے گامنی بننے کا ذکر کرتے کرتے واس ایک بار پھر اداس ہو گیا۔

”تم قیدی سے مترجم کیسے بنے؟“ رستم نے سوال کیا۔

”سات آٹھ سال پہلے، یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ دو انگریز باشندے کچلا کر یہاں لائے گئے۔ یہ میاں بیوی تھے۔ یہ بلکہ کر نہیں آئے تھے۔ یہ واقعی مقدس جڑی بوٹی سپ لہلہ یا سوی کی تلاش میں تھے۔ میں نے ایک مترجم کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی اور ان سے کافی کچھ اگھوایا۔ شوقم خان میری کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔ میری سب سے بڑی قابلیت یہ تھی کہ میں نے چار پانچ سال کے اندر مقامی زبان بڑی اچھی طرح بولنا شروع کر دی تھی۔ شوقم خان نے مجھے اور میری بیوی کو اسٹے رہنے کی اجازت دے دی اور پھر کچھ عرصے بعد ہماری قیدی کی حیثیت بھی ختم کر دی گئی۔“

”کیا تم نے ابھی اس جگہ سے نکلنے کا اور اپنے پیاروں میں جانے کا نہیں سوچا؟“

مال ناصر کی طرف سے کیا گیا۔

”پہلے مکمل بہت سوچا تھا بلکہ شاید چھ سات سال پہلے تک بھی سوچا کرتا تھا لیکن اب نہ۔ آج بہت سے بے چینی ختم ہو گئی بلکہ ابھی بھی تو ہم میاں بیوی ہو چکے ہیں کہ شاید میں ہمارا گھر بنا دوں۔“

”کیا یہی یہاں سے نکلنے کی کوشش بھی کی؟“ رستم نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ یہ ہے کہ میں نے بھی کوشش نہیں کی۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میری ماں ایک ناگت تقریباً معذور ہے۔ وہ میرے ساتھ کسی ایسی کوشش میں شریک نہیں ہو سکتی اور اس کے بغیر میں یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسری وجہ اس جگہ کا حدود ہے۔ تم تینوں بھی یہاں سے نکلنے کی دو کوششیں کر چکے ہو۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ اس جگہ پر اپنا مکان بنانا دشوار ہے۔ یہ درحقیقت ہرف کا ایک قدرتی جزوہ ہے جس کے باطن طرف گہری کھائی ہیں۔ نکلنے کا راستہ ایک ہے اور دوسری بڑی محنت سے خود بنایا گیا۔ پہلی مرتبہ تو تم اس رائے سے نہیں پہنچ گئے لیکن دوسری مرتبہ تم لوگوں نے دیکھا ہی کہ اس کو کتنی سخت گمانی ہے۔“

"یہ ٹھگرائی اور پھر سے دور ہمارا راستہ نہیں روک سکتے اس ایک دن ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔" ناسر نے مجھ پر ہنس دیا۔

اس نے کوئی نہ کوئی نظر دوسرے راستہ کی طرف دیکھا۔ "اگر یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو میں اسے بے وقوفی کہتا لیکن یہاں نہیں کیوں تم مجھے یہاں کے دوسرے راستوں سے جدا لگتے ہو کیونکہ بات ہے تمہارے اندر۔ کوئی بات ہے لیکن پھر بھی تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہوگا کہ اب اس قسم کا خطرہ مول نہ لیں۔ شرم خان نے پہلی دفعہ تو مجھیں معاف کر دیا تھا۔ دوسری مرتبہ بہت جلدی مزاحمتیں سے بلکہ اسے تو ایک طرح کی وارننگ کہنا چاہیے۔ اگلی مرتبہ تمہاری کم از کم سزا ہوگی کہ تمہارے ایک گھنٹے سے نیچے نکال دی جائے گی۔ پھر اس ایک مقام پر تک سے ساتھ چھٹیں اپنی اپنی چیزیں لے کر بھی گھبرا جائیں گے۔"

اس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ رستم نے یہاں کم از کم دو ایسے قیدی دیکھے تھے جن کی جانگ کے ساتھ ایسی ہی سلوک کیا گیا تھا۔ انہیں اپنی چیزیں کوٹھیت کر پٹیلے ہوئے دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔

اس سے پہلے کہ ان کی گفتگو مزید آگے بڑھتی، شرم خان کے مقرر کردہ مسلح محافظ آگئے اور انہوں نے سب کو وہاں سے اٹھ کر خار میں چلے جانے کا حکم دیا۔ آج محافظوں کے چہروں پر کافی تازہ نظر آتا تھا۔ اس تناؤ کی وجہ غالباً وہ لڑائی تھی جس نے آج پانچ گھنٹے مارگا کا سکون تباہ کر دیا تھا۔

☆=====☆

یہ چھ سات روز بعد کی بات ہے۔ کھوہ کے اندر مشقت ختم کرنے کے بعد ناصر اور شریف کو آرام کرنے کے لئے چلے گئے اور رستم باہر برف پر نکل آیا۔ یہاں پر قیدی کی حیثیت سے ان کی مشقت اکثر بدلتی رہتی تھی۔ آج کل کھوہ کے اندر شمال کی جانب نشیب میں اترنے کے لئے چہروں میں مٹی چھائی گھودی جاری تھی۔ وہ قریباً سانس نہ کھینچ سکتے تھے۔ شرف نے کہا کہ سانس آہستہ آہستہ مل رہا ہے۔ سو، یہ مغربی قیدیوں کی طرف جھٹکتا چلا رہا تھا۔ کھوہ سے باہر ہستی کے گھروں کے سامنے اور قیدیوں میں پہنچنے کا دور ہے۔ رستم نظر کر چلا ہوا راہروں کی اور کھوہ سے انداز میں ایک چہرہ پر بیٹھا۔

"وہ کہاں ہوگی؟ کیا کردی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہوگی؟" وہی سوال اس کے ذہن میں کھلنے لگا جو چھیلی جسموں، تارک ایک راتوں اور خفقان رنگ شاموں میں اس کے ذہن میں

کھلنا تھے۔ شادی کے بعد تو شادی کے لئے چند گھنٹے بھی اس سے دور رہنا محال تھا۔ اس نے اتنی طویل جدائی کیسے کافی ہوگی اور جدائی بھی ایسی جس کی مدت کا کچھ علم نہیں تھا۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ عارضی جدائی ہے یا ہمیشہ کی۔ شادی کے وقت یہ بات تو رستم کو بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کی زندگی تیز ہو میں روکے ہوئے چراغ کی طرح ہے۔ ڈپٹی ریاض اور اس جیسے کئی پولیس افسران کی جیب میں اسے ہلاک کرنے کا اجازت نامہ لئے بھر رہے ہیں اور وہ ان سارے حالات کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن یہاں جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے اندیشوں کے بالکل برعکس تھا۔ وہ جرم سے گناہ کی زد میں آیا تھا اور گندم کے ساتھ گندم کی طرح پس کر اس برف زار میں پہنچ گیا تھا۔ شروع میں اسے اور ناصر کو نہیں تھا کہ یہاں سے نکلنا اتنا دشوار ہو گیا لیکن اب دھیرے دھیرے انہیں حالات کی تکلیف کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ کچھ جنونی لوگوں کے نرسے میں تھے جو اپنے عقیدے اور اصولوں کے لحاظ سے بے حد کمزور تھے اور جو اس برف زار میں پہنچنے والے کسی بھی شخص کو زندہ حالت میں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ وہ نہ کچھ سمجھتے تھے، نہ ماننے تھے، نہ ان سے کسی طرح کا کوئی سمجھوتا کیا جاسکتا تھا۔ وہ چہر پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ سینے پر پڑھتا رہا۔ جہاں B کا حرف کندہ تھا۔ شادی کی مسکراہٹ اس کی نگاہوں میں چمکتی رہی۔ اس کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اس کی محبت، اس کی بے مثال قربت رستم کو یاد آتی رہی۔ وہ عورت تھی۔ یا کوئی خوش رنگ منتر تھی؟ یا آسمانی تختہ تھی؟ وہ کیا تھی؟ بڑکائی ات دیکھتا تھا تو کو اس کی طرف کھینچتا ہوا محسوس کرتا اور وہ تو اس کا شوہر تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ مارنے کو قریب سے دیکھا تھا اور جھپٹا تھا۔ ہاں وہ بے پناہ تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا جو محبت ملاپ سے کم ہو جائے وہ کبھی محبت نہیں ہوتی۔

اچانک کسی عورت کے چلانے کی زوردار آواز نے رستم کو خیالوں سے چوڑکا دیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اوپر ڈھلوان پر ایک لڑکی ایک تونمہ مرد سے ٹھٹھمٹا رہی۔ پھر وہ دونوں برف پر لڑھکتے ہوئے رستم کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ رستم دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تونمہ شخص سے پہلی ہوئی لڑکی ڈری تھی۔ اس نے بڑی دلیری سے اپنے دونوں ہاتھوں سے یہ مقابلہ کیا دامن کھائی پھڑکی ہوئی تھی۔

وہ چلائی۔ "رستم۔ رستم بھاگ جاؤ یہ جھپٹ مار دے گا۔" رستم کے پاؤں میں تیزی تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس سختی لڑکی کو اس بھیرے ہوئے شخص سے مقابلہ چھوڑ کر اپنی جان بچاتا۔ ذری کھلے ہاتھ ہر کی جوان صحت مند لڑکی تھی

لیکن اس شخص سے مزاحمت کرنے کے لئے بالکل ناکافی نظر آتی تھی۔ اس نے مد مقابل کا ہوا ہاتھ اپنی گرفت میں بکڑ رکھا تھا اس میں چھوٹے دھتے کی کھادی تھی۔

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے تو نہ تو شخص نے زری کے لیے ہاتھوں کو اپنی بائیں مٹھی میں بکڑا اور دو ایسے زوردار جھٹکے دیئے کہ وہ اس سے ٹیکہ ہو کر زور برف پر جا گرئی۔ یہ کوئی شخص تھا۔ اس نے اپنا منہ، سر ایک مقامی طرز کی اونٹنی ٹوٹی میں چھپا رکھا تھا۔ اس ٹوٹی میں سے صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بڑے غضب ناک انداز میں زری کی طرف بڑھا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے رستم کی طرف آیا۔

رستم اب اس کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس شخص نے بے دریغ رستم سے چہرے پر کھپکھپائی کا وار کیا۔ رستم نے نہ صرف جھک کر وار پھیلایا بلکہ بڑی مہارت سے حملہ آور کو اپنے سر کے اوپر سے گزاردیا۔ ہماری بھر کم شخص کے قلاب بازی کھانے کا منظر دینی تھا۔ وہ پشت کے بل گر لیکن فوراً ہی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

زری چلائی۔ ”یہ تم کو مار دے گا۔“
حملہ آور نے ایک بار پھر رستم پر کھپکھپائی چلائی۔ رستم نے اطمینان سے جھک کر یہ وار پھیلایا۔ وہ اس پر جوابی حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن پاؤں کی بیڑی آڑے آئی۔ وہ بروقت حرکت نہ کر سکا۔ حملہ آور نے ٹانگ چلائی اور رستم گر کر دوڑ تک پھسل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے اٹھنے میں دیر لگے گی۔ اس دوران میں حملہ آور کی کھپکھپائی اپنا کام کر سکتی تھی۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔ زری اس موقع پر آڑے آئی۔ وہ ایک بار پھر رستم پر کھپکھپائی کر کے پوری اور حملہ آور سے چپٹ گئی۔ حملہ آور نے اسے بے دردی سے جھٹک دیا اور پھر پھر مار کر، زور گزاردیا۔ اس دوران میں رستم کو اٹھنے اور حریف کے مقابل آنے کا موقع مل گیا۔

آپنی بیڑی کے سبب رستم کی کارکردگی نصف تھی۔ اس کے باوجود رستم اپنے حریف کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ زری بھی کجا بے ہنگام ہے اس کی وہ دھڑکی تھی لیکن وہ ہر بار اسے دھکا دے کر دوڑ پھینک دیتا تھا۔ وہ زری پر کھپکھپائی سے وار کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

زری مزاحمت کے ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی۔ وہ مقامی زبان میں لوگوں کو مدد کے لئے بلارہی تھی لیکن ارادہ کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ اس دوران میں حملہ آور کا ایک دھشیاں وار رستم کے دائیں کندھے پر لگا اور اون کی صدی کو چیرتا ہوا گوشت کو زخمی کر گیا۔ رستم نے سمجھا کہ مد مقابل کے سینے پر سری گھر رسیدی کہ وہ ذرا سا جھکا تو رستم نے پھرتی سے اس کی اونٹنی ٹوٹی

تھکی گئی۔

زری حیرت آمیز خوف سے چلا اٹھی۔ رستم بھی حیران رہ گیا۔

حملہ آور پاؤں نہ ہٹا کر خطرناک ترین لڑاکا ”نئے مان“ تھا۔ یہ خود کو بخش نسل سے بتاتا تھا۔ رستم سے پہلے پہلی شخص رچھے سے لڑائی میں سب سے آگے تھا۔ مقامی زبان میں اسے ”چینین“ کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس کھیل میں..... یا کہا جاسکے کہ اس خوش فہمی میں رستم کا چلہ بھاری ہو گیا تھا۔ ہر وار رستم وغیرہ جانتے تھے کہ ”نئے مان“ ان سے شدید رقابت محسوس کرتا ہے لیکن انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا کھین قدم اٹھائے۔ وہ اپنی شناخت چھپا کر یہاں تنہا بیٹھے رستم پر حملہ آور ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اسے ہلاک کرنا چاہتا ہو یا پھر دشمنی کر کے کھیل کے لئے ناکارہ ہونا چاہتا ہو۔ اسے رستم کی خوش قسمتی یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس برف زار میں بڑکڑیاں بھرنے والی زری یہاں موجود تھی اور اس نے رستم کو عالم بے خبری میں مرنے یا زخمی ہونے سے بچالیا تھا۔

اب دو خطرناک لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ آج ان کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ وہ خود ہی ایک دوسرے کے لئے خوشی چاہ رہے ہوئے تھے۔ ”نئے مان“ کھپکھپائی سوزن لڑا ایک چٹھارے کے ساتھ رستم کی طرف آیا۔ رستم نے اپنا رچل پہلے سے سوچ لیا تھا۔ اس نے چیز کی ایک اشارے سے ٹک کر اپنے بندھے پاؤں کی طرف ہی ”نئے مان“ کے چہرے پر لڑائی۔ وہ دھڑکراتا ہوا کی فٹ تک نشیب میں لڑا۔ حقیقت یہ پہلی شایان شان ضرب تھی جو رستم اپنے حریف کو لگا کا تھا۔

زری ایک اونچے پتھر پر چڑھ کر مقامی زبان میں چلائے گئی۔ ”بھاؤ..... بھاؤ.....“

شاید اس نے کسی کو دیکھ لیا تھا۔ رستم کا یہ اندازہ درست نکلا۔ اس کے کانوں میں ایک زوردار آواز گونجنے لگی۔ ”نئے مان“ رستم اور ”نئے مان“ ایک دوسرے سے ”نئے مان“ تھا۔ اسے خود کو دھکا پر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیز دھار کھپکھپائی بدستور ”نئے مان“ نے ہاتھ میں تھی۔

”رک جاؤ۔“ کسی نے گرجن آواز میں کہا۔ (مقامی زبان کے چیدہ چیدہ الفاظ رستم کی سمجھ میں آتے تھے)

یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی ”نئے مان“ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پچھلے والا شتم خان کا بیڑا اٹھاتا تھا۔ اس کے ساتھ کم و بیش ایک درجن دیگر افراد

بھی تھے۔ ان میں سے اکثر مسلم تھے۔

ارفا خان نے ایک بار پھر گرج کر کہا: ”رگ جاؤ..... پیچھے ہٹ جاؤ۔“
 دستم نے بھی ”نہ مان“ پر سے اپنی گرفت ختم کر دی۔ دستم کے ذہنی کندھے سے مسلسل
 خون بہہ رہا تھا۔ جیڑی کی یہ رتم دھڑ سے اس کے دونوں ٹخنوں بھی جھیل گئے تھے۔ دستم اور
 ”نہ مان“ دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں بات پر رہے تھے۔ زری بھاگ کر ارفا خان کے
 سامنے پہنچی اور مقامی زبان میں دوایا کرنے لگی۔ اس نے ارفا کو اپنا سرخ انگارہ گال دکھایا
 جس پر ”نہ مان“ نے لڑائی کے دوران طوفانی تھیمبر رسید کیا تھا۔ اپنی گردن اور ہاتھوں پر آنے
 والی دیگر خراشیں بھی اس نے ارفا خان کو دکھائیں۔

ارفا خان کے چہرے پر ”نے مان“ کے لئے شدید پاپند یہ گئی کے آٹار اچھے۔ اس نے ذری کے سر پر شفقت کے انداز میں ہاتھ پھیرا اور ”نے مان“ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ارفا خان نے ”نے مان“ کے ساتھ کھلے ترش لہجے میں بات کی۔ جواب میں ”نے مان“ نے بھی خلس انداز میں ایک وہ فقرہ کہے۔ وہ واضح طور پر گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں برف کی سطح سے اٹھیں دسی تھیں۔ تاہم وہ رحم کی طرف جب بھی دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں بجلی لٹکے لگی تھی۔

بہت سے دیگر افراد بھی اب موقع پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور حیرت سے صورت حال کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ رستم کو ان لوگوں میں حیرت و اس کی صورت بھی نظر آئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس رحم کے قریب آیا اور چھوٹے ملک ارفا خان کی ترجمانی کرنے ہوئے بولا۔ ”رحم! اگارتی نری کی گویا ہے بعد“ نے مان“ کا قصور ثابت ہو رہا ہے۔ اس نے جرم کیا ہے۔ وہ جہیں نقصان پہنچا کر ریچھ کے کھیل کے لئے نا کارہ کر رہا تھا۔ اے سزا ملے گی لیکن چھوٹے ملک کا کہنا ہے کہ اگر تم خود“ نے مان“ سے دودھ ہاتھ کرنا چاہو تو انہیں منظور ہے۔“

رستم نے توندہ "نئے مان" کی جانب دیکھا اور جرأت مندی سے بولا۔ "میری بیڑی کھول دی جائے گی؟"

"بالکل کھول دی جائے گی اور اگر تم چاہو تو یہ مقابلہ کسی اور دن کے لئے بھی اٹھا رکھا جاسکتا ہے۔"

”ایسی کوئی بات نہیں، میں ابھی اس سے حساب برابر کرتا چاہوں گا۔“

٤٠٠

”نہیں، یہ معمولی ریشم ہے۔“ رستم نے گمیر سے کٹ کو معمولی قرادیا۔
 ”یعنی قراس سے لڑنا چاہتے ہو؟“
 ”بالکل اور چھوٹے ملک کی خواہش کی مطابق میں اسے زمین بھی چھوڑ دوں گا۔“
 اس واقعہ کے بعد ارفا خان کے پاس گیا اور اسے رستم سے ہونے والی گفتگو
 سنا دیا۔

تھوڑی سی دیر میں ہرف زار کا وہ دیران حصہ تماشا گاہ کی شکل اختیار کر گیا۔ بیسیوں افراد ایک بڑے دائرے کی شکل میں جمع ہو گئے۔ روانہ کے برعکس راجا خان اور اس کے قریبی ساتھیوں نے بھی کھڑے ہو کر مقابلہ دیکھنا پسند کیا۔ زور زانی کے مقابلوں اور جواں مردوں کے مختلف کیمپوں میں ان لوگوں کی خاص دلچسپی رہتی تھی۔

رستم کی جیزی کی کھول دینی تھی۔ ویدھ خصوصیت گرمیہ اند میں آگیا۔ اسے بھی "نے مان" کی طرح چھوئے دستے کی ایک کھجواڑی فراہم کر دی گئی۔ لڑائی میں سر و ہنگام ضرب سے بچانے کے لئے لوگ لوہے کی خود بناؤ ٹوٹی استعمال کرتے تھے۔ ایسی دو ٹوٹیاں "نے مان" اور رستم کو پہنچا دی گئیں۔ سورن کی الوادی کرنوں میں دونوں لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے آئے اور زور و ارادتاً لڑنے شروع ہو گیا۔ رستم اپنی وزنی جیزی کی سمیت "بے مان" سے لڑا رہا تھا۔ اب جیزی کی غلطی ہی اسے چوس محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہوا میں اُڑ رہا ہو۔ اپنے زخم کی پر دہا کے بغیر اس نے "مان" کو چند زوردار ضربیں لگائیں۔ کھجواڑی کا ایک طوقائی وار رستم کے اپنے سینے پر لگا۔ کچھ ہموئے اوپنی کسزوں کے سب کوئی نقصان نہیں ہوا۔

”نہ مان“ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے روبرو ہے جس کی زندگی میں یہ معرکہ سر کرتے گزری ہے۔ اس کا سابقہ ایک پتھل پتھل شخص ہے۔ جب یہ فائنل اپنی پوری فارم میں آیا تو ہندوؤں کے اس گھونگوں میں تارے ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ اسے جیسے سمجھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرف سے وار کرے اور کس جانب سے اپنے گھوڑے کو تھکاتا ہے۔

۔۔۔ جہنم کی ہمدردیاں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ رستم کے حق میں آوازیں بلند کر رہے تھے۔ نام زیادہ تر مقامی سورما ”نہ مان“ کے طرف دار تھے۔ اس لڑائی کا خاتمہ احکام کی ذمہ داری کے ایک دار کو چیلنے ہوئے ”نہ مان“ کی کلبازی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاتی رہے۔

تم کے اگلے طوفان وار نے ”نہ مان“ کا آہنی ٹوپ ایک طرف سے پچکا دیا اور وہ تیرا۔

نہ مان بول گیا۔ رستم نے اس کے سینے پر ٹانگہ رکھی اور اپنے زخم کا جلہ لیتے ہوئے کلبازی۔

کا ایک چٹا علاقہ اس کے کندھے پر کیا۔ وہ ذبح ہوتے بکری کی طرح چلایا۔

اگر رسم اس وقت "نہ مان" کو قتل بھی کر دیتا تو شاید یہ اس کا حق تھا۔ تاہم اسے زخمی کرنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ارقا خان کی طرف دیکھا۔ اوفانے ہاتھ کے اشارے سے لڑائی ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ اس جگہ کہ رسم کے پاس آیا۔ "شاہ پاشا رسم اتم ہمیشہ کی طرح جیتے ہو۔ بہت خوب۔"

مسٹر کا فکروں نے لوہے کا نوپ کھینچ کر "نہ مان" کے سر سے اتارا اور اسے زخمی حالت میں اٹھا کر میدان سے باہر لے گئے۔ زخمی ہوا گ کر آئی اور بے تکلفی سے رسم سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جیسے جنگی شاہ پر ہشمن کی ہو۔ وہ عجیب مصیبت سے بولی۔ "میں جانتا تھا تم ضرور جیتو گے۔ یہ بڑا کمینہ۔ تم آچھا کرتا، اس کو مار دیتا۔" رسم نے زخمی کو خود سے علیحدہ کیا۔ زخمی کی نگاہ رسم کے کندھے پر پڑی۔ لڑائی کے دوران میں زخمی کچھ اور اٹھ گیا تھا اور صدری خون سے تر تھی۔ "بائے اللہ۔ تم کا بہت خون بہتا۔" وہ گرائی اور نرم زوہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس نے بھی آگے بڑھ کر رسم کا زخم دیکھا پھر وہ چھوٹے ہلکے ارقا خان کی طرف گیا اور اس سے کچھ بات کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دلی دلی خوشی کے ساتھ بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" رسم نے پوچھا۔

"میرے گھر۔" میں نے چھوٹے ہلکے سے اجازت لی ہے۔ تم زخمی ہو۔ وہاں کھوہ میں جمیں آرام نہیں کیے گا۔ تم چند دن میرے گھر میں رہو گے۔"

"لیکن ناصر اور۔"

"ان کی فکر کیوں کرتے ہو۔ میں انہیں سب چھوڑ دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تہہاری ملاقات بھی کرادوں۔"

زخمی بھی خوش نظر آ رہی تھی۔ رسم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک ہے، چلو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے قدم بڑھا دیے۔ اس نے اسے کندھے سے تھاما۔ "اگلا بھی خوش ہو۔ نے ہی ضرورت نہیں۔ یہ بیڑی تہہارے ساتھ رہے گی۔" اس نے ہرف پر پڑی شخص بیڑی کی طرف اشارہ کیا۔

ایک لحاظ آگے بڑھا اور اس نے بیڑی کو گھر سے رسم کے جسم کا حصہ بنایا۔

رسم، بیڑی، ناصر اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ بسنی کی طرف ایک تہائی آبادی کھوہ کے اندر تھی، باقی

راہی کٹھوہ کے باہر بھر اور گلوڑی کے بے ہونے مکانوں میں رہتے تھے۔ واس کی رہائش گاہ بھی کھوہ سے باہر تھی۔ یہ دیہاتی گھر تھا جیسے گھر پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے دیہی علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ گھر اندر سے گرم اور آرام دہ تھا۔ اس کی چھت چٹائی تھی اور گھر کے وسط میں ایک آگنی شکی کے اندر آگ بجی ہوئی تھی۔ واس کی دیوی بھی واس ہی کی طرح دلی تھلی اور درمیانے قد کی تھی۔ وہ شکل سے ہی ایک مہربان خاتون نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی بہت خوش شکل رہی ہوگی لیکن اب چہرے پر عمر کے اثرات تھے اور وہ بیساکھی کے سہارے چلتی تھی۔ یہ جوڑا بے اولاد تھا۔

واس کے ذریعے اس کی دیوی کو رسم اور ناصر وغیرہ کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ رسم کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی۔ اسے اچھا لکھا تھا اور اچھا نرس فراہم کیا۔ واس نے رسم کے کندھے کی مرہم پٹی باندھ دی۔ رسم کو یہاں دھنسی سے حد آرام محسوس ہوا۔

دوسرے روز جب صبح سویرے سب سو رہے تھے اور رسم بھی اپنے بستر پر تھا کسی نے زور سے اس کا کان کھینچا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ زخمی اس کے بستر پر چڑھی بیٹھی تھی۔ وہ صحت مند اور ہوش زبا جسم کی مالک تھی۔ کھلے لہاس میں اس کی سوانحیت چمکتی تھی۔ وہ کسی جنگی پھول ہی کی طرح اپنی دلکش و رعنائی سے بے خبر تھی اور وہی بے خبر نہیں بسنی کے لوگ بھی بے خبر تھے۔ یا شاید وہ بے خبر نہیں تھے صرف بے خبر بنے رہتے تھے۔ وہ مقدس لڑکی تھی۔ وہ گادنی تھی اور وہ گادنی کی طرف بے باک نظروں سے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "میں بھانٹا ہوا آیا۔ اپنا ہاتھ یہاں رکھو۔ دکھو۔" اس نے بے تکلفی سے رسم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دھک دھک کرتے سینے پر رکھ لیا۔

رسم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تم کا کان کھینچنے۔" وہ کھٹکھٹائی اور رسم پر لدی گئی۔ وہ اپنے سراپا کی تاد کاری سے بکسرے خبر تھی۔ اس کے اوڑھے بال رسم کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔

رسم نیم دراز تھا، اب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ویجھو۔ میں تم کے لئے کیا لایا؟"

زخمی نے کہا اور ایک دروازا کھلیز۔ میں پہلی ہوئی کوئی شے رسم کی طرف بڑھائی۔ اشارہ ہی کی طرح ایک مقامی بھیل تھا اور بہت کم نظر آتا تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں سے لے آئی تھی یا کسی کی چھابڑی سے اٹھائی تھی۔ یہاں کوئی بھی کسی گارڈ کو روکنا نہیں تھا۔

"کیوں لائی ہو؟"

"تم مجھ کو آچھا لگتا۔ میں تم کو دیکھنا چاہتا۔ تم جب رینگھو کہ مارتا کھوہ کو بڑا آچھا لگتا۔ تم بڑا

زور والا۔" اس نے رستم کے بازو کے مسل چبھتے ہوئے۔

یہ وہی بازو تھا جس کا کندھا زخمی تھا۔ رستم تڑپ گیا۔ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ "ہائے اللہ۔ ہائے اللہ۔" وہ پکارا بھئی۔ پھر اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ رستم کے کندھے کی پٹی پر رکھے اور دو تین بار آہستہ سے اسے چوما۔ اس کا انداز پکا نہ تھا۔

اسی دوران میں اس بھی آنکھیں ملتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ "یہ آفت یہاں کیا کر رہی ہے؟" اس نے کہا۔

زری ابھی تک رستم کا رزم ڈکھنے پر پریشان تھی۔ اس نے مقامی انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو کراس کر کے اپنے کانوں کو لگا دیا۔ یعنی دایاں ہاتھ بائیں کان کو اور دایاں کان کو۔ "مجھے سے غلطی ہوا۔ میں تم سے مافی تھا۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔" رستم نے اسے تسلی دی۔

"میں ساری (جی) کہتا ہوں۔ پھر ایسا نہیں کروں گا۔"

رستم مسکرایا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تو تیار رہنا چاہی گواہ ہے۔"

رستم کے مسکرانے سے وہ بھی مکمل گئی۔ رستم کو اس نے اشارے سے بتایا کہ یہ بہت معصوم ہے۔ اس کی کسی بات کا اثر نہ مانا۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اس کی بیوی اسے آواز دی دینے لگی۔

زری ایک بار پھر رستم کے کمرے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ رستم نے اس سے پوچھا کہ کل شام جب "نے مان" نے نکلنا ہی سے اس پر حملہ کرنا چاہا تو وہ اچانک وہاں کیسے پہنچ گئی۔ زری کے چہرے پر شرم کا سرخ رنگ لہرا گیا۔ وہ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم بولی۔ "میں وہاں پہلے سے تھا۔ تم دو کہتا۔ تم وہاں بیٹھا آ چھا لگتا۔"

اب بات رستم کی سمجھ میں آئی تھی۔ یہ سیر پھری لڑکی رستم کے پیچھے یہ پیچھے وہاں آئی تھی اور کسی درخت کی اوٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے "نے مان" کو دیکھا۔ جو کھانا زری سونت کر عقب سے رستم کی طرف بڑھا تھا۔ زری نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور بھاگ کر اس سے چپٹ گئی۔ یہ بڑا زامانی واقعہ تھا۔

"تم کسی لڑکی ہو۔ میری سمجھ میں آتے ہیں۔"

"میں بہت آچھا ہوں۔ تم بھی بہت آچھا۔ تمہارا ہمالیہ۔۔۔ بھی کتنا شکاری۔"

"شکاری؟ کیا مطلب؟"

"شکاری۔۔۔ شکاری۔۔۔ مطلب آچھا۔" اس نے رستم کو سمجھانا چاہا اور بے تکلفی سے

رستم کے بالوں میں اٹھکایا پھیریں۔

اسی دوران میں وہ اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رستم نے زری کا ہاتھ جلدی سے پیچھے پٹا دیا۔ اس انداز آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں گرم گرم قبوے کی پٹیائی تھی۔ وہ زری سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اچھا تم جاؤ۔ ہمیں بات کرنی ہے۔"

وہ متذبذب نظر آتی تھی جیسے چائنا چادری ہو۔ اس نے دوبارہ کہا تو اسے اٹھ کر جانا پڑا۔ لیکن چند ہی سیکنڈ بعد وہ پھر سے بھاگی ہوئی آئی اور الٹ الٹ کر بولی۔ "یہ تم کے لئے۔ میں بھول گیا۔"

اس نے کپڑے میں لپٹے ہوئے پھل رستم کے سامنے رکھ دیے اور شرمائے ہوئے انداز میں باہر چلی گئی۔ اس بڑے غور سے اپنی جیبی کے چیرے کا آثار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس نے جانے لے بعد وہ ہمیشہ سے زیادہ اس نظر آنے لگا۔ رستم کو مخاطب کرنے لگا۔ "تم نے زری کے سامنے مجھے اس کا چاچا کہا۔ آئندہ نہیں کہنا۔ دراصل زری شروع سے ہی بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ یہاں آکر یہ چار پانچ سال ہم سے دور رہی۔ اس دوری سے یہ اور بھی بدل گئی۔ اب یہ گارنی بن گئی ہے اور گارنی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف آجوبک کی امانت ہوتی ہے۔ زری بھی قریباً بھول ہی چکی ہے کہ وہ ہماری جیبی ہے۔ وہ ہمیں چاچا جی کہتی ہے لیکن ایسے ہی جیسے اور بہت سے لوگوں کو کہتی ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ اس کا لمس کرے۔ ہم سو۔۔۔ اسے بہت دیر زندہ نہیں رہتا ہے۔ شاید ایک یا دو سال۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے وہ اس کی آواز بھڑائی۔

رستم نے کہا۔ "کیا اسے بھی یہ سب کچھ معلوم ہے؟"

وہ اس نے اثبات سے سر ہلایا۔ "بچپن سے ہی گارنیوں کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ہیجینٹ چڑھا لے جانے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ ہمیں میں نے ان پر زہمی عورتوں کے بارے میں بتایا تھا جو عماریاں کہلاتی ہیں اور عورتوں کا علاج معالجہ کرتی ہیں۔ یہ زہنی میں بھی عورتوں کی مدد کرتی ہیں۔ یہ عماریاں عورتیں بڑے بچے عقیدے کی مالک ہیں۔ یہی ہیں اور ان کا فارغ وقت ہو چاہا تو میں میں گزارتا ہے۔ یہی عورتیں گارنی لڑکیوں کی پرورش کرتی ہیں۔ وہ شروع سے ہی ان کے دماغ میں بھڑا دیتی ہیں کہ آجوبک پر قربان ہونے کے بعد وہ دوسری دنیا میں بہت ہی خوشیاں پاسیں گی اور ان کی زندگی رنگ کے قابل ہوگی۔ ہا۔۔۔ ہر گارنی کی شادی ایک ایسے خوش گھل نو جوان سے ہوگی جس کے سر پر سورج کی کرنوں کا تاج ہوگا اور جو ایک چھوٹی سی سلطنت کا راجا ہوگا۔ وہ انہیں اپنی خوشیاں دے گا کہ اگر وہ

خوشیاں برف کی طرح پہاڑوں پر بچھا دی جائیں تو ساری دنیا کے پہاڑ چھپ جائیں۔" وہ اس کا لہجہ پاس "کلیئر تھا۔

"کیا ابھی ایسا ہی سوچتی ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"وہ شاید کچھ سوچتی ہی نہیں ہے۔ اس کا دماغ ایک سادہ فطرتی کی طرح ہو گیا ہے۔ یوڈھی جہازوں کی ہر جہاز پر ایک چھوٹی بچی کی طرح عمل کرتی ہے۔ اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دوسری گارنیوں کی طرح سارا دن گلی کوچوں میں چوکڑیاں بھرے اور رات کو عبادت گاہ میں جا کر جہازوں کے ساتھ سو جائے۔"

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ اس کا تم نہیں جانے کہ تمہاری اس پیاری سی معصوم بچہ کی جان بچ جائے۔ یہ یہاں سے نکل سکے۔ اس کی واقعی شادی ہو..... بچے ہوں۔ یہ اپنی زندگی جی سکے؟"

"کیوں نہیں جانتا لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں حتمی اور شکست تھی۔ "تم دل سے چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تم قیدی نہیں ہو۔ یہاں کے آزاد باشندے ہو۔ تم کوشش کرو تو تمہارے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکل سکتی ہے۔ لیکن نہ کہیں راستہ مل سکتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے۔"

وہ اس نے دیوار سے ٹک لگا کر گہری نظروں سے رستم کو دیکھا۔ کمرے میں داخل ہونے والی صبح کی روشنی رستم کے دائیں رخسار کو روشن کر رہی تھی۔ برف زار پر نمودار ہونے والے سورج کی سنہری کرنیں اس کے لمبے بالوں اور چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی میں سرسرا رہی تھیں۔ آنکھوں میں ایک نامعلوم یک تھی۔ وہ اس نے کہا۔ "تمہاری باتوں میں حوصلہ ہے اور امید ہے۔ ایسی باتیں میں نے یہاں پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنی۔ مجھے لگتا ہے کہ....." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"کیا لگتا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارا کوئی بہت پیارا اس برف کے بارے میں ہے۔ اس کی کشش جہیں ہر وقت بے چین رہ سکتی ہے، اپنی طرف متوجہ ہے۔ شاید یہ کشش جہیں کسی وقت یہاں سے نکال لی لے جائے۔ آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو دو چار سال بعد یا پھر پانچ دس سال بعد۔"

"نہیں..... اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔" رستم نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔

"تم نے ابھی تک اپنے باطن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ہمارا در شریف نے

تایا ہے۔" وہ اس نے گلہ کیا۔

"اس سے تمہیں یا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ اس۔ کیوں نہ ہو وہ باتیں کریں جن سے ہم دونوں کو کچھ فائدہ ہو۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ یہاں سے نکلنے کا کیا حیلہ ہو سکتا ہے۔ ہماری پہلی دو کوششوں میں کیا غامی تھی جس کی وجہ سے ہم ناکام ہوئے۔ آئندہ کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ آخر تمہیں یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ گزار دیا ہے۔ وہ اس۔ تم یہاں کے اندرونی معاملوں سے ابھی طرح واقف ہو۔ اگر تم کوشش کرو تو مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ نہ صرف خود بلکہ تمہیں اور زری کو بھی نکال سکتے ہیں۔"

"نہیں بھئی! مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں۔" وہ اس نے بے قراری سے نلی میں سر ہلایا۔ "میں اپنے اور اپنی بیوی کے لئے اس کی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ نہ ہی تمہیں اس طرح کا مشورہ دوں گا۔ تیسری بار شرم خان تمہیں معاف نہیں کرے گا۔"

"شرم خان خدا نہیں ہے وہ اس اور نہ ہی یہ جگہ کالا پانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم شرم خان سے زیادہ سمجھ دار اور بات چیر شخص ہو۔ تمہارے پاس علم کی روشنی ہے۔ ان لوگوں کے پاس بس اندھے عقیدے ہیں اور وہم کی پوچھا پٹ ہے۔"

رستم دیر تک وہ اس سے عجیب گفتگو رہا۔ اس نے وہ اس کی ہر بات کا جواب دیکھ لیا۔ رستم کو انداز ہو رہا تھا کہ وہ اس بھی دل سے یہ بات مانتا ہے کہ اگر ایک منظم کوشش کی جائے تو اس سے علاقے سے نکلنا ناممکن نہیں ہے۔ دوسری بات رستم نے یہ محسوس کی کہ وہ زری کو اس لئے زور ناک انہدام سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زری نو عمری کی موت سے بچے اور آزاد دنیا میں سانس لے۔

شام کو زری پھر اٹھی۔ وہ اس کے پاس آتی پھر اپنی مار کر بیٹھ گئی اور اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتی رہی۔ رستم کی ذرا سی شہ پر وہ اس کے بستر میں گھس آئی۔ اس نے دیوی مادے سے اعلان کیا۔ "میں آج تمہارے پاس..... سوؤں گا۔"

اس کی چاہتی تے اسے ڈانٹ کر زری اس ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ چاہیے نے اسے رستم کے بستر سے نکلنے کا حکم دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو چمک گئے۔

رستم نے اسے پکھارا۔ "چلو چلو..... بیٹھی رہو۔"

اس کے آنسو سکرانے لگے۔ وہ جتنی جلدی تمکین ہوتی تھی اتنی ہی جلدی خوش بھی

ہو جاتی تھی۔ اسے رچھہ کی لڑائی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ رستم سے رچھہ کی لڑائی کے بارے میں باتیں کرنے لگی اور پوچھنے لگی کہ وہ اسے زور والے جانور کو کس طرح پھینکا لیتا ہے۔ رستم نے اسے مناسب جواب دیئے۔ پھر اس کی ذہنی زور دوسری طرف چلی گئی۔ وہ بچے کی طرح پھلنے لگی کہ رستم اپنی صمدی (جینٹ) بٹا کر اسے اپنا جسم دکھائے۔ چانچی دوسرے کمرے میں تھی۔

”نہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔“ رستم نے اسے نواہ۔

”نہیں۔ یہ اچھا بات۔۔۔ یہ عورتوں کے لئے اچھا بات نہیں۔ تم کے لئے آجیما بات۔“ وہ اسے گلو گھانے لگی اور صمدی ہانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بار پھر وہی ہوا جو صبح ہوا تھا۔ رستم کے کندھے کا زخم دکھ گیا۔

رستم کے تاثرات دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ صبح کی طرح اس نے بے ساختہ دو تین بار رستم کا کندھا چا اور اپنے ہاتھوں کو کراس کر کے کانوں کو لگایا۔ ”میں باقی مانگتا۔ میں غلطی کرتا۔“

”پھر سامنی مانگتا۔ پھر غلطی کرتا۔“ رستم نے کہا جیسے اس کی نقل اتاری۔ اسے میں اس تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی زری گھبرا گئی کی طرح پھدک کر باہر نکل گئی۔

”اس کے چہرے پر بے جا تاثرات تھے۔ وہ بولا۔“ عورت واقعی خدا کی جڑ ہوتی ہے۔ کسی نے سوچا بھی تھا کہ یہاں پاؤں نہ جی میں بھی ایسا ہوگا۔“

”کیا ہوا؟“ رستم نے پوچھا۔

”آج پھر ارفا خان اور سامی خان کے حقیقہ میں لکھاڑی چلی ہے۔ ایک بندہ جہان سے گیا ہے۔ ایک کا بازو کٹ گیا ہے۔ وہ سخت ڈری ہے۔“

”اس انٹیکس سے قریب جیٹہ کر رستم کو اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ اس نے کہا۔ کچھ لوگوں کو شک ہے کہ سامی خان پر آنے والی آفت کی اصل وجہ ارفا خان ہی ہے۔ ارفا نے ہی خفیہ جگہ پر لیز کی ڈاکٹر کا کھونٹ لگا دیا اور بعد میں اسے جان کی امان دے کر اور سامی کے خلاف پٹی بڑھا کر شتم خان کے پاس بھیجا۔“

رستم نہا موٹی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں رستم نے بڑبڑاتا انداز میں کہا۔ ”اس مجھے بتاؤ، کیا اس صورت حال میں ہمارے لئے بھڑی کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟“

”اس نے چونگی ہوئی گھبراہٹ سے رستم کو دیکھا اور پھر جسکا کر خاموشی سے کچھ سوچنے

لگا۔ رستم بڑے صبر سے انتظار کرتا رہا۔ انٹیکس میں چلتی ہوئی آگ خوش نما معلوم ہوتی تھی۔ باہر برفانی ہوا چل رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں اس کی بیوی بیٹا کھانے کے سہارے ٹھک ٹھک چل رہی تھی اور ستائی لوگوں کی مرغوب غذا گوشت پلاؤ پکا رہی تھی۔ اس حریفار پلاؤ میں عموماً IBEX یعنی برفانی بکرے یا SNOW COCK یعنی برفانی مرغ کا گوشت استعمال ہوتا تھا۔

کافی دیر بعد اذہر عمر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا۔ ”یہاں پاؤں نہوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل نیا اور اُن دیکھا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی اصل طاقت ہی ان کا باہمی اتفاق ہے۔ جو ارفا اور سامی کی لڑائی کے بعد ٹوٹا چھوٹا نظر آ رہا ہے۔“

”میرے خیال میں اسے اتفاق کے بجائے گٹھ جوڑ کہنا چاہیے کیونکہ یہ بُرے لوگوں کا ایک ہے اور غلط کاموں کے لئے ہے۔“

”اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔“ یہاں کے لوگ شتم خاندان کے افراد کو بہت پادرس اور نیکو کار سمجھتے رہے ہیں لیکن کچھ لوگوں کے دلوں میں تھوڑے بہت شکوک و شبہات بھی موجود تھے۔ اب سامی خان اور ارفا کی وجہ سے یہ شکوک بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور میرے خیال میں یہ شتم خان کے لئے بہت بڑا دھچکا ہے۔ اگر اس موقع پر یہ میٹل پسندی والا معاملہ تھوڑا سا اور اچھل گیا تو شتم خان کے لئے یہاں کے امن سکون و برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔“

”میرے خیال میں اسے دشمن کو کھڑ کرنا، ہارنے والے کا حق ہوتا ہے۔“

”اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور رستم کی بات کی گہرائی میں جھانکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔“ جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہا ہوں، یہ تمہیں عجیب لگے گی۔ شاید تم کھنکھ میں غلط جانی کر رہا ہوں یا ماسالے سے کام لے رہا ہوں لیکن یہ سو فیصد حقیقت ہے۔ ہاں تم اسے حیران کرنے والی حقیقت کہہ سکتے ہو۔“

رستم سوا پیروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ آگ کی روشنی اس کی پیشانی پر منعکس ہو رہی تھی اور اس کے شیم سفید بالوں کا رنگ تبدیل کر رہی تھی۔

”شتم یہاں کا ملک ہے۔ اس کی پارسائی اور نیکو کاری پر کسی کو شبہ نہیں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”شتم کی بیوی اس وقت مری تھی جب شتم کی عمر صرف تیس بیستیس سال تھی۔ لوگ جانتے ہیں کہ اس کے بعد سے عورت شتم کی زندگی سے نکل گئی ہے۔ وہ کسی عورت کی

طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور نہ کسی طرح کی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن۔۔۔

”شوتم کے اندر عورت کے لئے جتنی ترپ ہے وہ بہت کم لوگوں میں ہوگی۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں اسے بتاؤں کہ آدم کا یہ ساٹھ سالہ چٹا حوا کی بیٹی کے لئے کتنا ترستا ہے۔“

رستم غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ دور مشرقی ٹیلوں کے عقب سے پوری رات کا چاند آہستہ آہستہ کی سنہری غبار سے کی طرح فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”شوتم خان کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہو اور جو بات میں تمہیں اب بتانے کا وہ دن تمہیں اور بھی عجیب لگے گی۔“ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ”شوتم خان۔۔۔ تقریباً ہر مہینے چند عورتوں کے لئے ایک خاص قسم کی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی بچاؤی حالت ہوتی ہے۔ ان دنوں میں شوتم خان خود کو عام لوگوں سے بالکل الگ کر لیتا ہے۔ ان دنوں میں وہ عورت سے ملنا تو کبھی اس کو دیکھنے یا اس کی آواز سننے سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں بچ رہے، لیکن میں جانتا ہوں ان دنوں میں وہ ایک شیشہ ہوتا ہے جو جوان عورت کے سانسوں کی خوشبو سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔“

اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر پھینکتے چاند کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرے خیال میں شوتم خان کی خاص کیفیت کے وہ خاص دن شروع ہونے والے ہیں۔“ اس کا لہجہ بھی خیر تھا۔

شوتم کی خاص کیفیت والی بات رستم کی مجھ میں پوری طرح تو لپٹ آئی لیکن وہ کچھ نہ کچھ سمجھ گیا۔ مترجم اس نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھار نالہ بھی ہو جاتا ہوگا لیکن عام طور پر مہینے میں کم از کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا ہے۔ عام طور پر جب چاند جون پر آنے کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے تو شوتم کے اندر یہ تبدیلی تدریجاً پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دو روز کے اندر ہی وہ چار پانچ دن کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔“

”کہاں غائب ہو جاتا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”اگیارہ سے میں۔۔۔ مقامی زبان میں اگیارہ چلکنا کے لئے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ شوتم خان کے گھر کے چھکڑاڑے تم سے سفید چٹروں کی وہ چار دیواری دیکھی ہوگی جس کے اندر چٹری دیواروں میں دو بڑے بڑے چھوٹے ہیں۔ یہاں آجوک کا ایک پرانا درخت بھی ہے۔“

رستم نے انہات میں سر ہلایا۔

”یہی اگیارہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس چار دیواری کا دروازہ بھی بہت پرانا ہے۔“

یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ دروازہ تین ہزار سال پہلے آجوک کی کھڑکی سے بنا ہے جن دنوں شوتم خان اگیارہ سے نکل محمد دور رہتا ہے، یہ دروازہ بھی اندر سے بند رہتا ہے۔ کوئی اگیارہ سے میں آچا نہیں سکتا۔“

”شوتم کو کھانا وغیرہ کیسے پہنچاتا ہے؟“

”کھانے کی چیزیں چار دیواری کے اندر ہی موجود ہوتی ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں شوتم خان بہت ہلکا بھلا کھاتا تھا ہے۔ عام طور پر یہ خشک راتیں ہی ہوتا ہے۔ مثلاً پھنے ہوئے پاول بیکری یا ستورو۔“

”واقعی یہ حیران کن ہی بات ہے۔ کیا شوتم خاندان کے کسی اور فرد کے ساتھ بھی یہ مسئلہ ہے؟“

”اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ کم از کم میرے علم کے مطابق تو ایسا نہیں۔ شوتم خاندان کے اکثر مرد بڑے پرہیزگار اور حق امت پندہ رکھتے جاتے ہیں اور شوتم کے اس مسئلے کے بارے میں ابھی صرف اور صرف چند غریب لوگ جانتے ہیں یہ مسئلہ ایک بیماری کی طرح پھیلے پندرہ بیس سالوں سے شوتم خان کے ساتھ موجود ہے۔“

”جب چار پانچ دن کے بعد شوتم اپنی پناہ گاہ سے باہر آتا ہے تو اس کے کیا طور احوال ہوتے ہیں؟“

”وہ بالکل عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے۔ بے حد ہنس مکھ۔ بہت گہرا اور اسٹیل کی طرح سخت۔“

”اسٹیل کی طرح سخت! کیا مطلب؟“ رستم نے پوچھا۔

”تم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے ہانے ہوئے قانون کا عدسہ کا کتنا پابند ہے۔ اپنے قیدی کی پرانی روائیوں کے مطابق جو گھوڑیں اس نے کبھی ہونی ہیں ان میں سے ایک اٹھا لے جائے گا مطلب اپنی اپنی موت کو دعوت دیتا ہے۔ تم نے دیکھا اس نے اپنے نئے بیٹے کو بھی نہیں بخشا۔ اس کا بازو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیا اور ایسا کرنے کے اس کے پاس دینی راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ایسے ہی جرم پر ہلکا اس سے ٹکے جرم پر بھی کئی لوگوں کے بازو کاٹ چکا ہے۔ ابھی پچھلے سال انہی دنوں میں اٹھارہ انیس سال کے ایک لڑکے نے اپنی جان باری ہے۔ وہ شوتم گھرانے کی ایک لڑکی سے بیاہ کر لے گا تھا۔ تو عمری کی بیاہ تھا اور۔۔۔ مزور۔ لڑکے کا باپ کسی کا کھانا پیتا شخص تھا۔ اس کے پاس بکریوں کے تین بڑے روپڑے تھے اور بہت سی قیمتی کھانسیں۔ اس نے لڑکے کی دیوانگی دیکھی تو سمجھ گیا کہ اس کی جان بلی

جائے گی۔ اس نے لڑکے کو پیٹ لے کر وہ ماہ تک ایک کمرے میں بند رکھا پھر مقامی رواج کے مطابق اس کی شادی ایک پانچ عمر کی عورت سے کر دی۔ لڑکے کی بد قسمتی کا اپنی شادی کی رات وہ اپنی بیوی کے پاس جانے کے بجائے اس لڑکی کے پاس جا پہنچا۔ رکھوالی کے کتوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ مقامی دستور کے مطابق اس کی سزا موت تھی۔ لڑکے کے باپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح بچے کی جان بچ جائے۔ اس نے اپنے سارے مال موٹیوں پر جانے کے طور پر دینے کی پیشکش بھی کر دی لیکن شوق خان کا فیصلہ اٹل رہا۔ کلباز سے لڑکے کی گردن اڑا دی گئی۔

”اور وہ لڑکی؟“

”لڑکی اس واقعے کے بعد صرف آٹھ دس دن ہی زندہ رہی۔ جس دن لڑکے کی موت کے لئے اس کے گھر میں“ تیسری عبادت“ ہو رہی تھی لڑکی نے کانچ کی بہت سی چوڑیاں پھین کر نگل لیں اور وہ بھی۔ برف کے نیچے چلی گئی۔“

”ستم نے ایک گری سانس لی۔“ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟“

”یہ ظلم دوسروں پر تو ہے ہی۔ اپنے آپ پر بھی ہے۔ جب بندہ قدرت کے قانون تو ذکر اپنے قانون نکالتا ہے تو پھر بھی کچھ ہوتا ہے۔ بڑی عمر کی دہنوں سے شادی کرنے کا رواج اس قبیلے میں بہت پرانا ہے۔ اصل میں یہ پابندی صرف سردار خاندان کے لئے ہوتی ہے لیکن سردار خاندان کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی جو زیادہ پرہیزگار بننا چاہتے ہیں، یہ رسم اپناتے لیتے ہیں۔ ایسی شادیوں کا انعام عید مانا جاتا ہے کہ مرد و جوان سالی میں ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ یہاں جو لوگ زیادہ مذہبی بنتے ہیں وہ دوسری شادی کو بھی عیاشی گرا دیتے ہیں۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ مرد کی نرینہ اولاد موجود ہو یہ سب کچھ فطرت کے خلاف چلتا ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ رستم نے اطمینان میں سر ہلایا۔ ”اب سردار شوق خان کو ہی دیکھا جائے، وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی اچھا خاصا صحت مند ہے۔ خوب ڈنٹ کر کھاتا پیتا بھی ہے۔ آرام بچھن کی زندگی گزارتا ہے۔ پھر ساری نفس کشی اور دودھ پٹی صرف عورت کے سطلے میں ہی روٹی ہے؟“

”جس جو رسم و رواج صدیوں پرانے ہوتے ہیں انہیں کوئی ختم کرنا نہیں چاہتا اور اگر چاہے بھی تو اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔“

”کیا شوق جیسے لوگوں کا رہنما ہونا توڑنے کی کوشش بھی یہاں کی جاتی ہے؟“ رستم نے

دریافت کیا۔

”جہاں رہن سہن ہوگا وہاں اس طرح کی کوششیں تو ہوتی ہیں لیکن ایسے لوگ اپنے ارادوں میں بڑے کڑھوتے ہیں اور میرے خیال میں سب سے بڑا کڑھوتا شوق خان خود ہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے جب شوق خان زیادہ صحت مند اور خور و تھا اس پر کئی ”زبانہ جلتے“ ہوئے تھے۔ شوق گھرانے کی ہی ایک جواں سال عورت دل و جان سے شوق پر فدا ہوتی تھی اور اس نے بنیاد توڑ کھانچ کر اپنی جان تک اپنے لیے کی کوشش کی تھی مگر یہ پتھر سے مس نہیں ہوا۔ پھر شوق خان کی آنچلی بیوی کی چھوٹی بہن جو کافی خوب صورت تھی، دو تین برس اس چکر میں رہی کہ شوق خان سے شادی کر کے سرداری بن جائے۔ سنا ہے کہ شوق خان بھی قصوراً بہت اس کی طرف متوجہ ہوا تھا لیکن شوق کے کڑھپن کی وجہ سے یہ تیل بھی منڈھے نہیں چڑھی۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کئی عورتیں اس ”قفلے“ پر کندہ چبھتی رہیں لیکن کامیاب کوئی نہیں ہوئی اور اب کچھ برسوں سے تو شوق اس معاملے میں بے حد سخت ہو چکا ہے۔ کوئی عورت اس کی طرف مائل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”اس لحاظ سے تو تمہاری یہ“ خاص کیفیت“ والی معلومات بڑی فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا تم واقعی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ ان خاص دنوں میں عورت، شوق خان کو زبردستی کر سکتی؟“

”اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ تم میرے سامنے بیٹھو ہو اور اس آئینے میں چلی ہوئی آج گرم ہے۔“ وہ اس نے افغانی قبوے کی چٹکی لپٹے ہوئے کہا۔ ”پچھلے دو تین سال میں، میں شوق کو بہت قریب سے جاننے لگا ہوں۔ وہ اندر سے بہت گہرا اور بے حد مضبوط شخص ہے لیکن کہتے ہیں ناں کہ مضبوط سے مضبوط گروہ اندر بھی کوئی ایک ٹل ایسا ہوتا ہے۔ جو ٹل جائے تو ساری گروہ کزور ہو کر ٹل جاتی ہے۔ شوق کی نہایت مضبوط اور سخت گروہ کا کزور شوق ہی ہے جو میں نے نہیں بتایا ہے۔ اگر کوئی کسی طرح وہ ٹل کھول دے تو شوق کے لئے خود ہر سینا بہت مشکل ہو جائے گا۔“

”رستم نے گہری نظروں سے داس کا بازو دیکھ لیتے ہوئے پوچھا۔“ تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن دنوں شوق نے خود کو دوسروں سے علیحدہ کر کے اکیلا رہنے کی پیادہ روٹی تک محدود کر رکھا ہو اس تک کوئی عورت نہ پہنچا دی جائے۔“

”اور یہ آسان کام نہیں ہے۔“ وہ اس نے خالی خالی نظروں سے الٹیں کو گھورا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو چاہا؟“

”سب سے پہلے تو اس جواں سال خوش حال عورت کا ملنا ہے جو یہ دسک لینے کے لئے تیار ہو۔ پھر ایک اہم سوال یہ کہ اس عورت کو چاندیواری کے اندر کیسے پہنایا جائے؟“

رستم نے سادار سے تجویز پیش کی میں اندھا اور کڑکی سے باہر برقی ہوا کے بہاؤ پر ایک نگاہ ڈال کر بولا۔ ”فرض کرو اس، ہم یہ دونوں کام کرنے کا میاب ہو جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ ضروری ہے کہ سب کچھ دیباہی ہو جیسا ہم نے سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا شتم خان صبح اپنا برہمچارہ توڑ کر اس عورت کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر ہو جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو ہمارے دماغوں میں آ رہا ہے؟“

”تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ سارا کام میری مرضی کے مطابق ہوا تو اس بات کا پانچ فیصد امکان بھی نہیں کہ شتم خان کا سارا دفاع درہم برہم نہ ہو اور وہ اپنے برہمچارہ پر قائم رہ سکے۔ جہاں تک اس سے آگے کے معاملے کا سوال ہے تو میرے خیال میں تم بھی صورت حال کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ قبیلے کے لوگ شتم خاندان کے افراد کو اپنے دل و دماغ میں بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔ رہنے کے اس ”صاف شفاف شے“ میں ایک تیرہ تو صاحب زادہ ساسی خان کی حرکت کی وجہ سے پڑی ہے، اگر دوسری تیرہ خود شتم خان کی وجہ سے پڑی تو بہت کچھ پھٹکا پھوڑ ہو جائے گا۔“

”ساسی خان اب کس حال میں ہے؟“ رستم نے دریافت کیا۔

”وہ بندی خانے میں ہے۔ اسے اب غویل سزا کا ٹاپا پڑے گی۔ مجھے پتا ہے اس سزا میں ایک دن کی رعایت بھی نہیں ہوگی۔ پورے چار سال اسے تالے کے پیچھے رہنا ہوگا۔ اس کا زخم بھی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہو رہا۔ روزانہ مزہم پنی ہو رہی ہے۔ ساسی خان جیسے شخص کا پھسلنا آسمان نہیں تھا لیکن اس کے اندر دلی ہوتی منہ زور خواہشوں نے اسے پھلسا دیا۔“

”ڈاکٹر مالینا کس حال میں ہے؟“

”سر راز زادہ نے اس کے ساتھ تعلق قائم کر لیا تھا اس لئے اب اسے قتل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کوئی سزا دی جاسکتی ہے۔ وہ سر راز خاندان کے ایک فرد کی طرح غلیظہ گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ اگر اس سے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی باموت کا فیصلہ بھی آہک (دیوتا) کے منشا سے ہوگا۔ قدیم روایت کے مطابق نومولود بچے کو پون بجی کے گول پتھر پر لٹایا جاتا ہے۔ اس بچے کو گرم پتھروں میں لپیٹ کر چن بچن کے حجر سمیت دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اگر بچہ رات بھر سردی اور جنگلی جانوروں کے

نچوں سے بھارا ہوا تو سمجھا جاتا ہے کہ آہک نے اسے واپس لوٹا دیا ہے۔ دوسری صورت میں جانا جاتا ہے کہ آہک نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ صبح بچے کی ماں جاتی ہے اور شک آہک کے سنے کے پاس سے بچے کو زندہ یا مردہ حالت میں اٹھا لاتی ہے۔“

”بڑا بے رحم طریقہ ہے۔“ رستم نے تاسف ظاہر کیا۔

”لیکن یہ توجہ ہوگا جب ڈاکٹر امید سے ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہے۔ اگر ہوتا تو ہماریاں اسے آزادی سے کھوٹنے بھرنے نہ دیتیں۔“

”کیا وہ آزادی سے محروم پھر سکتی ہے؟“

”مکمل آزادی تو اسے نہیں ہے لیکن ہستی کے اندرون کے وقت وہ چل بھر لیتی ہے۔ دو تین دفعہ تو یہاں میرے گھر تک بھی آ چکی ہے۔ وہ جس جگہ رہ رہی ہے وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں، صرف دو تین منٹ کا راستہ ہے۔ لگتا اس سے کچھ کم اور شاہی میں جنہیں بتانا بھول گیا۔ پانچ چھ دن پہلے تو اس نے حدی کر دی تھی۔ شام کے بعد چھوٹی جھیل کی طرف چلی گئی۔ جنہیں پتا ہی ہے یہ جگہ کتنی کے بالکل جنوبی کنارے پر ہے۔ وہ اپنے گھر سے قریب آدھ گاؤں کے نکل آئی تھی۔ ان فاصلوں نے اسے پکڑ لیا اور واپس گھر لے آئے۔ اس نے کہا کہ اسے کچھ پتا نہیں، وہ کیسے جھیل تک پہنچی ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ اب معلوم نہیں اس نے اپنی جان چھڑانے کے لئے کہاں بنایا یا اسے واقعی نیند میں چلنے کی تیاری ہے۔“

”اس نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا جیسے اسے تصدیق چاہ رہا ہو۔ رستم نے کہا۔“مجھے اس بار سے میں زیادہ پتا نہیں لیکن ایسا ہوتا ناممکن بھی نہیں۔ جنہیں پتا ہی ہے کہ یہ یورجن لوگ شراب وغیرہ پیتے ہیں اور نشے میں دھت ہو کر سوتے ہیں۔ نیند میں بھی ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں۔“

”اس نے پُر سوچ انداز میں کہا۔“دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر مالینا واقعی نیند میں جاتی ہے یا پھر اس نے اپنے کسی ”پرگرام“ کو چھپانے کے لئے کہاں بنایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے یا کچھ قیدیوں کی طرح اس پر فیضانے پورے نکلنے کے لئے کسی راستے کا جائزہ لے رہی ہو۔ ویسے یہ بات ماننا پڑے گی کہ وہ ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اگر ہوشیار نہ ہوتی تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتی۔“

”کھانا تیار ہو چکا تھا۔ چار دیواری میں پلاؤ اور افروٹ کے حلوے کی اشتہا انگیز خوشبو نکلتی ہوئی تھی۔“ اس کی بیوی انہیں کی دفعہ پکار چکی تھی۔ آخر انہیں دوسرے کمرے میں جا کر

کھانا کھانے کے لئے اٹھنا پڑا۔

اگلے روز صبح سویرے سے ہی زری نے اس کے گھر کے گرد منڈانا شروع کر دیا۔ اس مسلسل گھر میں تھا اس نے زری، رستم کے قریب نہیں آ سکی۔ ہستی میں بدستور تھاکو کی کیفیت تھی۔ کل ہونے والے ہنگامے کے بعد پھر اندیش خاموشی نے ہستی کے کلی کوچوں اور کوہ کے طول و عرض میں پڑاؤ کر رکھا تھا۔ ویسے بھی سردی معمول سے زیادہ تھی۔ برف زار میں برفانی ہوائیں سنسنائی تھیں اور دو کہیں سے گاہ بے گاہ یہ ایک بے ہول آواز سنائی دیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ برفانی تودے ہیں جو ایک طوفانوں سے پھسل پھسل کر ایک آبی گزرگاہ میں گرتے ہیں اور آواز پیدا کرتے ہیں۔

ناشتے کے بعد وہ اس اور رستم ایک بار پھر غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ اس نے گزرتی کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا خیال ہے رستم؟ کیا ہم اس معاملے میں مالینا کو استعمال نہیں کر سکتے؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ اگیارے میں شوقی کی آزمائش کے لئے مالینا کو بھیجا جائے؟“

”میں صرف مشورے کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ اس جلدی سے بولا۔ ”ویسے میں بھی یہ جانتا ہوں کہ اس کام میں بہت ریسک ہے لیکن یہ بات ہے کہ مالینا ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اس کی خوبصورتی کسی بھی مرد کے لئے امتحان ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے رات کو بہت دیر تک سوچ بچار کی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق میں ایک ایسی راہ نکال سکتا ہوں کہ مالینا کو کوئی بھی دوسری صورت رازداری سے اگیارے میں پہنچ جائے۔“

”کیا کرو گے تم؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ شوق خان اگیارے میں جانے کے بعد اس کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھاتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس تین ہزار سال پرانے دروازے کی کنڈی کو باہر سے کیسے گرایا جاسکتا ہے۔ دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان جو درز ہے میں وہاں سے یہ کام کر سکتا ہوں۔“

”چلو، تو ایک طویلہ مسئلہ ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ مالینا یہ ریسک کیسے لے سکتی ہے۔ ابھی تو ساسی خان والا معاملہ بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے۔“

”مگر اس معاملے میں بھی مالینا کا کوئی قصور نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔ ”سب جاننے ہیں کہ جو کیا ساسی خان نے کیا۔ وہ مالینا کو کوئی راز دیا تو مالینا نے کیا کر لیا تھا۔ ساسی نے اس خوب صورت عورت کی جان بخشی کی اور اس کے بدلے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ خوب صورت

عورت کا قصور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ خوب صورت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس پر ایک سردی مرے، مگر مرد اس پر فریفتہ ہو سکتے ہیں۔“

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے پلو بولا۔ ”پلو فرض کر لیتے ہیں کہ مالینا کسی طرح اگیارے میں شوق خان کے پاس پہنچی مگر اور تہااری ریسرچ کے مطابق شوق خان نے وہی کچھ کیا جس کا تم نے قیافہ لگایا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”اس کے بعد مالینا شوق خان سے ملے گی۔ ہم دو چار ایسے گواہ تیار کھیں گے جو شوق خان کو مالینا کے ساتھ غیر حالت میں دیکھیں گے۔ اس کے بعد ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طوفان خود بخود اپنی راہ بنا لے گا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے وہ اس کی آواز مزید دھیمی اور خفیہ ہو گئی۔

”اس کے بعد کیا ہوگا؟ شوق خان پکڑا جائے گا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ کیا ہوا؟ شوق خان کہے گا کہ یہ لڑکی زبردستی میری تہااری میں گھسی ہے اور مجھے۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے جلدی سے نفی میں مڑ لایا۔ ”میں یہاں کے لوگوں کو بہت قریب سے جانتے لگا ہوں۔ اس واقعے کے بعد شوق کچھ بھی کہے گا، اس کی ایک نہیں سنی جائے گی۔ وہ مرد اور بونے کے باوجود سیدھا طور سے کہنے سے میں پہنچے گا۔ ساسی خان کے سابق اور خاص طور سے ساسی خان کے سسرالی پٹیلے کی بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دلچسپ اور کاردیں گے۔ چند لمحے تو قہر کے وہ اس نے گزرتی کی چند خند لئے اور بولا۔ ”تجربہ نہیں معلوم نہ ہو، ساسی خان کے سسر برق جان کا باباں بازو بھی کندھے سے کٹا ہوا ہے۔ یہ بازو بارہویہ سال پہلے شوق کے حکم پر اس دھت کا ناکیا جب برق جان پر ایک لدا لائی گئی تھی۔ وہاں سے دست دراز کی کا الزام لگا تھا۔“

”پھر کبھی اس کام میں مالینا کے لئے خطرے تو موجود ہیں۔ شوق تو مالینا کے پاس نہیں آئے گا۔ مالینا یہ چل کر شوق کے پاس پہنچے گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ اگیارے میں کیوں تھی۔ اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا؟“

”ایسے موقعوں پر عورت کی ہر دلیل کافی جاتی ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ شوق خان نے مجھے گمراہ کر دیا ہے۔ میرے پاس دیکھتے تو کہا تھا۔ اگیارے کا اندر سے نکلا دروازہ اس کی تصدیق کرے گا۔“

رستم کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ اس کے لیے بال بولے ہوئے ان کی پیشانی اور غور و فکر پر جمول رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے دماغی کندھوں کو

میں مالینا ان میاں بیوی سے ملنے آئی۔ اس گھر کی اندرونی دیواریں چتر اور دیوار کے تختوں کی تھیں۔ دھیمی آواز بھی ان دیواروں سے گراں ہو جاتی تھی۔ مالینا نے رستم اور اس کو ہلے سنا اور دروازے سے لگ کر سننے لگی۔ وہ اس پلانک کے بارے میں بہت کچھ پہچانی تھی اور اس کی پُر جوش رائے تھی کہ اس پر عمل کیا جائے۔

صورت حال ایک دم ہی ڈرامائی رخ اختیار کر گئی۔ رستم نے مالینا کے سامنے اپنے اندیشوں کا کھل کر اظہار کیا۔ وہ کسی اندیشے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رستم پر اندھا دھند اعتماد کرنے لگی ہے اور سمجھتی ہے کہ جس پلانک کو رستم قابل عمل جان رہا ہے وہ نہ تو قابل عمل ہوگی اور کامیاب بھی ہوگی۔

☆=====☆=====☆

ہولے پہلا ترابا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا: "کچھ بھی ہے اس الجھن لڑائی کا یہ طریقہ پسند نہیں۔ میں نے کبھی کسی سے دشمنی چکانے کے لئے عورت کو استعمال نہیں کیا۔ نہ ہی میں یہ چاہوں گا کہ اس جگہ سے نکلنے کے لئے ایک عورت کا سہارا لوں۔"

"رستم! میں جانتا ہوں کہ تم ایک بہادر شخص ہو۔ تم رستم کا زور توڑنے کے لئے جو سوچ بچار کر رہے ہو اس کی وجہ بزدلی نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یہ متوثر تو تم بہت دفعہ خدا ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ شاید یہ متوثر کسی ایسی ہی صورت حال کے لئے بنایا گیا ہوگا۔"

"لیکن اگر اس معاملے میں مالینا کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ اس کا مطلب تو پھر یہی لیا جائے گا کہ ہم نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک ایسی لڑائی کو چارے کے طور پر استعمال کیا جو یہاں پہلے ہی کافی نصیبتیں پھیل چکی ہے۔"

"مگر رستم! یہ صرف تمہاری اپنی آزادی کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ مالینا کی آزادی اور رہائی کا معاملہ بھی ہے اور وہ عورت ذات ہے۔ اس پاؤندہ ہستی سے اس کی رہائی تم تینوں کی رہائی سے بھی زیادہ اہم ہے۔"

"کچھ بھی ہے اس۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔"

ابھی رستم کا یہ فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر آ گیا۔ رستم اور اس نے چونک کر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ یہ مالینا تھی۔ وہ مقامی لباس میں تھی۔ مقامی انداز میں ہی اس نے اپنے سنہری بالوں کی لمبی لمبی مینڈیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ اس کے سر پر سپید چہرے پر تینوکی تاثرات تھے۔

"ڈاکٹر! تم یہاں؟" اس نے بے حد تعجب سے کہا۔

وہ بغیر آفر سے ہی ایک نشست پر بیٹھ گئی اور اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "تم باہم کو ماف کرنا۔ باہم تم کو سوری بولنا۔ باہم نے تم کا سارا باہم سننا۔ باہم ڈور کے چپے ہوتا۔" رستم اور اس نے ہونٹ سکڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مالینا کی نیکیوں میں آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "باہم نے سب سننا۔ باہم اب گری کرتا۔ باہم یہ کام کرنا نالگن۔ نہیں آئی دل ڈورس جاہ۔"

"تم نے کیا سنا ہے مالینا؟" رستم نے پوچھا۔

جواب میں مالینا نے اپنی لنگڑی اردو اور انگریزی میں اٹک اٹک کر وہ سب کچھ بتا دیا جو یہاں کہا گیا تھا۔ دراصل اس کی بیوی انہیں ناشتہ کھانے کے بعد پھر سو گئی تھی۔ اس دوران

پھر آئینے میں اپنا چائو لیا اور آئے والے حالات کے لئے تیار ہو گئی۔

کھڑکی میں سے ٹھہرتے ہوئے تارے آج نظر نہیں آ رہے تھے۔ مطلع صاف نہیں تھا۔ یہ اندھیرا اس کے لئے اچھا تھا۔ کھڑکی پر ایک سایہ سا لہرایا اور پھر وہ اس کی مدھم آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے، آ جاؤ۔“ اس نے یہ پتھر وانگریزی میں کہا تھا۔

مالینا نے ایک ٹکڑا واپٹی سوئی پڑی نگران پر ڈالی اور شال لپیٹ کر باہر نکل آئی۔ رات اپنے نصف کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ٹھیک سنسان تھیں اور برقانی ہوائے جیسے برتنے کو جھنڈ کر رکھا تھا۔ ”روستم کہاں ہے؟“ مالینا نے اس کے عتب میں چلتے چلتے سرگوشی میں کہا۔ وہ اس سے انگریزی میں بات کرتی تھی۔

”وہ میرے گھر میں ہی ہے اور تمہاری کامیابی کا ہم سب بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے ذرا توقف کیا پھر مالینا کی طرف جھکتے ہوئے مزید مدھم آواز میں بولا۔ ”روستم نے ایک بڑے سے بے کی بات کہی ہے اور یہ بات تمہارے ایک اہم سوال کا جواب بھی ہے۔“

”کون سا سوال؟“

”یہی کہ اگر فرض محال وہ سب کچھ نہ ہوا، جس کی ہم توقع کر رہے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ یعنی اگر فرض محال شوق خان تمہاری طرف متوجہ نہ ہوا اور اپنے برہمچار پر قائم رہا۔“

”روستم نے کیا کہا ہے؟“

”روستم نے کہا ہے کہ اس صورت میں تم ایک بڑے معقول بہانے کی آڑ لے سکتی ہو۔ وہی بہانہ جو تم نے کچھ عرصہ پہلے جھیل پر سے پکڑے جانے کے بعد بنایا تھا۔ تم نیند میں چلنے کا عذر کر سکتی ہو۔ ایسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ تم رات کے وقت نیند میں چلے آگیا کہ تک پہنچیں۔ کسی اتفاق کے تحت آگیا کہ کاہروانی دروازہ کھلا رہ گیا تھا تم اندر چلی گئیں۔“

”زبردست۔“ اچھی جو بڑے اور اس پر عمل ہو سکتا ہے۔“ مالینا نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”روستم ایک بات یہ شخص ہے اور اعتماد سے بھرا ہوا بھی۔ اگر وہ مجھے...“ مالینا کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ رستم نے اس وغیرہ کو اصل حقیقت بتا رکھی ہے یا نہیں۔ سستی میں تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ مالینا ساسی خان کے زمین دوز نمبر کے سے اخروہ دہلی ہے اور رستم خان تک پہنچ گئی تھی۔

”تم کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”کچھ نہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ رستم اور اس کے دوست بلند ہمت ہیں۔ اگر انہیں

یہ چٹھی رات کا ذکر ہے۔ مالینا پر گرام پر عمل کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ اس نے وقت کی ”ڈیمانڈ“ کے مطابق خود کو تھوڑا سا سنوار لیا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بڑے بھیسے، گنگے میں چاندی کا بار جس میں سرخ پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اپنی نگران عورت کے سامان میں سے اسے ننگیں پتھر کی چند چوڑیاں بھی لگی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر تھوڑی سی لالی لگائی اور مقامی انداز میں کندھے پر بے سنہری بالوں کو سنوار لیا۔ اس نے کھڑکی کے خستہ حال اسٹینڈ پر لگا ہوا بیٹھوی آئینہ دیکھا اور اپنی دست کدائی پر خودی حیران ہوئی۔ اس نے سوچا کیا وہ واقعی ڈاکٹر مالینا ہے۔ اسٹینڈ پر فیسر، ایک کامیاب ماہر جنسیات، جو گنگے میں اسیٹھ اسکوپ لگائے برکتھم کے اعلیٰ ترین ہسپتال میں گولے کی طرح پتھرائی تھی۔ آج کی اس مقامی طبی کی عورت اور اس ڈاکٹر مالینا میں کتنا فرق تھا۔ آنکھوں کو بھروسہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

پھر اس نے خود سے سوال کیا۔ ”مالینا؟ کیا تم کبھی واپس اپنے ملک پہنچ سکو گی؟ کیا تم پھر سے اپنی ماں اور بڑی بہن کا پیروہ دیکھ سکو گی اور کیا پھر بھی تمہارے ہوائے فریڈ آرتھری حساس انگلیاں تمہارے سنہری بالوں میں پھنس گئی ہیں؟ کیا تم اس کے سینے کی گری محسوس کر سکو گی؟“ اسے آرتھری انگلیاں شدت سے یاد آئیں۔ وہ انگلیاں جو کنار پر چٹتی تھیں اور ہزاروں دلوں کی دھڑکیں تیز کر دیتی تھیں۔ وہ ایک پروفیشنل نرس تھیں۔ وہ سوچنے لگی کیا وہ اس کا انتظار کرے یا ہوگا یا پھر کسی اور لڑکی کی زلفوں میں انگلیاں چلائے لگے ہوگا۔ وہ جس معاشرے میں رہتی تھی وہاں زیادہ دیر کسی کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو تین چار راتوں کی دوری ہی کافی ہوتی تھی۔ یہاں تو تقریباً نو ماہ گزر چکے تھے۔ اس نے ان خیلوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں کسی سے وفا کی امید رکھنا ہی مہبت تھا۔ اس نے ایک بار

سازگار حالات مل گئے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر گزریں گے۔ خاص طور سے رستم کی شخصیت میں الگ بات ہے۔ ہم اس سے اچھی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔

دو تین بائبل سنسان اور تاریک گلیوں سے گزر کر وہ اگیارے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں وہ تین جھنڈے لہرا رہے تھے۔ چار دیواری کے اندر غڑی جھوپڑوں کی ساخت جگڑوں سے ملتی جلتی تھی لیکن یہ جگڑے نہیں تھے۔ سامنے ہی آہوک کی گڑی کا وہ قدیم دروازہ تھا جسے کھول کر مالینا کو اندر جانا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ سخت سردی کے باوجود اسے اپنی اتیلیاں نہ محسوس ہوئیں۔

”ساری باتیں تمہیں یاد ہیں ناں؟“ وہ اس نے انگریزی میں پوچھا۔ مالینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اسے بولا۔ ”یہاں زیادہ دیر رکا ٹھیک نہیں۔ اب تم جائو۔ دروازہ کھلا ہے۔ اوپر والا تمہاری مدد کرے گا۔“

وہ اس چند قدم پیچھے ہٹ کر تاریکی میں زو پڑا ہو گیا۔ مالینا کچھ دیر تک گلی کے وسط میں تیز برفانی ہوا کے سامنے بے حرکت کھڑی رہی۔ پھر اس نے سخت محکم انداز میں قدم بڑھائے اور اپنا ہاتھ گڑی کے بھاری بھر کم دروازے پر رکھ دیا۔ اس نے دباؤ ڈالا تو ایک لمبین آواز کے ساتھ دروازے کا پٹ واگیا۔ مالینا اندر داخل ہوئی اور اپنے عقب میں دروازہ بھیر دیا۔ اندر جگڑا تھا جھوپڑوں میں سے ایک جھوپڑے کے اندر اسے لائٹن کی دھم روشنی نظر آئی۔ یہ گول جھوپڑا دیگر دو چھوٹے جھوپڑوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس میں سے ہلکے صوفے بھی اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ غالباً انیسویں صدی تک رہی تھی۔ مالینا برف کی تیل تھیں پر قدم رکھتی ہوئی اسی بڑے جھوپڑے کی طرف بڑھی۔ اس کے کتھوں میں بندھی ہوئی چاندی کی پالکوں نے دھم آواز پیدا کی۔ جھوپڑی کا چوٹی دروازہ اندر سے بند تھا۔ مالینا نے دل کا زکر کے دروازے کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ اندر لائٹن کی روشنی میں حرکت پیدا ہوئی۔ اندر جو کئی بھی تھا وہ جاگ رہا تھا۔ مالینا اگلے قدموں پیچھے ہٹ کر چھوٹے جھوپڑے کی اوٹ میں ہو گئی۔

چند سینکڑے بعد بڑے جھوپڑے کا دروازہ کھلا۔ مالینا نے جھرمجری لے کر دیکھا۔ وہ شوق خان تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لائٹن تھیں اور لائٹن کی سرخ روشنی شوق کی جھڑپ جھکا کر ڈال رہی تھی۔

اس نے سرسائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً پوچھا تھا کہ کون ہے۔

مالینا نے جھوپڑے کی اوٹ سے اسے اپنی جھٹک دکھائی۔ ”اوڑھی اس نے سر پر سے ڈھلا کر دھکی۔ اس کے ہاتھ پر اور سرخ و سپید کانوں میں چاندی کا زیور دک رہا تھا۔ شوق

خان نے اسے دیکھا اور ہکا بکا ہو کر جلدی سے باہر آ گیا۔ اس نے عجیب حیرت آمیز آواز میں پتہ کہا بھی تھا۔ مالینا اسے جھٹک دکھا کر دوسرے جھوپڑے کی اوٹ میں چلی گئی۔ نیم تاریکی میں اس کی پائیں اور چوڑیاں چھن چھن بجتی تھیں۔ لمبا ترنگ شوق خان لڑکھاتا ہوا پہلے جھوپڑے کے عقب میں پہنچا تو مالینا دوسرے جھوپڑے کی اوٹ میں تھی۔ اس نے وہ بارہ جھٹک دکھائی۔

شوق خان نے ایک بار پھر بھاری بھر کم آواز میں کچھ کہا اور تیزی سے مالینا کی طرف آیا۔ مالینا جھوپڑے میں کھسکی اور اس کے دوسرے دروازے سے ملے نکل کر سب سے بڑے جھوپڑے کی طرف آگئی۔ چند سینکڑے شوق سے مزید آنکھ جھونکی کھینچنے کے بعد مالینا بڑے جھوپڑے کے اندر داخل ہو گئی۔ یہاں فرش پر دیوار غایپے تھے جن کو مزید آرام دہ بنانے کے لئے ان پر چاروںوں کی کھالیں بچھائی گئی تھیں۔ یہاں خوش گوشت حرارت محسوس ہوتی کیونکہ انیسویں صدی میں آگ مو جو دھچی۔ ایک طرف عبادت کے لئے چوہتراسا نظر آیا۔ یہاں ایک سفید تختے پر مقدس درخت آہوک کی شبیہ بنی ہوئی تھی اور آہوک کے پھلوں سے بار پر کر جھوپڑے کی چھت سے لٹکا گئے تھے۔ یہاں مالینا کو اس جادوئی پودے سے کھل کر خوشبو بھی محسوس ہوئی جس کی کشش سینکڑوں لوگوں کو اور خود مالینا کو کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ وہ اس پودے پر ہونے والے تجربات کے سلسلے میں ہی تو لندن سے پاکستان اور پھر ان دور دراز پناؤں میں پہنچی تھی۔

یہ سارے خیالات شاید دو سینکڑے بھی کم وقت میں مالینا کے دماغ سے گزر گئے۔ ایک لائٹن جھوپڑے کے اندر بھی بھول رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر رعنائی اور اپنی خوب صورتی کے ختنے ہوئے سارے اعتماد کے ساتھ اس لائٹن کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ غلش نظر آ رہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ہائے ہوئے شوق کو اپنے زور پر پایا۔ وہ خون کا نظارہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آخری حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ بکھری ہوئی خود زور ڈال رہی تھی اندر ہونٹ لرز رہے تھے۔

”تم۔۔۔ یہاں۔۔۔ کیسے؟“ وہ بے پناہ حیرت سے بولا۔

چھپکے چند ماہ میں مقامی زبان کے سنے چنے الفاظ مالینا کی سمجھ میں آئے تھے گئے۔

اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ زبان پشتو پشتانی تھیں۔ دیکھ کر اس نے

دھمکرائی اور مسکراتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ شوق کی حالت دیکھ کر اس کے اندر انداز پیدا ہو رہا ہے۔ اس نے جواب میں جو الفاظ کہنے تھے، وہ اس نے پہلے ہی چن لئے تھے

وہ بولی۔ ”میں بے خبر..... نیند میں چل کر..... یہاں ہوں۔“

جواب میں شوق خان نے بہت کچھ کہا لیکن مالینا کی سمجھ میں بس ایک وہ لفظ ہی آئے۔ شوق کے گلے کی رکیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنی نگاہ مالینا کے سر اُپے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بدتر سچ ایک ذہنیت میں جتا ہوتا جا رہا ہے۔ مالینا سانس کھڑی رہی۔ اب وہ اوزنی سے بے نیاز تھی۔ گتھیمی کی سرخ روشنی مالینا کی گردن اور اس کے چہرے کو جھلکا رہی تھی۔

شوق نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔ وہ فیسے میں نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے کس چند ایک بے ربط الفاظ ہی مالینا کی سمجھ میں آ سکے۔ ”تم شرم..... مقدس..... گناہ۔“

کچھ دیر بعد شوق خان نے مالینا کو اگلی سے اشارے کر کے شروع کئے۔ وہ اسے باہر نکل جانے کا حکم دے رہا تھا۔

یہ صورت حال اس صورت حال سے بالکل مختلف تھی جس کی مالینا توقع کر رہی تھی۔ شوق تھوڑی دیر کے لئے بہت ضرور نظر آیا تھا لیکن اب وہ ایک دم سنبھلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ اس کے لگائے ہوئے انداز سے غلط تھے؟ کیا شوق اتنا کمزور نہیں تھا جتنا اس نے سمجھا تھا؟ اگر واقعی ایسا یہی ہے تو اب کیا ہوگا؟ کیا وہ اسے یہاں سے نکال دیا کرے گا یا پھر اپنے محافظوں کے حوالے کر دے گا..... سمجھیں وہ اس کے ساتھ مار پیٹ ہی شروع نہ کر دے۔ کچھ بھی تھا آخر وہ یہاں کا سردار تھا۔ ایک ہی سیکنڈ میں یہ سارے خیالات مالینا کے ذہن سے گزر گئے۔

اجابک وہ نہی طرین چونک گئی۔ جس جگہ وہ نماز غالیچے پر کھڑی تھی وہاں سے فقط تین قدم کی دوری پر ایک سرخ غالیچے میں حرکت پیدا ہوئی۔ یہ غالیچہ توڑ اسادہ اور اٹھا۔ پانچ چھانچ کے خلا میں سے مالینا کو ایک جوان پلٹسٹانی لڑکی کی آنکھیں دکھائی دیں۔ پھر ایک دم خلا بند ہو گیا اور غالیچہ فرش پر برابر ہو گیا۔

مالینا سمجھتی کہ کسی حالت میں کھڑی رہ گئی۔ شوق تڑپ کر آگے بڑھا۔ اس نے حرکت کرنے والے غالیچے کو ٹھیک سے سمجھ کر اس کی جگہ پر بٹھایا۔ مالینا سانسے میں تھی۔ درحقیقت یہاں فرش میں ایک راستہ جس پر کھڑکی کا چوکور ڈھکنا تھا۔ غالیچہ اس چوکور ڈھکنے پر بٹھا ہوا تھا اور یہاں ایک لڑکی تھی۔

غالیچہ برابر کرنے کے بعد شوق لپک کر دروازے کی طرف گیا اور اس سے پہلے کہ مالینا

جگہ کر دروازے سے ٹپک پٹپٹ شوق نے دروازے سے گواہی سے کھڑی چڑھا دی اور مالینا کو بازو سے پکڑ کر واپس ادنیٰ کدیلوں میں پھینک دیا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں اشتعال تھا لیکن اس اشتعال کا تعلق ”جتن“ سے نظر نہیں آتا تھا۔ مالینا خود مایہ جلیات تھی۔ اس سے بہتر ایسا تجربہ اور کون کر سکتا تھا۔ پھر ایک دم مالینا کی آنکھوں کے سامنے جھماکا سا ہوا۔ اس نے دیکھا شوق نے لپک کر ایک طرف بڑی کھڑائی اٹھالی ہے۔ چھوٹے دستے کی اس کھڑائی کا پھل لالٹینوں کی روشنی میں خوفناک چمک دے رہا تھا۔

”خدا کے لئے..... نہیں۔“ وہ بے ساختہ چلائی۔

پھر اس کے ذہن میں آیا کہ یہاں منت حاجت سے کام چلنے والا نہیں۔ وہ شوق کے ایک اہم ترین راز سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اب شوق اسے زندہ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ وہ جتن چاہے گا کہ اسے جھوپڑے کے اندر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے۔ بعد ازاں وہ اس پر کوئی بھی اثرام عائد کر سکتا تھا۔ وہ مارگرہا سی پاؤں دھستی کا قابل احترام سردار تھا۔ اس کی کسی بھی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاسکتا تھا۔

اپنی زندگی بھانپنے کی فطری خواہش کے تحت مالینا کے جسم میں برقی کی کوئنگلی۔ دوسری طرف شوق بے پناہ وحشت کے ساتھ مالینا پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کھڑائی کا وار کیا۔ یہ وار تین تین مالینا کو کھٹکے کرنے کے لئے تھا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ نہ چھوڑتی تو اس کا سر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔

وارے حد درجہ می سے کیا گیا تھا۔ لہذا جب وار خالی کیا تو شوق اپنے زور میں لڑکھڑاکر سنسنوں کے بل گر گیا۔ مالینا تڑپ کر دروازے سے تک پہنچی اور کھڑکی گرا کر باہر نکل آئی۔ وہ جاتی تھی کہ شوق خان طوفان کی طرح اس کے پیچھے ہے۔ وہ چارے زور سے چلائی۔

”بچاؤ..... خدا کے لئے بچاؤ۔“

آہٹ کی لکڑی کا یہ روئی دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو سائے اندر داخل ہوئے۔ یہ وہ لڑکی تھی جنہیں اس نے پرگرام کے تحت بطور گواہ اٹھایا۔ اسے قریب موجود رکھا ہوا تھا۔ اس ان کے پیچھے تھا۔ مگر اندر کی صورت حال کا اس کو پتا نہ تھا اور نہ پانی گواہوں کو۔ وہ اس کو بٹھاتا دیکھتا ہوگا کہ شوق خان نیم پر بند حالت میں باہر بند مالینا سے ٹھٹھکا ہوا کہ جب وہ مالینا کی پکار پر بھاگتے ہوئے اندر پہنچیں گے تو وہ سنسہ دو ٹکڑا رہ جائے گا مگر یہاں تو خشکی ہی رہا تھا۔ شوق خان غصہ ناک حالت میں مالینا کے پیچھے تھا۔ کھڑائی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ دروازہ پر تھا۔ ایک سایہ شوق کے کندھے سے ٹکرانے کے بعد دور جاگرا۔ دوسرا خود ہی دروازے سے

کر ایک طرف ہو گیا۔ شتم کلباڑی سونت کر لایا کہ پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ اس کے قدموں کی مہلک آواز مالینا اپنے پیچھے صرف چندہر میں فٹ کی دوری پر سن رہی تھی اور یہ فاصلہ مزید کم ہو رہا تھا۔ مالینا جانتی تھی کہ کسی لمحے بھی کلباڑی کا تیز دھار فوٹا دی پھل اس کے سر سے ٹکرا سکتا ہے۔ وہ بچی چھت والے تارک گھروں کے درمیان بڑبڑاتی تھی جہاں رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی۔ اس کا دل کبہر ہاتھ کا ہاتھ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ کہاں جائے۔ کس طرف جائے؟ اس نے منہ لائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے "روتم" کا چہرہ ابھرا۔ فراق پیشانی پر چھوٹے ہوئے پال۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں اتحاد کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اسے زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا۔ مصیبت میں جن پر خواہ مخواہ بھروسہ کرنے کو دل جاتا ہے۔ اور وہ "روتم" آج کل سترم وہ اس کے گھر میں تھا۔ مالینا وہاں اس سے مل چکی تھی۔ بھاگتے بھاگتے مالینا کے قدم بے ساختہ اس کے گھر کی طرف مڑ گئے۔

☆=====☆

رستم وہ اس کے گھر میں آٹھنشی کے قریب بیٹھا تھا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا مکمل تھا مگر وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی جاگ رہی تھی۔ یہ سونے کی فیکس جاننے کی رات تھی۔ آج اس کا نو بدھتی میں بھی بچہ ہو سکتا تھا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے بیٹا! سب کچھ دیر ساری ہو گا جیسا تم نے سوچا ہے؟"

"امید تو نہیں ہے۔" رستم نے سر ہلایا۔

"تم دونوں کے علاوہ اور کسی کو اس معاملے کو ہوتا ہے؟"

"کسی کو بھی نہیں۔" رستم نے جواب دیا۔

"اور وہ دو تین گلوہ جو گیارہ سے میں جا رہی ہے؟"

"وہ اس نے ان کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ بس انہیں کسی بھاننے سے گیارہ سے کے قریب لے گیا ہے۔"

"لیکن اگر۔۔۔" ابھی اس کی بیوی نے اتنا ہی کہا تھا کہ دور سے ایک چلائی ہوئی نسونی آواز سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

"اوہ خدا! یہ کیا ہے؟" وہ اس کی بیوی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

رستم تیزی سے اٹھا اور اپنی دونی بیڑی گھسیٹا اور دروازے تک پہنچا۔ اسے دو رنگی میں ایک سایہ نظر آیا۔ اندھ اندھ بندھنا تھا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور لمبا تر دکھایا

تھا۔

"بھانڈو۔۔۔۔۔۔ بھانڈو۔" ایک تیز آواز سنانے کو چیرتی ہوئی آئی۔ یقیناً یہ مالینا تھی۔ اس نے "بھانڈو بھانڈو۔" کے الفاظ آکر بڑی میں ادا کئے تھے۔

"مجھے کلباڑی دو۔" رستم نے بیٹائی لہجے میں اس کی بیوی سے کہا۔

اس نے لپک کر کلباڑی رستم کی طرف بڑھائی۔ رستم کلباڑی قدام کر باہر گلی میں نکلا۔ اس وقت تک مالینا بھاگتی ہوئی رستم تک پہنچ چکی تھی۔ رستم بس اتنا ہی دیکھ کا تھا کہ وہ سرور پاؤں سے لگی ہے۔ تاروں کی دھم رشتی میں اس کے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے آویزے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً مالینا نے بھی رستم کو پہچان لیا تھا۔ وہ تیری طرف سیدھی آئی اور پھر رستم کی اٹ میں ہو گئی۔ مالینا کے پیچھے ہوسا یہ باز آ رہا تھا وہ شتم خان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کلباڑی اس نے سر سے بلند کر رکھی تھی، اس کا انداز ہے حد خطرہ کا تھا۔

"کو۔" رستم چاکر شتم کے رستے میں آیا۔

شتم کا زوردار دھکا لگنے کے بعد رستم لڑکھڑایا ضرور لیکن گرائی۔ شتم بھی ذرا سا لڑکھڑایا اور پھر سنبھل گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ان محول میں اسے لایا کہ سوا چھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ وہ کلباڑی سونت کر دوبارہ مالینا پر بھجونا تو رستم پھر اس کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ رستم نے شتم خان کو اپنے کندھے کی زوردار ضرب سے پیچھے ہٹایا۔ شتم خان نے بھی زخمی درندے کی طرح پھر کر کر رستم پر مٹ گیا۔ رستم نے کلباڑی کا وار کلباڑی پر روکا۔ لوہے سے ہوا ٹکرایا تو فٹنہ میں بے لگاریاں ہی چھوٹیں۔

اس دوران میری آنکھوں سے بھی موقع پر پہنچ گئے لیکن ابھی شتم خان کے سامنے آئے اور اس کا ہاتھ روکنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ شتم نے کسی مشتعل چہرے کی طرح چٹکن بڑے دھکے رستم پر کلباڑی سے لگی وار کئے۔ یہ سارے وار رستم نے بچا جب وہی سے اپنی جھانڑی پر لے آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے پیچھے ہٹا گیا۔ اسے صورت حال کی جیتھ بھٹک رہی تھی۔ نہ ہی اسے یہ پتا تھا کہ اسے شتم خان پر جوابی وار کرنا چاہیے یا نہیں۔ ان محول میں اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ مالینا، شتم کی دھشیاں بخار سے بچ جائے اور اسے لگ ہاتھ کا وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مالینا اب اس کے عقب میں نہیں۔

شتم کے سارے غیظ و غضب کا نشانہ اب رستم تھا اور وہ بڑی دلیری و کامیابی سے اس نے غیظ و غضب کو سنبھال رہا تھا۔ اسی دوران میں اس نے عقب سے سروردار شتم کو سنبھالنے کی

سوم کی بیگمانی آواز کوچ رہی تھی۔ وہ مقامی زبان میں چٹکھڑ رہا تھا۔ "پڑو سے۔ کہاں گئی۔ پکڑو۔۔۔ جان سے مارو۔"

چار سو ایک طوفان کا سا برپا ہو گیا تھا۔ ہر شخص چلا رہا تھا، منہ سے جھگ اُڑ رہا تھا۔ سب بلند دھاڑیں مارتے تھے اور شاہی اس سے بھی بلند شور مچا کر کہتا تھا کہ ”چوری“ اور ”دزدی“ ”صداق تھا۔ کچھ دیر میں ہر جان کے مزے ساقی آگئے اور اس کے ساتھ شرم خان کے کم و بیش دو درجن محافظ موقع پر پہنچ گئے۔ ہر طرف کھڑکیاں اور دروازے، نوکیں روشنی میں چمکنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے صورت حال نہایت سکین ہوئی تھی۔

جس ایک سینکڑہ لڑے تھے کہ وہ چلڑی پٹن افراد تیزی سے گھوڑے دوڑاتے موقع پر ان میں سے ایک کے کندھے پر گلا شکوفہ لگ رہی تھی۔ اس نے قریب آتے ہی ٹپٹس سے شوقم خان کی طرف اشارہ کیا اور بلند آواز میں کہہ کیا۔

اس کے ہونے کی وجہ یہی کہ ایک دم ہیٹے کسی نے غصے سے شعلوں پر تیل پھینک دیا۔۔۔
سوار کلباڑیاں سونت کر تیری طرح کا شرف برداری طرف لپکتے لیکن ابھی دورا سے میں
ایک چوٹی سی کلباڑی تیرتی ہوئی آئی اور ایک حملہ آور کی گردن مگی گئی۔ اس کے ساتھ
ایک بارہ بور کی رائفل نے دھماکے سے شعلہ اٹھا اور دوسرے حملہ آور کا حوض انڈر کٹر کر
دے جسے برف پر گرنا۔ ایک دم ہی درجنوں افراد لوٹکارے مارے تو بے ایک دوسرے پر
۔۔۔ ہم کوں سے راست کا سانچا چمکانا پڑا ہوا ہے لگا۔ دو این طرف ۔۔۔ واس کی کاپانی

۵۱

رستم کے قدموں میں لو ہوا تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ وہ جبکہ کرختی الامکان تیزی سے چلتا ہوا وہ اس کی طرف گیا۔ کئی کھوپیاں سنسناتی ہوئی اس کے دائیں بائیں سے گزرتیں۔ کھلی کے موز پر چبچبے چببے رستم اور اس کا وادہ سے منہ برف پر گرنا پڑا اور نہ زمین ممکن تھا کہ کوئی اندھی گولی انہیں چاٹ پاتی۔ وہ تقریباً فوجی انداز میں کراٹک کرتے ہوئے بچے کے کی مخالف سمت میں بڑھے۔ ایک خنجر بردار پاؤندہ لٹکارتا ہوا وہ اس کی طرف بڑھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس کو بچان کر اس کی طرف لڑکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ برف پر وادہ سے بڑے وہ اس کی پیٹ سے خنجر کو نکھینچا، رستم نے لیٹے لیٹے اس کی ٹانگ پر کھپڑا پیٹائی۔ اس کا گوشت نکلنے اور نہی لوٹنے کی واضح آواز سنائی دی۔ وہ کرب سے چیخ کر پہلو کے بل گرا۔ رستم نے لیٹے لیٹے اس پر جست کی اور بے دروغی اس کی گردن پر اور کیا۔ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کا سر چھڑے ہوئے حملہ آور کو ایک موقع بھی مل گیا تو وہ اپنا ایک فک لہذا خنجر وہ اس کے دہلے پتے جسم میں اتار دے گا۔ گردن پر کاری ضرب کھانے کے بعد حملہ آور بے سدھ رہ گیا۔

”رستم جلدی کرو۔“ واس نے رستم کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

”کدھر جانا ہے؟“

”بس میرے پیچھے آؤ۔“

دونوں ایک بریلی فسطون پر تقریر کرنا لگتے ہوئے پردہ میں میٹر چلنے پھرنے لگے۔ اس کے بعد ایک تنگ گلی میں داخل ہوا اور ایک مکان میں ٹھس کیا۔ رستم بھی اس کے پیچھے تھا۔ مکان میں دو جہاز پر بیٹھان عورتیں موجود تھیں۔ چند سیکنڈ بعد رستم کو ایک تیسری عورت نظر آئی۔ بالیدانسی۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ شل تھی اور وہ بھی نہولی ایک تاریک گوشے میں کھڑی تھی۔

”تم ٹھیک ہونا لیانا؟“ رستم نے اسے سر تا پا دیکھا۔

”بس..... ہم ٹھیک اور ٹم؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں..... لیکن وہ اس کو زخم آیا ہے۔“

رستم کے تپانے سے پہلے ہی دونوں مقامی عورتیں واس کی زنجی کھالی کی طرف متوجہ ہو جی تھیں۔ اسے لکھاڑی کا گھبراہٹ لگا تھا۔ ایک عورت نے واس کا خون روکنے کے لئے اس کے زخم پر چمچ لٹھی کی بخندیں راکھ لگائی اور اپنی اوراضی کی ہٹی پھاڑ کر باندھ دی۔ باہر

قیامت کا شوق تھا۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی اور لٹکے گرنے لگے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے واس؟“ رستم نے پوچھا۔ خون آلود کھڑائی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

”وہی ہو رہا تھا جو ہوا تھا۔ شوق کے حماقتی اور مخالف آجوں میں بھڑ گئے ہیں۔ یہ لاوا کی دلوں سے اندھری اندر تک رہا تھا، آج پسند پڑا ہے۔ اب یہاں وہ سب کچھ ہوگا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت خون بہے گا۔ یہ قیامت لڑائیاں اسکی ہی ہوتی ہیں۔“

”تو کون کون رہا ہے؟“

”یہ صاف طور پر دو دھڑے بن گئے ہیں۔ کچھ لوگ شوق اور اس کے بڑے بیٹے ارفا خان کے حامی ہیں۔ کچھ ساری خان اور اس کے سرکاریوں کی حمایت میں اٹھ آئے ہیں۔“

دھماکوں سے درد و یار راز رہے تھے۔ گاہے بگاہے خودکار راکٹوں کے طویل برست بھی پلٹتے تھے۔ گھوڑوں کی جھینباہر اور چلائی ہوئی انسانی آوازیں اس شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ چند بکے ہوئے گھتے اندھا دھند بھاگتے اور شور مچاتے مکان کے دروازے کے مین سامنے سے گزرے۔

ایک عورت اندر سے ایک ریو اور ایک آٹھ ایم ایم رائفل لے آئی۔ واس نے ریو اور خود کھلایا اور رائفل رستم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو ڈے۔ امید ہے ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی لیکن احتیاطاً کچھ نہ کچھ ہمارے پاس ہونا چاہیے۔“

یوں محسوس ہوتا تھا کہ لڑائی کا دائرہ پھیلنا ہو سکھو کہ وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ رستم کو اپنے ساتھیوں ڈاکٹر ناصر اور شریف کی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں کھو میں تھے اور اس کی طرح ہی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

واس نے جیسے رستم کے اثرات سے اس کے دل کا حال پڑ لیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”ناصر اور شریف کے لئے پریشان ہو؟“

”کیوں؟ پریشان نہیں ہونا چاہیے؟“ رستم نے پوچھا۔

”انہوس۔۔۔ میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔“ واس نے سرد آہ بھری۔

”بس اس موقع پر ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اگر شوق خان کے ساتھیوں کا پلڑا ہماری ہو گیا تو ناصر اور شریف وغیرہ پر مصیبت آسکتی ہے۔ سبے شک تم نے شوق خان پر حملہ نہیں کیا لیکن اس کا ہاتھ تو رکا ہے اور اس قبیلے کے قانون کی انھوں کتاب میں یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔“

”اور وہ اس انتہائی بیسی؟“ رستم نے پوچھا۔

”اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہماری طرح محفوظ جگہ پر نہ۔“ واس نے کہا۔

ایک دم یالینا اپنی جگہ سے اٹھی اور رستم کا بازو دھام کر گھیر کر آواز میں بولی۔ ”جھپک ہو رستم۔“

یقیناً اس کا ”جھپک ہو“ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کے حوالے سے تھا۔

رستم آگئی بیڑی میں ہونے کے باوجود شوق اور یالینا کے درمیان دیوار بنا تھا۔

رستم نے یالینا کا شانہ تھپکا۔ ”جھپک ہو یکس بات کا؟ تم نے جو کچھ کیا ہم سب کے لئے تھا اور ہم بھی جو کچھ کر رہے ہیں سب کے لئے ہے۔“

واس نے رستم کے اس فقرے کا انگریزی میں ترجمہ کر کے یالینا کو سنایا۔ وہ تشکر کے انداز میں نفی میں سر ہلانے لگی اور ایک پُر خلوص دوست کی طرح رستم کا بازو دھلاتی ہوئی چلی گئی۔

فائرنگ کی شدت نہ صرف برقرار تھی بلکہ اس کا دائرہ بھی پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہوا میں بارود کی وہ صاف ٹوٹکی جا سکتی تھی۔ دونوں مقامی تیرتیر گھنٹوں کے بل مقدس آب و ہوا کی ایک مستطیل کلاڑی کے سامنے عبادت کے انداز میں کھڑی تھیں اور آکسیجن بند کر کے مسلسل

بڑ بڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ یہاں بھی رستم کو تالیب پودے سب گندل کی بو محسوس ہوئی۔

اسے چند دن پہلے معلوم ہوا تھا کہ اس برف دار میں سب گندل کو کسی بھی طرح استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ بلکہ سب گندل سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانے کو ناپہنچا جاتا ہے۔ یہاں

اس کا صرف ایک استعمال تھا اور وہ یہ کہ پڑ پڑا پٹے کے وقت سب گندل کے خشک پتوں سے

نانے گئے ملنے کو تانے کے ایک تھال میں رکھ کر اپنے قریب رکھا جاتا تھا۔ یہ تھال ایک عام

پائت کے سائز سے لے کر چار پانچ فٹ کے قطر تک ہو سکتا تھا۔ بعض اوقات اس تھال کے اندر موسم جی روٹن کی جاتی تھی۔

اچانک گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دھتک ہوئی۔ رستم سمیت سب اچھٹل پڑے۔ رستم نے رائفل کا میٹھی کچھ بٹایا اور واس کے ساتھ ایک عقبی کمرے میں چلا گیا۔ یالینا

نئی ان کے پیچھے اس تاریک کمرے میں پہنچ گئی۔ رستم ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ اگر بیرونی دروازے پر کسی طرح کی گزیر ہو تو اسے نظر آ سکے۔

رستم کی خون آلود کھڑائی ابھی تک بیرونی دروازے کی دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔ بیڑی

مخرب کھجورت نے اس کھڑائی کو ایک چٹائی کے نیچے چھپایا اور بیرونی دروازے کے قریب پہنچ

گئی۔ دروازے کے دوسری طرف سے جو آواز آئی اسے سن کر عورت کا خوف ایک دم کم ہو گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ جو اس سال زری جلدی سے اندر آ گئی۔ وہ اپنے سونے والی لبادے میں تھی۔ پاؤں میں صرف ایک چرمی جوتا تھا، سر حسب معمول بچکا تھا۔ وہ باپنی ہوئی تھی اور برف کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ مقامی عورت نے دروازہ پھر بند کر دیا۔

”خیریت سے ہوتا ہے؟“ اس نے اسے ٹول کر پوچھا۔

”بہر بہت خون نکل رہا ہے۔ لوگ صر رہے ہیں۔ میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔“ زری نے بھی اردو میں جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”لڑائی کس طرف ہو رہی ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”کھوکھ کی طرف۔ بہت لڑائی۔ بہت گولی اور آگ بھی۔ چھوٹے ملک کو بھی گولی لگتا۔ یہاں بانگو (بازو) میں۔“

”ارفاقا کو؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

زری نے خوف زدہ چہرہ اذیت میں ہلایا۔ اس کے لیے رہتی ہال پھسل کر رخساروں پر آ گئے۔ وہ بولی۔ ”چھوٹا ملک کر گیا۔ پھر اس کا ساتھی چھپے ہوئے تھا۔ برف چا چا نے بہت گولی چلایا۔ میں بھی مشکل سے بچا۔“

پھر وہ سیڑھی رستم کی طرف آئی۔ ”تم ٹھیک ہے نا؟ تم کو کچھ نہیں ہوا؟“

”ہاں اس کچھ نہیں ہوا۔ تم وہاں جا کر بیٹھو۔“ اس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

زری کو یہ حکم گوار نہ رہا۔ تاہم ماننے سے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ رستم کو عجیب نظروں سے دیکھتی اور لائے قدموں چلتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

رستم نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا اندازہ ہے؟ اس لڑائی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“

”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ لڑائی کھوکھ کی طرف بلکہ اس سے آگے چلی گئی ہے۔ شاید برف چا جان اور اس کے ساتھیوں کا پلڑا بھاری ہے۔“

”لڑائی ایک دم شروع کیسے ہو گئی؟ وہ کلاشکوف والا بندہ بھانسا ہوا آیا تھا، کیا اس نے کچھ کہا تھا؟“

”اس کا نام دادا خان ہے۔ وہ ان گواہوں میں سے ہے جن کو میں نے ان گیارے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ جب شوق خان کپھاڑی لے کر مالینا کے پیچھے بھاگ گیا تو دادا خان اور اس

کا ایک ساتھی ان گیارے میں چلے گئے۔ انہوں نے بڑے جھوپڑے میں کچھ ایسی چیزیں دیکھیں جیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کوئی عورت یہاں شوق کے ساتھ موجود رہی ہے۔“

”کیسی چیزیں؟“ رستم نے پوچھا۔

”اس آواز دیکھ کر تے ہوئے نکلا۔“ ایک جوان عورت کے کپڑے اس کے جھینٹے اور پھولوں کے گجرے وغیرہ۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین ہے۔“

بات ختم کر کے اس اور رستم سوالیہ نظروں سے مالینا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ فائرنگ اور لکاروں کی آوازیں اب کافی دور مشرق کی طرف چلی گئی تھیں۔ گاہ بگاہ فائرنگ میں وقفہ بھی رہا تھا۔ مالینا نے جھر جھری سے کہنا شروع کیا۔ ”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ سب کچھ دیکھا۔ آنکھوں سے دیکھا۔ ویز واڑ سے کرل۔ ایک لڑکی۔ شہی واڑا ان سے صدمت۔ میں۔ وہاں ایک صدمت۔“

”او خدا ای۔“ اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ”ان باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔“ مالینا نے لڑکھائی آواز میں بات جاری رکھی۔ ”ہاں نے لڑکی کو پانی چائس دیکھا۔ اس نے صدمت کا زور اوپر اٹھایا۔ پھر کلوزر کیا۔ شوق ایک دم بہت اٹھری ہوا۔ اس نے ہاں پر ایک کیا۔ آئی رین۔ ہاں اپنا لائف کے لئے بھاگا۔“

مالینا کے بیان سے سموت نے حال کچھ سمجھ واضح ہو رہی تھی۔ شوق خان کی زندگی کا ایک بالکل نیا اور غیر متوقع رخ سامنے آیا تھا۔ مالینا وہاں جس کام سے تھی تھی وہ تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے جانے سے جو انکشافات ہوئے تھے وہ بھی کچھ کم از کم نہیں تھے۔ ان انکشافات نے وہی نتیجہ برآ کر رکھے تھے جن کی رستم اور اس وغیرہ کو سمر تھی۔

رستم نے اس سے ان دو صورتوں کے بارے میں پوچھا جن کے گھر میں انہوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس نے بتایا۔ ”یہ دونوں سکی نہیں ہو رہے ہیں۔ ان کے شوہر کچھ عرصہ پہلے شاہ گوری کے داس میں ہلاک ہو گئے تھے۔“

”شاہ گوری کیا ہے؟“

”توہیں نہیں جانتا؟ شاہ گوری“ کوئی کا دوسرا نام ہے۔“

”اچھا۔ تو ان کے شوہر کیسے ہلاک ہوئے؟“

”میں وہی یہاں کی کہنے رہیں اور۔ شوق خان کی بہت دھڑی۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ تمہارے مطلب کی نہیں۔ بہر حال یہ دونوں یہاں ہر طرح سے قابل اعتماد ہیں۔“

پھر وہ اس نے ان میں سے بڑی عمر کی عورت کو کھانسی کچھ آواز دی اور مقامی زبان میں

جو ہستانی کی ہی ایک قسم تھی، عورت سے چھو گیا۔

وہ کھوکھٹ کی اوٹ سے منتقلی رہی اور اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

قرب و جوار میں فائرنگ کی آواز بے قربانیم کی تھی لیکن بڑے جوش و گھوم کے لڑاکارے انداز میں دے رہے تھے۔ گانے بگائے بیٹوں میں گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں آتی تھیں۔ گھوڑوں کے سم برف پر عجیب طرح کی آواز پیدا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عورت باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی جس سے وہ اس نے بات کی تھی۔

”کیا اسے تم کہیں بھیج رہے ہو؟“ رستم نے اس سے دریافت کیا۔

”ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ باہر کی خبر لائے۔“

عورت دو دروازوں کو پار کی تاک میں کھڑی رہی اور پیش ہو گئی۔ زری اچھی خاصی کے پائل میں آوازوں میں بھی تھی۔ اب اس کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی تھی۔ اچھی خاصی سرخ روشنی اس کے چہرے کو کسی خوب صورت پیشانی کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ اندر گھر سے پائل بے خبر بڑی سناٹائی نظروں سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ اسے پچھلے دنوں کا ذرا نہ ہوتا تو شاید بے تکلفی سے رستم کے پیلوٹ لگ کر بیٹھ جاتی اور اس کا کان سمجھ کر ٹھٹھکا دیتی۔

”اچھے بال کاپ میں باندھو۔“ اس نے اسے ہلکی سی سرزنش کی۔

جواب میں وہ زور سے ہنسی اور اپنے بال سنہلنے کے بجائے انہیں سمجھ اور بھی بکھیر دیا۔ اس کے لمبے بال ہنگامی حیثیت ہی کی طرح خود زور اور سرکش تھے۔ تاہم اس سرکش میں بڑی معصومانہ سی کیفیت بھی تھی۔

وہ اس نے بے بسی سے سر ہلایا اور زری کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ وہ اس کو پہچاننے کے بعد زری نے اس کی بات مان لی اور اپنے جتنی بالوں کو ایک عجیب شمع کے کپ میں سمیٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے رستم کی طرف دیکھ کر شرات سے ناک چڑھائی اور پھر خود ہی شرما کر ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ اندر گھر کے سنگین حالات سے اب بکھرے پر واؤ نظر آ رہی تھی۔ وہ اس چار دیواری سے باہر خون خرابا دیکھ کر آئی تھی۔ تاہم تجویزی ہی دیر میں وہ اس نون خرابے کو فراموش کر چلی تھی یا پھر شاید رستم کو سامنے دیکھ کر اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے وہاں کی نظر بچا کر اپنی زبان نکال کر رستم کو چڑایا اور پھر ہنسنے میں چہرہ چھپا کر ہنس پھینکی۔

اسی دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ وہی مقامی عورت تھی جسے وہ اس نے خانگی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ کھوکھٹ لٹالے ہوئے اندر آئی۔ اس کا گھوکھٹ لرز رہا تھا

اور بے نیامہ جسم بھی لرز رہا تھا۔ وہ گھر کے ایک گوشے میں چلی گئی۔ وہ اس بھی اس کے پیچھے گیا۔ وہاں لائین کے پاس بیٹھ کر دونوں دس دس منٹ تک کھسک پھسک رہے۔

کھسک پھسک رہی ہوئی وہاں، رستم اور مالینا کے پاس آیا۔ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”اندازہ ہو رہا ہے کہ برق جان اور اس کے ساتھیوں کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے۔ شرم نان کے کافی بندے مارے گئے ہیں اور زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس کا چیتا ارفا خان بھی زخمی ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔ شرم اور اس کے ساتھی ہستی کے مشرقی کنارے کی طرف ہسپا ہو گئے ہیں۔ لڑائی فی الحال رکی ہوئی ہے۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے ہستی کا کنٹرول کس کے پاس ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک میں خود باہر نہ جاؤں، ہم صرف قیام لگا سکتے ہیں۔“

”تم نے بتایا تھا وہاں کہ شرم کے پاس کم از کم چار مسلح محافظ ہیں۔ اتنے وقار یافتہ فکروں کے ہوتے ہوئے وہ آسانی سے ہار تو نہیں مانے گا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن ان محافظوں کو بھی دیکھنا ہو گا کہ وہ کہاں تک شرم کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ جو کچھ سامنے آ رہا ہے وہ شرم کے لئے تباہ کن ہے۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ رستم نے پوچھا۔

وہ اس نے رستم کے قریب کھسک کر آواز مزید جھپی کی اور بولا۔ ”خانگی باہر سے اہم خبریں لائی ہے۔ ڈاکٹر مالینا نے اگیارے کے اندر جس جگہ کو تہ خانہ بتایا ہے، وہ تہ خانہ نہیں ہے۔ وہ ایک راستہ ہے۔“

”راستہ؟“

”ہاں۔ ایک بہت پرانا راستہ جس کی خبر صرف شرم کو تھی یا شاید شرم سے پہلے اس کے انجمنی بڑے بھائی کو ہوگی۔ یہ پرانے پتھروں سے بنا ہوا زمین دوز راستہ قریباً سو میٹر لمبا ہے اور یہ راستہ بتا ہے کہاں کھتا ہے؟“

رستم سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اس نے کہا۔ ”یہ راستہ مقدس آہوک کے دیکھے ہوئے درخت کے پاس ایک۔ ہانسی مکان میں کھتا ہے جہاں چند برس پہلے عورتوں کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی لیکن اب شرم نے یہ مکان ایک بیوہ عورت اور اس کی جوان بھانجی کو اسے رکھا ہے۔ عورت کا بیوہ چودہ سالہ بھانجی ساتھ رہتا ہے لیکن اس بے چارے کو کیا پتا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ یہ یہ عورت شوق کے قریب تصور ہر کی جاتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کو جلد ہی دونا دونا توں (بھاریوں) کی جماعت میں شائش لایا جائے گا۔ کچھ کچھ کا تو اندازہ تھا کہ یہ بھاریوں کی گھرانہ بنی ہیڈ بنے گی۔ کسی کو گمان تک نہیں تھا کہ یہ پاک باز عورت نیکوکار ملک شوق کے ساتھ مل کر کیا گندہ پھیلا رہی ہے۔ جو کچھ سامنے آ رہا ہے وہ بہت حیران کن ہے۔“

”وہ خالہ بھانجی اب کہاں ہیں؟“

”گھر چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں لیکن گھر سے سننے والے ثبوت حیران کن ہیں۔ اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ خالہ اور اس کی سہیلی بھانجی دونوں شوق کے ساتھ ملوث تھیں۔ جن دنوں سردار شوق گیارہویں تھی۔ وہ تازہ دھڑن دور راستے کے ذریعے اس تک پہنچتی تھیں اور اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ کام اتنی رازدار اور صفائی سے ہو رہا تھا کہ ڈیڑھ دو سال گزرنے کے باوجود کسی کو کانٹوں کان خبر نہیں ہوئی اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی کتنے عرصے تک نہیں ہوتا تھی۔ ابھی اس گندہ سے کام کی مزید تفصیل بھی سامنے آ رہی ہے۔ عام لوگوں میں غم و غصہ پایا جا رہا ہے۔ وہ سخت الجھن کا شکار بھی ہیں۔“

رستم خاموش رہا۔ وہ اب بھی گہری سوچ میں غرق اپنی کھائی کے ذمہ کو بھلاتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر ہوا۔ ”انسان نے کسی خلافتیہ سے کچھ نہیں جپ بھی فطرت سے نگر لی ہے۔ مذہبی کھائی ہے۔ فطرت پہنچتی ہے کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ جب اس پہنچے پانی پر اعتقاد رسواں اور عقیدوں کے بند باندھے جاتے ہیں تو یہ پانی سرگرم بدوبہے لگتا ہے اور پھر اس میں سے جسمانی اور روحانی بیماریوں کے مغزیت برآمد ہوتے ہیں۔ انسان کے لئے وہی راستہ بہتر ہے جو اس کے خالق نے اس کے لئے متعین کیا ہے۔ اسی راستے پر چلنے میں اس کی فاعلیت ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولنا چلا گیا۔

رستم کو لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ جاہلیت میں لپٹی ہوئی اندھی عقیدتیں ہی تھیں جو مختلف جگہوں پر مختلف شکلوں میں نظر آتی تھیں۔ یہ قدرت اللہ کا نام بھی اسی سلسلے میں آتا تھا۔ اس نے اپنی شیعہ بازیوں سے ایک خلافت کو بے وقوف بنادیا تھا اور اس کی عقیدت کا دائرہ مسلسل پھیل رہا تھا۔ رستم نے کئی بار چاہا تھا کہ اس مکان کے آستانے میں بی بی نے اس کا ہاتھ نہ روکا ہوتا اور اس کا قائل بہرہ پڑھتے کو وہ جین جہنم واصل کرتا۔ اب وہ شخص اس کے ساتھ ساتھ بی بی کے خون کا پیاسا بھی تھا کیونکہ وہ بھگتا تھا کہ اس کی جیتی جیوی کے مارے

جانے میں بی بی کا ہاتھ بھی ہے۔ بی بی کی سلامتی اور زندگی کے بارے میں اُن محنت اندیشہ رستم کے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ ایک بار پھر اس کا پی چاکا کہ وہ سارے بندھن تو ذکر ساری رکاوٹیں پھانڈ کر اس برف زار سے نکل جائے اور امپلمنٹ ترین خطروں میں گھری ہوئی اپنی بی بی کی طرف بھاگتا چلا جائے لیکن کیسے؟ یہ سرد و زح کسی طرف سے راستہ نہیں دیتی تھی۔ یہ ناقابل شکست ہو کر رہ گئی تھی۔

”کس سوچ میں کھو گئے؟“ وہ اس کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

رستم نے کھڑکی کی دیوار سے ٹک لگا کر اپنے لمبی ریشمی بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ”کیا یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فائدہ ہمیں پہنچے گا؟ میرا مطلب ہے کہ ہم اس ناپے سے نکل نہیں گئے۔“

”ابھی یقین سے تو پوچھیں، پارسیا! اس میں اب کچھ نہ ہو گا۔“

وہ سارا دن بھی تذبذب اور کشش میں گزر گیا۔ وہاں بار نہیں جاسکا تھا۔ اس کے باہر جانے کے بعد ہی رستم کو ناصر اور شریف کی خیریت کا علم ہو سکتا تھا۔ اس پڑندہ بہتی میں لڑائی رک ہوئی تھی لیکن حالات سخت کشیدہ لگتے تھے۔ رات سخت سرجھی۔ آٹھ بجیں میں لکڑیاں بھی شوق ہو چکی تھیں۔ رات آخری پہر کو بی بی کی طرح چپکے سے رستم کے بستر میں گھس آیا۔ رستم سنانے میں رہ گیا۔ یہ بڑی تھی۔ وہ ایک بے باک معصومیت کے ساتھ رستم کے کندھے سے لگ کر لیٹ گئی جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو ایک کم عمر بچی جو رستم بے سجدہ ہوا پڑا۔ اس کی آنکھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اس کے سر سے وہ انکیلا نہیں تھا۔ وہاں کا بستر چند فٹ کی دوری پر تھا۔ وہ وزی کو ڈاڑھ لگا کر اس کا بھانڈا اچھوتا۔

لیکھت وہ گھبرا گیا۔ وہاں کے کھانڈانے کی آواز آئی۔ وہ رستم کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رستم نے گھٹنے ٹیک کر سے اوپر اٹھائے تاکہ لطف کا شامیانہ سامن جانے اور معلوم نہ ہو کہ وہ بستر میں تھا نہیں ہے۔

”رستم جاگ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ رستم نے بھاری آواز میں کہا۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں وہاں اس کا کندھا بانے نہ لگ جائے۔

”میں جا رہا ہوں۔“

”کب تک آؤ گے؟“ رستم نے لینے لینے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر ہو جائے مگر لوگ پریشان نہیں ہوں۔“

”ناصر اور شریف کے بارے میں ضرور جانتا۔“

”بے فکر رہو۔۔۔۔۔“ وہ اس نے کہا اور بھاری سبیل اڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔

لیکن مطلع اب بھی صاف نہیں تھا۔ ادھر عرصہ عورت خانی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ زوری نے رستم کا کان کھینچا اور اس میں گرم گرم گوشت کی۔ ”تم بہت اچھا۔“

وہ ہلکا انداز میں اپنی انگلیوں سے رستم کو گدگدائے لگی۔ رستم نہیں جانتا وہ خود ہی لطف کے اندر رکھی تھی کہ رستم بہت ہنسنے لگا تھا۔ جو بھی خانی چلی پر گندم مینے کے لئے دوسرے کمرے میں گئی، رستم نے لطف بنایا اور اسے دھکیل کر چارپائی سے نیچے پٹائی پر گرما دیا۔

وہ بے مزہ ہوئے بغیر بے آواز ہنستی رہی۔ رستم خیمے میں تھا۔ اس نے حسب عادت اپنے دونوں ہاتھ کراس کر کے کانوں کو بٹھوڑا اور اسے کی طرح کمرے سے ٹھک گئی۔

☆=====☆

کے نوے کو انی برف زاروں میں آبادی کو پہناتی ہستی کے حالات تہلکہ خیز تھے۔ یہ وسیع و عریض ہستی واضح طور پر دو دروازوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ بستی کے مغربی حصے اور کھوہ پر برف جان اور اس کے حقیقتوں کو اختیار حاصل ہو گیا تھا جب کہ مشرقی حصہ جو نجد جمیل کے ارد گرد کا ایریا تھا، بدستور شوق خان اور اس کے بیٹے ارفا کی تحویل میں تھا۔ یہ قلمی لڑائیوں کا وہی جانا پہچانا انداز تھا جس کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ رستم اور ناصر تک یہ معلومات بھی پہنچیں کہ برف جان کا دارالاسماں انی خان ابھی تک شوق کی تحویل میں ہی ہے۔

وہ دن سے لڑائی رکی ہوئی تھی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ دیر نہیں رکے گی۔

دونوں ہتھیار بگڑے ہوئے بددی میں مصروف تھے۔ ناصر اور شریف وغیرہ بالکل خیریت سے تھے۔ باقی درویش یعنی قیدیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ صرف دو دینم افراد جی بہوں کے ٹکڑوں سے معمولی زخمی ہوئے تھے۔ وہ اس کے اندازے کے مطابق لڑائی میں دونوں طرف کے کم و بیش ساٹھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ شوق خان کے ساتھیوں کی ہلاکتیں زیادہ تھیں۔ درجنوں افراد اس لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔

برق جان اور اس کے ساتھیوں کا رویہ رستم، ناصر اور دیگر درویشوں سے بھرتھا۔ خاص طور سے رستم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ خصوصی سلوک کیا گیا۔ اب رستم کے ساتھ ساتھ ناصر اور شریف کو بھی کھوہ کے اندرونی غار سے نکال کر اس کے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ تاہم ان تینوں کے پاؤں میں اس پائندہ ہستی کا لڑیہ مارک یعنی آہنی میز یا بدستور موجود تھی۔ بالیانا

نے برق جان وغیرہ کے سامنے اپنا یہ موقف برقرار رکھا ہوا تھا کہ وہ جان بوجھ کر گیارے کی طرف نہیں گئی تھی۔ وہ تیندک کی حالت میں چلتی ہوئی اتفاقاً وہاں پہنچ گئی تھی۔ بالیانا کو وہ بارہ اس لی رہائش گاہ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت وغیرہ کے لئے برق جان نے دو مسلح محافظ بھی مقرر کئے تھے۔

دو پہر کا وقت تھا مگر وہاں لوگ اٹھا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ بجلی بجلی برف گر رہی تھی۔ اس چاقوی زندگی انگلیٹیوں اور آتش دانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کی بیوی، رستم، ناصر اور شریف کے سامنے کھانا پر اس رہی تھی جب وہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیروے پر ہلکا سا جوش تھا۔ وہ بولا۔ ”رستم! تمہیں برف جان نے بلایا ہے۔ ابھی اسی وقت۔“

”کھانا تو کھا لینے دو۔“ وہ اس کی بیوی بولی۔

”یہ بلاؤ کھانے سے زیادہ ضروری ہے۔“ وہ اس نے جھٹکا کہا۔

تھوڑی سی دیر بعد وہ دونوں ایک فٹ گہری برف میں چلے ہوئے برف جان کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں نے پاک کی کھال کی بنی ہوئی برساتیاں اوڑھ رکھی تھیں۔ ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی کیونکہ رستم کو میز کی وجہ سے چلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ راستے میں رستم کو جگہ جگہ تین دن پہلے ہونے والی لڑائی کے شواہد نظر آئے۔ گھروں کی بیرونی دیواروں پر گولیوں کے نشانات تھے۔ دوسرے گھروں کی لاشیں ابھی تک برف میں دب چکی تھیں۔ ایک جگہ ایک جوان کو پہناتی کی لاش درخت سے جھونپ نظر آئی۔ اسے پھانسی دے دی گئی۔

برق جان کا گھر کافی وسیع اور اندر سے آرام دہ تھا۔ ایک بڑے قالیچے کے گرد گاوٹیں لگے تھے اور قہرے کی خالی پیالیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ شاید کچھ دیر پہلے تک یہاں اس نشست گاہ میں کافی لوگ موجود تھے۔ اب برق جان کے علاوہ صرف دو افراد مزید نظر آتے تھے۔ برق جان نے اپنے انگوٹے ہاتھ سے لوہے کی ایک الماری کھولی اور اس میں سے ارباکل کی گولیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں نکال کر دونوں افراد کو دیں۔ دونوں نے سپاہیانہ انداز میں برق جان کو سلام کیا اور باہر نکل گئے۔

برق جان کے عتبہ میں ایک مسلح لادائی ہوئی تھا۔ اس کی گول ٹوپی پر سرخ پھول تھا۔ برق جان نے اسے بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم اس کے ذریعے برق جان اور رستم میں جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی۔

برق جان نے رستم کو دھکیب کرتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا۔ ”تم نے جس طرح

اس بڑے شیطان کا راستہ روکا اور اس کی غلام کھاڑی سے ڈاکٹر لاینا کی جان بچائی، وہ قابلِ تعریف ہے۔

”آپ کی تعریف کا شکر ہے۔“ رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم ایک بہادر شخص ہو اور اس رات تمہاری بہادری میں نے وہی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس سے پہلے تم سمجھتے تھے کہ شاید تم پیچھے کی لڑائی میں ہی اپنا جوہر دکھا سکتے ہو۔ لڑائی بھڑائی میں مہارت کے علاوہ تم اسلحہ شاس بھی کلتے ہو۔“

”مجھے کوئی غمی نہیں اس معاملے میں، میں بہت سے لوگوں سے بہتر ہوں۔“

برق جان نے گڑگڑائی کی بے مند میں دبا کر چند منٹ سے لے کر بولا۔ ”میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم ہماری طرف سے اس بڑے نصیبت کے ساتھ دو دروازے کا پتہ نہ کر دے گے؟“

”آپ کا مطلب ہے یہاں لڑائی ہونے والی ہے؟“

”ہاں!۔۔۔۔۔ بس یہ برف پاری دیکھنے کی وجہ سے۔ وہ ہم پر حملہ کریں گے یا پھر ہم ان پر کر دیں گے۔“ برق جان نے ذرا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تمہارا دوست ناصر بھی اچھا لڑاکا ہے اور خاصی بارہاڑی کی زندگی گزار چکا ہے۔“

”بے شک آپ اسے بھی کسی سے کم نہیں پائیں گے۔“ رستم نے دھڑک سے کہا۔

”ہاں تو پھر بتاؤ۔ کیا تم اس بستی کو جس بڑے شیطان سے چاک کرنے کے لئے لڑائی میں حصہ لینا پسند کر دے گے؟“

رستم نے برق جان کی بھوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ ملے میں کیا لے گا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہم فتح کیے تو؟“

”جیسا بہت سی سہولتیں مل جائیں گی۔ رہائش کے لئے مکان مل جائے گا۔ بہتر کھانا، بہتر لباس ہو سکتا ہے اور کچھ عرصے بعد تمہاری قیدی کی حیثیت بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس کے بعد تم اس ٹاپ پر آزاد انھیں کی طرح رہ سکو گے۔ ممکن ہے کہ شاید یہی بھی کر سکو۔“ اس کی مثال تمہارے سامنے ہے۔“

رستم کا دل چاہا کہ برق جان سے پوچھے۔ ”اگر ہم واپس اپنے پیادوں میں جانا چاہیں تو پھر؟ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا جواب صرف اور صرف نفی میں ہوگا۔ اس معاملے میں یہ لوگ ہانکل سے جس تھے۔ رستم نے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔

”کس سوچ میں کھو گئے؟“ برق جان نے ذرا اچھے لہجے میں کہا۔

وہ اس نے رستم کو پکا سا ٹھوکا دیا۔ رستم طویل سانس لے کر بولا۔ ”میرے لئے عزت کی بات ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا ہے۔ میں اور میرے ساتھی اس لڑائی میں آپ کی طرف سے حصہ لیں گے۔ خاص طور سے ناصر اور میں ابھی صف میں رہنا پسند کریں گے۔ آپ ہمیں اپنا اسلحہ دیں، ہم اس اسلحہ کا حق ادا کر دیں گے۔“

برق جان کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ وہ بولا۔ ”میں بھی جیسا مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے جنگجو ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میں ان کی قدر کرنا بھی جانتا ہوں۔“

اس موقع پر رستم نے اپنے ساتھ قید رہنے والے دیگر افراد کی حالت زار کا بھی ذکر کیا۔ برق جان نے اپنے ایک سے دار ساتھی کو فوراً پایا اور اسے حکم دیا کہ خود راک میں فی بردہ ایک پاد دودھ کا اضافہ کیا جائے اور گوشت کی مقدار بھی بڑھائی جائے۔ اس کے علاوہ جب تک سڑی زیادہ ہے، ہر دوں سے کچھ دے کے اندر ہی کام لینا چاہئے۔ اس طویل گفتگو میں طے ہوا کہ رستم اور اس کے دونوں ساتھیوں کی بیڑیاں آج شام تک کھول دی جائیں گی۔ رات تک انہیں اسلحہ بھی فراہم کر دیا جائے گا۔

شام تک رستم، ناصر اور شریف کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔ کچھ دے کے خصوصی نگلش محافظ آئے اور انہوں نے خاص قسم کی ایک باشت لمبی چابیوں کی مدد سے یہ شخص بیڑیاں کھولیں۔ ان بیڑیوں نے رستم، ناصر اور شریف کے گھٹنوں پر آن مٹ نشان چھوڑے تھے۔ بہترین فواد سے پہنچی گئی یہ بیڑیاں اتنی مضبوط تھیں کہ کوئی یہ انہیں توڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا۔ ان بیڑیوں کے لیے مقامی زبان میں جو الفاظ استعمال کیا جاتا تھا اس کا مطلب وہاں نے ”قرقرم جیسا مضبوط“ بتایا تھا۔ یہ بیڑیاں اور کھانڈیوں کے پھل تیار کرنے والا ایک ہی گھرانہ اس قبیلے میں تھا اور وہ کئی پشتوں سے یہ کام کر رہا تھا۔

بیڑیاں کھولنے کے فوراً بعد وہاں سے ان تینوں کو رانگلیں بھی فراہم کر دیں۔ یہ بہترین روسی رانگلیں تھیں اور ان کے ساتھ قلعی بخش مقدار میں ایرویشن تھا۔ رستم نے کہا۔ ”وہاں! برق جان نے تو کہا تھا کہ رانگلیں بعد میں ملیں گی؟“

”گنا ہے کہ لڑائی اب زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔ شاید آج رات ہی شروع ہو جائے۔“

”برف پاری تو نہیں رہی۔“ ناصر نے کہا۔

”لیکن آج، رات ہی تو نہیں لگ رہی ہے۔“ اس نے بولا۔

لڑائی کے خیال نے وہاں کی بیوی کو غماص مند کر دیا تھا۔ وہ نکلز والی ہوئی گھر میں پھر

راہی تھی اور ساتھ ہی منہ میں دعائیں بھی پڑھ رہی تھی۔ بارہ تیرہ برس گزر چکے تھے مگر اس اور اس کی بیوی نے اس پر راہبستی میں اپنے دین سے ناتا جوڑ رکھا تھا۔ رستم نے اس کی بیوی کو کئی بار نماز پڑھتے بھی دیکھا تھا۔

بہتی کی نگاہوں میں شام کے فورا بعد لہلہ کے آثار محسوس ہونے لگے۔ مسلح جیسے شوق خان کے خلاف فخر سے بازی کرتے ہوئے ادھر سے ادھر حرکت کرنے لگے۔ گاہے بگاہے گھوڑوں کی مونچ دار ٹاپوں بھی سنائی دیتی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے آئینیں ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے لئے ہوائی فائر کر رہے تھے۔

رائٹلر رستم کی گود میں تھی۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ آج اسے ایسی لہریں ہمیشہ سے زیادہ یاد آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ "کہاں چلے گئے تم؟ رستم تم اتنے بے حس تو نہیں تھے۔ دیکھو میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھو دیکھ کر ہچکچاتی ہیں۔ اب آج آج ہاں..... اس سے پہلے کہ میری جان چلی جائے۔ میں تمہیں دیکھنے کی خواہش دل میں لٹائی کے نیچے چلی جاؤں..... ایک بار مجھے گلے لگاؤ۔"

وہ ان غیر مرئی سرگوشیوں کو سن رہا اور اس کا ہاتھ لٹاف کے اندر ایک تہ شدہ سفید کاند پر حرکت کرتا رہا۔ یہ کھر درا کاند رستم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی لماری کے ایک خانے سے نکالا تھا۔ چند دن پہلے وہ اس نے اس کاند پر ایک خاکہ سا بنا دیا تھا اور رستم کو کچھ سمجھایا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ناصر اور شریف نے چری برساتیاں اڑھیں اور گلی کوچوں کا جائزہ لینے چلے گئے۔ رستم ان گلیوں کے قریب بیٹھا رہا۔ اس کا ذہنی کدھا اب کافی بھر تھا۔ وہ اس جاسے کی بنیاتی تھا۔ رستم کے قریب آن بیٹھا تھا۔ "رستم انہیں یہ سبھی موقع ملا ہے۔ اگر تم اس لڑائی میں کارکردگی دکھانے کو برقی جان کی نگاہوں میں تمہیں اور تمہارے دوستوں کو خاص اہمیت حاصل ہو جائے گی اور اگر برقی جان یہاں کا سردار بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر تمہیں واقعی بہت فائدہ ہوگا۔ درحقیقت جس رات سے تمہاری کلباڑی شوقم خان کی کلباڑی سے ٹکرائی ہے تمہیں بہتی میں بڑا نامل مایا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا جانتے ہو اس؟"

"میں جانتا ہوں کہ تم اور ناصر بہت اچھا لگتے ہو۔ آج رات لڑائی تقریباً یقینی ہو چکی ہے۔ تم دونوں برقی جان کے قریب رہنے کی کوشش کرنا۔ تم خاص خاص لوگوں کی نظر میں آج آ"

گئے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ شریف کے حصے کا اینکونیشن بھی تم اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس سے فائدہ ہوگا۔"

رستم کا ہاتھ بدستور لٹاف کے اندر تھا۔ برفانی ہوا دیواروں سے سرخ رہی تھی۔ رستم نے لائسنس کی پچر پچرائی روشنی میں نیکی سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر غصے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں آج رات نہیں لوڑا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں آج رات..... یہاں سے جا رہا ہوں اور ناصر اور شریف بھی۔"

وہ اس کا منہ جھرت سے کھل گیا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہاں تم نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ ہمارے لئے سنہری موقع ہے لیکن لانے کے لئے نہیں یہاں سے نکلنے کے لئے۔ ہمیں یہاں سے لڑائی جھگڑے سے بچنا نہیں لینا۔ یہ سب ٹھیک کے حکم ایک ہی جیسے ہیں۔" وہ اس پر بیٹائی کے عالم میں رستم کو ہلکا کر رہا۔

رستم کے اندر ایک آگ سی روشن تھی۔ اس نے لٹاف میں سے ہاتھ نکالا اور تہہ کیا ہوا کھر درا کاند وہ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ اس پر سیاہ پال پوائنٹ سے ایک نقشہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ اس بلند پر فیلے ناؤ کا نقشہ تھا جو مشرق اور مغرب کی طرف قریباً چھ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ شمالاً جنوباً اس کی چوڑائی بھی چار چھ میل سے کم نہیں تھی۔ اس کے چاروں طرف مودی دیواریں اور قدرتی کھائیاں تھیں جو ہزاروں فٹ گہری تھیں۔ اس بلند پر فیلے کھلیئر نما ناؤ کے اوپر چڑھنے کا راستہ مشرق کی طرف تھا۔ اس طرف بھی ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی۔ تاہم یہاں ناؤ کی قدرتی دیوار بالکل مودی نہیں تھی۔ اس میں معمولی سی ڈھلوان موجود تھی۔

رستم نے اسی ڈھلوان پر اٹھ کر رکھنے ہوئے بولا۔ "وہاں اتہار کہا ہے کہ یہاں پاؤندہ بہتی میں آنے کا راستہ اس جانب ہے۔ کیا یہ راستہ قدرتی ہے یا بنایا گیا ہے؟"

وہ اس کے چہرے پر بے چینی کی بلیغاری تھی۔ "رستم! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ....."

"وہاں! رستم نے پھنکار دیتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ آخری ہے۔ تم جس راہوں تک بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہو گے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہم نے آج رات یہاں سے نکلنا ہے اور برصورت نکلتا ہے۔"

وہ اس خاموشی سے رستم کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے عضلات متنے ہوئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ جیسے وہ سمجھ گیا کہ رستم وہی کرے گا جو

کر سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں..... اگر وہ چاہے تو۔“

”اس کے چاہنے یا نہ چاہنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ایک بچے کی طرح سادہ اور کم فہم ہے۔ ہم اسے جو کہیں گے کرے گی۔ خاص طور سے تمہارے ساتھ جانے سے تو اسے کوئی انکار نہیں ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اسے تمہارے ساتھ بہت لگاؤ ہو گیا ہے۔ ہر وقت تمہارے آس پاس رہنا چاہتی ہے۔ وہ بالکل اول جلول ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تم اسے جس طرح چاہو چلا سکتے ہو۔“

رستم نے طویل سانس لینے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں واس۔ لیکن یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں سے نکلنے میں خطرات ہیں۔“

”نکلنے میں تو خطرات ہیں..... یہاں رہنے میں جتنی موت ہے۔ اس کی عمر نہیں سال ہو چکی ہے۔ وہ اب زیادہ بزرگ نہ نہیں رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے تباہی میں اسے ایک یا دو گارڈینوں کے ساتھ بیٹھتے پنہاں کر دیا جائے۔“ بیٹھتے کی حیران کن تفصیل رستم جان چکا تھا۔

اس موضوع پر کچھ دیر بات ہوئی پھر یہ طے ہو گیا کہ اگر آج رات لڑائی ہوتی ہے اور اس لڑائی کے دوران رستم اور اس کے ساتھی چاہو سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو ذری بھی ان کے ساتھ ہوگی۔

اس گفتگو کے بعد رستم اور واس ایک بار پھر کاغذ پر سینے دتی نقشے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رستم نے اٹھتے ہوئے اعزاز میں کہا۔ ”واس! کیا یہ جگہ واقعی اسی طرح ہے جس طرح تم نے اس اسٹاک میں دکھائی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے ارد گرد کے علاقے سے ہزاروں فٹ اوپر اُبھری ہوئی ایک ہموار سطح جس کے چاروں طرف قدرتی طور پر عمودی دیواریں ہیں؟“

”بالکل۔۔۔ ایسے یہ ہے۔ اس کو تم ہموار سطح والا ایک مکعب پہاڑ بھی کہہ سکتے ہو۔ دنیا کے مختلف کوهستانی علاقوں میں اس طرح کے رقبے پائے جاتے ہیں۔ یہ برفانی اور نمبر برفانی دونوں طرح کے پہاڑوں میں ہوتے ہیں۔ سری لنکا میں ایسے ایک مکعب پہاڑ کو دنیا کا آخوواں جوبہ قرار دینے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ زیر زمین عظیم الشان پانیوں کی حرکت سے پہاڑی سلسلوں میں جو ٹوٹ چوٹ ہوتی ہے اس میں ایسے رقبے مودار ہوتے ہیں۔ ہماری اس زمین پر لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے یہ کوهستانی سطع قدرت کی منافی کا حیران کن

کہہ رہا ہے۔ اس نے گڑگڑائی کی گئی ہوئی میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نے گڑگڑائی کی خوشبو والا آواہاں آواہاں میں چھوڑ کر بولا۔ ”کیا تمہارے دونوں ساتھیوں کا بھی یہی فیصلہ ہے؟“

”وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم چاروں جانے کے لئے تیار ہیں۔“

”چوتھا کون؟“

”ڈاکٹر مالین۔“

”ناصرا اور شریف ابھی ڈاکٹر مالین کی طرف گئے ہیں؟“ واس نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ کسی اور کام سے گئے ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں۔“

اچانک دروازے پر دھک ہوئے تھے۔ ساتھ ہی سیٹرفڈ کتوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ واس نے چار کردار دھک دھک۔ برق جان کے دھچکے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ پوری طرح سنبھلے تھے۔ ان کے چہرے پر تمہارے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی نشہ آور مشروب کے زیر اثر ہیں۔ انہوں نے مقامی زبان میں بات کی اور واس کی وساطت سے رستم کو بتایا کہ دو چار گھنٹے کے اندر لڑائی شروع ہو سکتی ہے۔ جیسے ہی ”کام“ شارت ہوا ان تینوں کو اطلاع دے دی جائے گی۔

ان کے جانے کے بعد واس اور رستم پھر انجینیئری کے سامنے آن بیٹھے۔ باہر برف باری مسلسل دھوری تھی۔ واس یکسر خاموش تھا۔ رستم نے کہا۔ ”ہمارے جانے سے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم نے کسی سے ہماری سفارش نہیں کی ہے۔ ہمیں برق جان نے جو رعایتیں دی ہیں اپنی مرضی سے دی ہیں۔“ واس نے اثبات میں سر ہلایا ہم منہ سے کچھ بولا نہیں۔ تھوڑے سے وقف کے بعد رستم نے کہا۔ ”واس! اگر تم بھی یہاں سے نکلنا چاہو تو ہمارا ساتھ دے سکتے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہم اسے کر سکتے ہیں۔ ہم کر دکھائیں گے۔ یہاں پر شدید آفراتفری کے حالات ہیں، یہ حالات بھی ہماری مدد کریں گے۔“

واس خالی خالی نظروں سے اودھ نیچے انکاروں کو دیکھتا رہا۔ شاید وہ خود بھی ان انگوروں کی طرح اپنی حرارت کو چھو چکا تھا یا شاید راکھ ہی ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے لب ہلائے۔ ”نہیں میرے دوست! جہاں اتنی گرمی نہ ہے۔ باقی کی بھی گزر جائے گی۔ نہیں..... اب نہیں..... اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ لیکن.....“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا؟“ رستم نے اسے اسکاہیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”کیا تم ذری کو یہاں سے نکالنے کی کوشش

نمونہ ہیں۔ ناٹک پر بہت کے "جنوبی چہرے" کو تم جانتے ہو؟"
رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

"ناٹک پر بہت کے اس رخ کو "روہل فیس" کہا جاتا ہے۔ سمجھو کہ یہ ایک ساڑھے چار ہزار میٹر اونچی عمودی چٹان ہے جو دیکھنے والے کو ششدر کر دیتی ہے۔ ذرا غور کرو، ساڑھے چار ہزار میٹر یعنی تقریباً 14700 فٹ اونچی ایک چٹان۔ ان پہاڑوں کے زاویے اور رخ ایسے ہی ناقابل فہم ہوتے ہیں۔"

رستم کی نگاہیں اس کچھ پر جمی تھیں۔ وہ اس برفانی ٹاپو کے ایک جنوبی کنارے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اسی کنارے کے بارے میں بتایا تھا، جہاں سے رسیوں کے ذریعے اترنے کی کوشش کی جاسکتی ہے؟"

واس نے تعجب سے رستم کو دیکھا۔ "تم ٹھیک تو ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ تم اس برفانی رات میں ان عورتوں کے ساتھ اس جگہ سے اترنے کی کوشش کرو گے؟ اور وہ بھی رسیوں کے ذریعے؟"

"رسیوں کے ذریعے نہیں۔۔۔۔۔ کوہ پیالی کے مکمل سامان کے ذریعے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارے پاس پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کا سامان موجود ہے۔"

واس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ کہاں سے آیا سامان؟"

رستم نے اپنے بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور واس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے ان انگریز میاں بیوی کا ذکر کیا تھا، جو سات آٹھ سال پہلے سب مکمل کی کھون میں یہاں آئے تھے اور پکڑے گئے تھے۔" واس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "عورت تو چار پانچ سال پہلے نمونے سے مرئی تھی لیکن وہ انگریز شخص ابھی زندہ ہے۔"

"اس کا نام جاسنس ہے۔ تم اسی کی بات کر رہے ہو نا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ اسی کی۔۔۔۔۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو، ان میاں بیوی کے سامان میں کوہ پیالی کا سامان بھی تھا۔ یہ سامان دیگر اشیاء کے ساتھ شوقم کے محققوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔"

واس نے اچھے ہوئے انداز میں اقرار میں سر ہلایا۔ غالباً اسے یاد رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ "وہ سامان اب کافی عرصے سے جاسنس کے پاس ہے۔"
"وہ کیسے؟" واس کی حیرت بڑھ گئی۔

"ہاں، جاسنس نے دو تین سال پہلے اسی کی طرح حاصل کر لیا تھا۔ سامان کا تھیلہ دوسری بہت سی بیکار چیزوں کے ساتھ گودام میں پڑا تھا۔ جاسنس نے گودام کے ایک نگران کو اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ٹکڑی کی تین کرسیاں دیں اور بدلے میں تھیلہ لے لیا۔ وہ تھیلہ اب تک جاسنس کے کھر میں جمی ہوئی ہے۔"

واس کی پیشانی پر سوچ کی گلیمر پر پھیلنے لگی تھی۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔
"تو۔۔۔۔۔ وہ جان (جاسنس) بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟"

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ناصر اور شریف اسی کی طرف گئے ہیں۔۔۔۔۔ پروگرام کو آخری شکل دینے۔"

"تم رستم ہی نہیں۔۔۔۔۔ چھپے رستم بھی ہو۔ چپکے چپکے لگ رہے اور مجھ سے چھپاتے بھی رہے۔"

"میں تمہیں کسی بھی منصوبہ بندی میں شریک کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ویسے بھی جاسنس سے رابطے اور پروگرام بنانے کا سارا کام ناصر نے انجام دیا ہے۔"

واس نے گز گز کی کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ "رستم! جو کچھ تم کرنا چاہ رہے ہو یہ ناممکن تو ثابت نہ ہو لیکن بہت مشکل ضرور ہے۔ خاص طور سے رات کے وقت رسوں کے ذریعے نیچے اترنا۔"

"جو لوگ کوہ پیالی کو پوری طرح سمجھتے ہیں واس، وہ کہتے ہیں کہ اگر سامان پورا ہو تو یہ کام اتنا مشکل نہیں سمجھنا نظر آتا ہے۔"

"لیکن بات صرف نیچے اترنے کی تو نہیں ہے۔ ہمیں وہاں پر موجود چہرے داروں سے بھی تو نمٹنا ہو گا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو واس۔۔۔۔۔ مکمل مسئلہ نیچے اترنے کا ہی ہے۔ چہرے دار وہاں دو چار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"

کچھ دیر بعد ناصر اور شریف بھی آ گئے۔ ان کی برساتیوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ پہاڑوں پر دبا دبا جوش تھا۔ بیڑیاں کھٹنے کے بعد وہ خود کو پندوں کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے اور پیہل چٹان ان کے لئے ایک قزح جیسا ہو گیا تھا۔

رستم نے ان دونوں کو بھی گفتگو میں شریک کر لیا۔ ناصر نے اس فیصلے کو سراہا کہ زری بھی ان کے ساتھ جائے گی۔ درحقیقت زری کے لئے اس کام میں کسی طرح کا کوئی ریسک نہیں تھا۔ بالضرر وہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہتے اور پکڑے بھی جاتے تو زری سے کسی طرح کی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ موت سے بڑی سزا بھلا اور کیا ہو سکتی تھی اور یہ سزا تو اس بے چاری کو بغیر کسی جرم کے بھی ملنے والی تھی۔ وہ گارنی تھی اور گارنی کا مقدر ہی "جوانی کی موت" تھا۔

ناصر نے رستم کو بتایا۔ "رستم بھائی! جانیں پوری طرح تیار ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ یہاں بڑھتی کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس بہت سی اسکرپٹنگز موجود ہیں۔ یہ نکلزی اس نے اپنے پیچھے پر لاد لی ہے۔ گوہ پانی کا سامان اس نکلزی کے پیچھے موجود ہے۔ جونہی لڑائی شروع ہوئی وہ اپنا پیچھے لے کر گھر سے باہر نکل آئے گا اور ہمارا انتظار کرے گا۔"

"زری کہاں ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ یہاں آس پاس ہی گھوم رہی ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور جاننے کے لئے کہتا ہوں۔" وہ اس نے کہا۔ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں تعویذی سی اداسی آگئی۔

وہ اس اپنی گرم فوٹی درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ رستم، ناصر اور شریف اپنے منصوبے کی تفصیلات پر غور کرنے لگے۔ سب سے اہم فیصلہ تو انہیں یہ کرنا تھا کہ لڑائی کے دوران میں وہ کب اور کس سرخ سے اپنے نازک کٹی طرف بڑھیں گے۔ شریف تھوڑا سا نرم ہو دکھائی دیتا تھا مگر جب ناصر نے اسے بتایا کہ پیادے سے اترنے کے لئے رستے سے چھوٹنا نہیں پڑتا بلکہ یہ ایک طرح کا جھولا سا بن جاتا ہے جس میں جھک کر اور تھوڑا تھوڑا ٹھک کر پیچھے آتا ہوتا ہے تو وہ قدر سے ہنسٹن نظر آنے لگا۔

چند منٹ بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ یہ جان کر رستم کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ برابر برق جان کے محاذ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قبل جنگ پہنچے والا ہے۔ روی رائلز پر رستم اور ناصر کے ہاتھوں کی پڑ جوش گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

دروازہ کھلنے پر محاذ اندر آئے۔ انہوں نے جو اطلاع دی وہ ان کی توقعات کے برعکس تھی۔ انہوں نے اپنی اطلاع سے واس کو آگاہ کیا۔ واس نے رستم اور ناصر کو بتایا۔ "برف باری مسلسل ہو رہی ہے۔ گناہ کے کچھ رات کے لئے لڑائی مل گئی ہے۔ شوم کے قریب دو سو مسلح محافظ جو جھیل کے مغربی کنارے پر آگئے تھے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے گئے ہیں۔"

"کہا تم آرام سے ہو سکتے ہیں؟" ناصر نے پوچھا۔

"یہ لوگ تو بیکر رہے ہیں کہ سو سکتے ہیں۔" واس نے جواب دیا۔

تباہ کنہ عروج پر پہنچ کر ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ سب ایک ایک کر کے سوئے گئے۔ ہستی کے کلی کوچوں میں بھٹکتی ہوئی سنسنی بھی بترج و مدم ہو گئی۔ رات کے بیخ بستہ سنانے میں گاہے بگاہے ایک مونج سی پیدا ہوتی تھی۔ یہ ان برفانی توڑوں کی آواز تھی جو ایک ڈھلوان پر پس پس کریم جھد آتی گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے تھکے ہوئے جسم پر ایک دم رستم کا دل چاہا کہ اس سیاہ رات کے بجائے ایک پگھلی صبح ہوتی۔ پائیاں تھکے کے بجائے کوئی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس اپنی گزر رہا کے کنارے کھڑے ہوتے اور توڑوں کے گرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

وہ کیوں اتنی شدت سے یاد آتا تھا؟ کیوں... کیوں؟ اسے اپنی سانسوں میں اس چھڑے سے سانس کی جسم کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ اس کو کھینچے اور بھونکنے کی طلب اس کے اندر اتنی شدت سے جاگتی تھی کہ اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئے لگتی تھی۔ کچے بعد دیگرے اس کے ارد گرد سب سو گئے لیکن وہ چاہتا رہا۔ اس کے ارد گرد لائسن کی مدھم روشنی اور لائسن میں بچھتے ہوئے انگوروں کی نواں حرارت تھی۔

اس کے ذہن کے ایک حصے نے جواب دیا۔ "بی بی... بی بی... اس سے پہلے بھی کچھ نہیں اس سے کسی بھی پتہ نہیں۔"

ذہن کے کسی اور گوشے سے پکارا بھری۔ "لیکن ان سینکڑوں درد بھری جینوں سے کیسے پیچھا چھڑاؤ گے جو ڈے ڈے کے ڈھلوانوں پر ابھری تھیں اور گولیوں کی بارش میں آہستہ آہستہ دم توڑ گئی تھیں۔ اپنے ان قدم رستہ ساتھیوں کو کیسے فراموش کر دے جنہوں نے بے بس ہو جانے کے بعد جان بچانے کے لئے ڈھنچریاں بٹلر کے سامنے ہاتھ کھڑے کئے تھے لیکن انہیں جھون ڈالا گیا تھا اور تم اس کا پیچھا صرف لڑو کا خون کیسے بھلاؤ گے جس نے تمہارے سامنے ڈھنچریاں بٹلر کے پاؤں کے نیچے دم توڑا تھا۔ تم ان گولیوں کی موت کی قیمت تک نہیں بھلا سکتے۔ پتھو ہار کی گھائیوں میں بہہ جانے والا ہر خون قطرہ، ڈوب جانے والی ہر نبض اور بلند ہونے والی ہر برفا دہتہارا پیچھا کرے گی۔"

"تو پھر... پھر میری جدو جہد کا کیا فائدہ؟ میں اس خنڈی دوزخ سے نکل بھی گیا اور اپنی بی بی تک پہنچ بھی گیا تو... جہادی تو پھر بھی ساتھ رہے گی۔ بی بی کے ساتھ زندگی گزارنا تو پھر بھی انصیب نہیں ہوگا۔ یہ تو بڑی جہادی ہوگی۔"

وہ بہت دیر تک اپنے آپ سے دست و گریباں رہا۔ خودی دلائی و بنا رہا خود ہی انہیں

حرف فلذ کی طرح مٹاتا رہا۔ یہ بات تو سچی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کا چہ حایا ہوا قرض بھلا کر بی بی کے ساتھ کسی پڑسکون گوشے کی طرف ہجرت نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف بی بی سے اجازت لئے بغیر شاید مرنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس کے جذبے انوکھے تھے، اس کا عشق عجیب تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ میں کسی کو مجازی خدا کا درجہ دیا تھا اور یہ ایک عورت تھی۔ وہ سوچتا تھا، کیا کسی عورت کو مجازی خدا کہا جاسکتا ہے یا پھر اس کے لئے کوئی اور لفظ استعمال ہونا چاہیے۔ اس چار دیواری سے باہر اس ہستی سے آگے تا یک پہاڑوں پر، پہاڑی نالوں پر، بگھنیز پر اور ان سے آگے دور کے ٹوکی عظیم دھلوانوں پر برف گرئی رہی اور وہ سوچتا رہا۔ خیالات کی دھند میں بس ایک موبہ موب سارا ستارے نظر آرہا تھا اور وہ یہ تھا کہ۔۔۔ چند دن۔۔۔ یا چند ہفتے۔۔۔ یا پھر چند مہینے بی بی کے ساتھ او وہ جب بی بی اکیلی نہ رہیں۔ انہیں ایک "مضموم آسرا" مل جائے تو پھر خدا حافظ۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔ کیونکہ یہی اس کا شے شدہ مقدر تھا۔

سوچتے سوچتے وہ دل میں ہنس دیا۔ اس کے خیالات اسے کیسے کیسے سراپ دکھا رہے تھے۔ وہ بی بی سے دوبارہ ملنے کی باتیں یوں سوچ رہا تھا جیسے وہ راولپنڈی کے بیروں دھانی اڑے سے بس میں بیٹھنے گا اور روکٹ ہستی چاہیئے گا۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ اس سے کئی بڑا گنا زیادہ مشکل تھا۔ وہ ایک خنڈ سے جنم کے قیدی تھے اور یہ جہنم گہرا نہیں تھا۔ بلند تھا۔ کئی ہزار فٹ بلند۔ ایک ناقابل بیان درد کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ کر رہ گئی۔

ایک جاگ وہ چونک گیا۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا۔ "بی بی" اس کی چار پائی کے بالکل پاس چٹائی پر بیٹھی تھی۔ یہ "بی بی" پچھلی دفعہ بڑی خاموشی سے اس کے ہنر میں ہی کس گئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے رعایت کی تھی اور سر ہانے کی طرف پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رستم نے اس "دو پاؤں والی بی بی" کو کھورتے ہوئے سرگوشی کی۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ اپنی چاچا کے پاس۔"

"چاہئے کہا ہے۔"

"کیا کہا ہے؟"

"کہ میں تم کے ساتھ جاؤں گا۔"

رستم بیٹھا گیا۔ "وہ تو جب جاؤں گا تب جاؤ گے ناں۔ اب یہاں ڈیرہ کیوں ڈالا ہوا

"ڈیرہ۔ کیا ہوتا؟"

"میرا سر ہوتا۔ اب جاؤ یہاں سے۔ چاچا تہار سے سر پر ایک بال نہیں چھوڑے گا۔" رستم نے منطقی سرگوشی کی۔

"میں نہیں جانتا۔ تم مجھ کو چھوڑ جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں چکا تا ہوں تہار سے چاچا کو۔" رستم نے سرگوشی کی۔

وہ ایک دم جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ "ٹھیک ہے۔ مم۔ میں جاتا۔ لیکن تم بہت آجھا۔ تم مجھ کو ہٹاؤ۔ ہم کہاں جاتا؟"

رستم کے جی میں آئی کہ اس کے کولے پر لات بٹھا کر اسے سے باہر پھینک دے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے ضبط کیا اور کہا۔ "تم کو بہت اچھی جگہ لے کر جاؤں گا تم ایک دم خوش ہو جاؤ گی۔"

وہ سن کر ہی خوش ہو گئی۔ اس کی دھجھ گاہی ہو گئی۔ وہ چند لمبے تعریفی نظروں سے رستم کو جتنی رہی۔ تب اس نے اپنا کمر رستم کے رخسار پر زور سے دھکی لی اور کھی کھتی کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

سہارا دن برف باری رکی رہی گشتام ہوتے ہی ایک بار پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ گنا تھا کہ آج بھی دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر مورچہ بند رہ گئے لیکن جو کچھ ہوا کیا یک ہوا۔ پچھلے کدو سے کچھ فاصلے پر دقتی بموں کے تین چار زوردار دھماکے ہوئے پھر ہاتھ اندھا دھند ٹانگے شروع ہو گئی۔ ہستی کی گلیوں میں اٹھل چٹ گئی۔ گھوڑے دوڑنے لگے اور لاکارے بچ بہت تھکا کر گئے۔

وہ اس دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے سفید چہرے کے ساتھ تپا کر لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ اس نے ساتھ ہی وہ زری کو گلے لگا کر روئے لگا۔ وہ اس کی پیوی بھی آبدیدہ تھی۔ رستم نے زری کا بازو پکڑا اور اسے باہر تارکی میں لے آیا۔ ناسر، شریف اور باینا اس کے عقب میں تھے۔ وہ ٹھنڈوں سے اس صورت حال کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ اس اور اس کی پیوی سے رخصت ہو کر دوڑتے ہوئے ہستی کے مشرقی کنارے کی طرف بڑھے۔ گلیوں میں تہلکہ مچا سچا ہوا تھا۔ کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔

دو تین بر لمب گلیوں میں سے گزرنے کے بعد ان کا پھٹنا سچی ان کے ساتھ شامل ہوا۔ یہ جاسن تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر صحت بہت اچھی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی پیوی چھوٹی دانھی تھی اور وہ ستای لباس میں مقامی ہی نظر آتا تھا۔ گلو یوں سے لہے سے ان کے ٹھکر کی رہی اس کے ہاتھ میں تھی۔

”کوئی پوچھے گا نہیں کہ اس وقت گلوایاں کہاں لے کر جا رہے ہو؟“ ناصر نے جانسن سے انگریزی میں پوچھا۔
”اس وقت کسی کو کچھ پوچھنے کا ہوش نہیں ہے۔“ جانسن نے کہا۔ ”اگر کوئی پوچھے گا تو بھی اس کا منقول جواب موجود ہے۔“

”وہ کیا؟“

”آسمانے لشکری مورچوں میں موجود ہیں۔ وہاں آگ جلانے کے لئے ایندھن ہستی سے ہی جاتا ہے۔“

ایک فائرنگ میں جیزی آگئی۔ مشرقی کنارے پر تاریکی میں ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹی نظر آئیں۔ ایک دشمنی کو ہاتھوں پر اٹھائے تین افراد جیزی سے ہستی کی طرف آ رہے تھے۔ اس شخص کے سر پر کھڑائی لگی تھی۔ اس کے اوٹی کیپڑے بولہبان ہو رہے تھے۔ ہستی سے باہر نکلتے ہی برق جان کے چند مساعیوں نے رستم اور ناصر کو دیکھ لیا۔ انہوں نے ان دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک چھوٹے دتے کی کھڑائی تھادی اور اشاروں سے بتایا کہ ابھی تو فائرنگ ہو رہی ہے لیکن دست پہ دست لڑائی کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ اس لڑائی میں یہ کھڑائی کام آئے گی۔
رستم نے ناصر سے کہا۔ ”ہم دونوں پر برق کے آدمیوں کی خاص نظر ہے۔ ہم نے ابھی اپنا رخ تبدیل کر لیا تو ان کو شبہ ہوگا۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”بہتر ہے کہ ہم دونوں کچھ دیر کے لئے لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ باقی سب اپنے رخ پر بڑھتے جائیں۔ موقع ملنے ہی ہم بھی ان کے پیچھے چلے جائیں گے۔“
ناصر نے انگریزی میں یہ بات جانسن کو سمجھادی۔ اب مسئلہ زری کا تھا۔ رستم نے اسے اور مالینا کو جانسن کے ساتھ جاکر دیکھا تو زری اٹک گئی۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ تم کے ساتھ جاؤں گا۔ تم بہت آچھا۔“

”یہ سب بھی بہت آچھا۔“ رستم نے دانت چیں کر کہا۔ ”چلو جاؤ ان کے ساتھ۔“

رستم کی گہری سچیدگی دیکھ کر وہ ذرا سا گھبرائی لیکن وہیں کھڑی رہی۔ اسے سمجھانے میں رستم کو دو تین منٹ لگے۔

گہری تاریکی اور برف باری میں وہ لوگ مختلف اطراف میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ چھ کے چھ پہلے ایک ساتھ ایک ہی رخ پر چلتے رہے پھر رستم اور ناصر کا رخ تو لڑائی کے

میدان کی طرف رہا مگر باتوں نے غیر محسوس طور پر اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ قریباً ایک سو میٹر آگے برفی جان کے جان ٹاروں نے ایک بلندی پر پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں اور اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ برج کے ایک سفید درخت کے پاس برق جان خود موجود تھا اور اپنا اکوتا ہاتھ لہرا کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ رستم اور ناصر نے بھی ایک اوٹ کے پیچھے لیٹ کر دی رائفلوں کے کندے اپنے کندھوں سے لگا لئے اور فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف سمت سے آنے والی گولیاں جب برست کی شکل میں برف سے ٹکرائی تھیں تو برف پانی کی بو چھڑائی طرح ہوا میں اچھلتی تھی اور رائفل پر داروں پر گرتی تھی۔

رستم اور ناصر کو فائرنگ کر تے پہ مشکل دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ برق جان کے قریباً ایک سو ساتھیوں نے اچانک ایک پُر جوش نعرہ بلند کیا اور پوزیشنیں چھوڑ کر آگے کی طرف دوڑے۔ وہ دشمن پر چارج کر رہے تھے۔ رستم اور ناصر کو دیکھتے ہی دیکھتے چاروں کرنے والے کئی افراد فائرنگ سے زخمی ہو ہو کر گرے تاہم باقی سب افراد اپنے غلطوں کی پوزیشنوں تک جا پہنچے۔ وہاں سے کچھ افراد تو بھاگ کر اپنی پچھلی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ جوڑنے رہے ان کے ساتھ برق جان کے ساتھیوں کی دست پہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں دقتی بموں کے چند خوفناک دھماکے بھی ہوئے۔ رخ تبدیل کرنے کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ رستم اور ناصر پٹی چھوٹے اٹھے اور تازہ مگر ہوئی برف میں راستہ بناتے جنوب کی سمت پھٹے لگے۔ سخت سردی کے سبب رستم کی مشاعرہ ٹانگ میں ٹپٹھن تھی اور وہ ٹکڑا جاتا ہوا چل رہا تھا۔

قریباً پانچ منٹ میں وہ فائرنگ اور وحشتانہ لگاؤوں کی آوازوں سے کافی دور نکل آئے۔ انہیں رستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ انہیں کوئی حفاظت بھی دکھائی نہیں دیا۔ جلد ہی انہیں برف پر اپنے ساتھیوں کے قدموں کے گہرے نشانات مل گئے۔ فخر کے پاؤں کے نشانات نے تعذیب کی کہ یہ ان کے صراہوں کے لغووشی پائی ہیں۔ کچھ فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد وہ پھرا کھٹے ہو گئے۔ جانسن، شریف، زری اور مالینا برف کے ایک قدرتی سائبان کے نیچے کے ہوئے تھے۔

رستم کو دیکھتے ہی زری ایک کر آئی اور اس کے بازو سے لگ کر کھڑی ہو گئی، جیسے وہ ایک چھوٹی سی بچی ہو اور اسے راستہ بھولنے کا ڈر ہو۔ رستم نے شریف سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں کیوں رک گئے ہو؟“

”ان کو رے صاحب سے پوچھو مگر اچھی یہ دکھائے تو ہم بھی رک گئے۔“

رستم نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر جانسن ایک درخت کے سونکے سے لٹک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے صلیے اور لباس کے اعتبار سے بالکل مقامی ہی دکھائی دینے لگا تھا۔ ماحول اور ان کے ماحول کی زندگی پر بڑی تیز رفتاری سے اثر کرتے ہیں۔

رستم نے سوالیہ نظروں سے ناصری کی طرف دیکھا۔ ناصری جانسن کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے کی وجہ دریافت کی۔ دونوں کچھ دیر تک آپس میں کھسکھس کرتے رہے۔ تب ناصری دھیمے قدموں سے رستم کی طرف آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کسی پرندے کا منہ دو جسم تھا۔ رستم نے غور سے دیکھا۔ یہ برقانی علاقوں میں نظر آنے والا مرغ زرین تھا۔ غالباً اسے کوئی آوارہ گولی لٹی کرتے ہوئے گزر رہی تھی اور وہ تڑپا چڑھتا ہوا یہاں آگرا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”جان صاحب کے کہنے کی وجہ۔“

”مطلب؟“

”تمک کی کان میں ہر شے تمک ہوتی ہے۔ یہ رستم خیال انگریز ہے لیکن سات آٹھ سال یہاں گزارنے کے بعد اس پر بھی ”تو تم“ کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر مسافر کو رستے میں مرغ زرین کے پر پڑے تو ہونے والی جانیں تو سخت بدھنگی بھی جاتی ہے۔ سفر کا راز وہ ترک کر دینا چاہیے یا راستہ بدل لینا چاہیے۔ یہاں تو پردوں کے بجائے پورا پرندہ طا ہے۔“

”یار سمجھاؤ اس باند کو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ رستم نے جھلا کر کہا۔

ناصر پھر جانسن کے پاس چلا گیا۔ دونوں میں دو تین منٹ بات ہوئی۔ پھر ناصر اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ پرندے کو برف میں دبا کر انہوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔ وہ مسلسل ناپ کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لڑائی کا ہنگام دم بہ دم ان سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے خچر کو چیلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ خچر کو روک کر اس میں لدے سائینس میں سے اپنا مطلوبہ سامان نکال لیا اور اسے آزاد کر دیا۔ مطلوبہ سامان ایک رک سیک (تھیلے) کی شکل میں تھا جس میں کوہ پیما کی کمالات موجود تھیں۔ یہ رک سیک ناصر نے اپنی پشت پر فٹن کر لیا۔ خچر سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقی ماندہ قاصدہ نینتا تیزی سے طے کیا اور قریب آدھ گھنٹے میں اس مقام تک پہنچ گئے جہاں اس کمب پہاڑ کی ہموار سطح کی دم قدم ہو جاتی تھی اور اسے سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔ اس کھائی میں اتارنے کا مطلب اس کمب پہاڑ پر سے اترنا تھا۔

کنارے کے قریب پہنچ کر دو مقامات ہو گئے۔ ناصر نے شریف اور جانسن کو سمجھایا۔ ”تم چاروں یہاں رہو گے۔ ہم دونوں آگے جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ تم بھی اپنی کن جھار کھو اور اگر کوئی خطرہ نظر آئے تو فائر کر کے ہمیں اطلاع دو۔“

”آپ گھر یہ نہ کریں جی۔“ شریف نے پنجابی میں تسلی دی۔ وہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک وہ دلیہ اور چوکس شخص تھا مگر اس قسم کے حالات سے اس کا بھی واسطہ نہیں پڑتا۔

رستم اور ناصر احتیاط سے آگے بڑھے۔ یہاں ہوا چل رہی تھی اور سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ جلد ہی ان دونوں کو گلزلی کا وہ مضبوط کین نظر آگیا جو برف باری سے یکسر سفید ہو رہا تھا۔ رستم اور ناصر کی معلومات کے مطابق اس طرح کے کینیں اس ناپ کے کنارے اہم جگہوں پر بنائے گئے تھے۔ ان کا مقصد آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنا تھا۔ گلزلی کا کین گہری تاریکی میں ڈوبا برف کی موٹی چادر اوڑھتا چلا جا رہا تھا۔ گلتا تھا کہ یہ کینیں کسی کے استعمال میں نہیں اور اگر کوئی یہاں رہتا بھی ہے تو ہی احوال اس پوسٹ کو خالی چھوڑ کر جتنی کے جنگلے میں شریک ہو چکا ہے۔

”مطلع صاف لگ رہا ہے۔“ ناصر نے سرگوشی کی۔

”گلتا تو ایسے ہی ہے مگر۔۔۔“ رستم کو کھڑو اور موڑ چھوڑنا پڑا۔ ”یہ آواز سن رہے ہو تم؟“

رستم نے کہا۔ ناصر کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

”اوہ گاؤ۔ یہ کون کی آواز سن رہے ہیں۔“ ناصر نے تصدیق کی۔

”جاؤ گی ہی طرف آرہے ہیں۔“ رستم نے کہا۔

دونوں تیار ہو گئے۔ صرف ایک منٹ بعد انہوں نے دو سینٹ برنارڈ نسل کے کتوں اور دو کھانڈوں کو اپنے سامنے پایا۔ کھانڈوں کے سر اوپر چڑھے چڑھے برساتیوں کی ٹوپیوں میں جیسے ہوتے تھے۔ چھوٹی بال کی روئی رانگھیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ رستم اور ناصر کو دیکھتے ہی انہوں نے زور سے لگا مارا۔ غالباً اپنی زبان میں وہ انہیں دھمکا رہے تھے اور ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دے رہے تھے۔

رستم اور ناصر کے پاس مکالمے کی فرصت نہیں تھی اور نہ وہ ایسا کرنا چاہتے تھے۔ رستم اور ناصر نے سب سے پہلے اپنی طرف لپکے والے کتوں کو نشانہ بنایا۔ ایک ایک گولی سے وہ دونوں لڑھک کر برف پر گرے اور دو طوں پر پھسل گئے۔ اس کے بعد کھانڈوں کی باری آئی۔ رستم کی چٹائی ہوئی گولی کا حفاظت کے مین سرنگی پر اور وہ مردہ پچھلی کی طرح چھپاک سے تازہ جگہ

برف پر گر۔ دوسرا محافظ زیادہ پھر تھلا نکلا۔ اس نے خود کو اونچے سے منہ برف پر گرایا اور ناصر کے فائر سے بچ نکلا۔

”خبردار۔“ ناصر گرجا۔

لفظ تو محافظ کی سمجھ میں نہیں آیا ہو مگر یہ بات ضرور سمجھ میں آگئی کہ وہ نشانے پر ہے۔ اس نے اپنی رائفل خود سے دور پھینک کر اپنی گتت کا اعتراف کر لیا۔ رستم اور ناصر بھاگ کر اس کے قریب گئے۔ وہ دور سے نری طرح کرا رہا تھا۔ دراصل ناصر کا فائر بکسر خانی نہیں کیا تھا۔ گولی محافظ کی پنڈلی میں کہیں جاگئی تھی۔ ناصر نے ایک نظر رستم کی طرف دیکھا پھر رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور اپنی کھانڈی سے ایک مہر پرور وار محافظ کی کھٹی پر کیا۔ پہلی ضرب ہی کافی ثانی ثابت ہوئی۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ رستم نے اسے سمجھتے کر ایک درخت کے نیچے کر دیا۔ اب اگر اس کی قسمت ہوئی تو قحط جاتا۔ رستم اور ناصر نے اس کے لئے زندگی کا تھوڑا سا مارجن چھوڑ دیا تھا۔

دونوں کتوں میں سے ایک تو فوراً غصہ اٹھایا تھا، دوسرا جان کی کی حالت میں لوشیا لگا رہا تھا۔ ناصر کی رائفل سے نکلنے والی تیسری گولی نے اسے اس سمجھتے سے چھٹکارا دلا دیا۔ جانسن، شریف اور دونوں لڑکیاں بھاگتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ چاروں حیرت زدہ اور ڈرے ہوئے تھے۔ زری نے آتے ساتھ ہی رستم کے بازو سے لپٹا پسند کیا۔

”گولی اور تو کھیں؟“ شریف نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

”بندہ وافر تو نظر نہیں آتا۔ کوئی بدروح نہ ہو۔“ ناصر نے ہر سون نظر آنے کی کوشش کی۔

شریف نے ایک لمبولیاں مردہ دھنکے کو اپنے ڈاکے سے ہٹا کر سنبھکا دیا اور ناصر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”بھرا بی۔ ان مردہ جانوروں کو دیکھ کر مجھے روکتے ایک سین یاد آگیا ہے۔ پچھلے سال پتا نہیں کہاں سے کچھ جھنگی سار ہمارے علاقے میں آ گئے تھے۔ ایک رات انہوں نے اچانک میں گھس کر ہمیں سے ایک چھوٹے بچے پر حملہ کر دیا۔ میرے دڑے پھر نے فائر مارکر تین سار گر گئے تھے۔“

”جھینگیں سار زیادہ رہے ہیں یا ڈانڈا؟“ ناصر نے پوچھا۔

”دونوں ہی۔“ شریف نے ناصر کا ”مزاح“ سمجھتے بغیر کہا۔

رستم نے کہا۔ ”میرے خیال میں ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

بالینا، زری اور جانسن زری زری نظروں سے برف پر اونٹنی پر اٹھ کر اٹھ کر دیکھ رہے تھے۔ نیم تاریکی میں یہ لاش کسی سیادو جیسے کی طرح نظر آتی تھی۔ رائفل کی سرور میں ایک

اور چھوٹا سا صاحب لاش کے پہلو میں موجود تھا۔

رستم نے پھر کہا۔ ”دیکھو ناصر اس بات کا خطرہ ہے کہ فائرنگ کی آواز دیکھ اور محافظوں کو کتوں سمیت یہاں پہنچ لائے۔ جانسن سے کہو وہ اپنا کام جلدی شروع کرے۔“

”جانسن کچھ سست سا نظر آ رہا ہے۔ شاید وہی پرندے والا وہم ہے۔“

”اس وہم کو لے کر جینا رہے گا تو پھر وہی ثابت ہو جائے گا۔“

بالینا نے بھی تائید کی۔ ”ہام کو نامور ویت نامیں کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، میں اسے اٹھاتا ہوں۔ اب کیا دم لے لیا ہے اس نے۔“ ناصر نے کہا اور جانسن کی طرف بڑھ گیا۔

جانسن ایک ماہر کوہ پیما کی طرح حرکت میں آگیا۔ وہ اس ہموار سطح کے کنارے پر پہنچا۔ مگر کوئی ہولناک اور ہوا تیز تھی۔ گہرائی کی ہولناکی اندر سے کی وجہ سے زیادہ دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ ناصر نے ایک پتھر کنارے سے فٹا کر دکھایا۔ وہ پتھر کے بہت دیر تک لڑھکتا چلا گیا۔ جانسن نے اپنا رک سبک کھولا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ آہستہ میں گھسنے والے اسکرپ، ہتھوڑیاں..... دراڑوں میں پھنسانے جانے والے اسپرنگ، بہت کچھ تھا اس رک سبک (تھیلے) میں۔ جانسن نے تاریکی کی مدد سے کنارے کے پتھروں میں ایک مضبوط جگہ تلاش کی اور ہتھوڑی کی مدد سے وہاں آہستہ کیل شوٹنے لگا۔ اس کام میں ناصر اس کی مدد کرنے لگا۔ رستم تھوڑی دیر کے بعد برج کے ایک فنک درخت سے ٹپک لگا کر بیٹھا گیا۔ اس کی ٹانگ سے جلی جلی ٹھیس اٹھ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی رپچہ والے کھیل میں حصہ لیا ہے۔ اس کھیل کے بعد بھی اس کی ٹانگ ایسے ہی رات بھر اسے بے چین رکھا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ صورت حال بہتر ہو رہی تھی مگر ابھی کھل طور پر رستم نہیں ہوئی تھی۔ برف کے ”کٹس“ اس پر فٹ کرنے اور آہستہ میں گھسنے وغیرہ کھینکے کے بعد جانسن نے رستے نکالے۔ دستانے، جوتے، ہتھوڑیاں، کنڈیاں اور دیگر سامان نکالنے کے بعد اس نے ناصر کو اترنے کے طریقہ کار سے آگاہ کیا۔ اس نے تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا۔

”غیر معمولی طور پر لمبا سر قریباً 120 میٹر لمبا ہے۔ ہم اسے ان کنڈیوں (انگڑ) میں سے گزار کر ہرا کر دیں گے۔ یعنی یہ قریباً 60 فٹ کی گہرائی تک جا سکتے گا۔“

”دہرا کیوں کریں گے؟“ بالینا نے پوچھا۔

”مے کو ہرات کیا جائے تو پھر اسے گرہ سے کر لکنا پڑتا ہے۔ یعنی جب آخری بندہ جس نیچے آتر جائے گا تو وہ گرہ کی رو جائے گی اور سر یہاں چھوڑنا پڑے گا۔ دہرا ہونے کی

صورت میں بیچے سے رے کا ایک سر اٹھنے کر کے کندوں سے نکالا جاسکتا ہے۔" جانسن نے تکنیکل وجہ بتائی۔

دور شمال مشرق کی طرف سے گولیاں پھٹنے اور دھڑکیں بھینکنے کی آوازیں وقفہ وقفہ سے آرہی تھیں۔ دو تین بار کچھ ایسی آوازیں سنائی دی تھیں جن سے رستم اور نامصر کو اندازہ ہوا کہ شاید راکٹ لاٹچر چلا گیا ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ سطح فارنگ سے کہیں آگ لگ گئی ہے۔ یہ سب کچھ بہت ڈرامائی تھا اور اس سے بھی ڈرامائی بات بھی کہ وہ مارکر ہستی کی موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی تیاری کرکٹ کر رہے تھے۔ رستم اور نامصر کو یقین تھا کہ اگر مارکر یعنی پاؤں اندہ ہستی میں جنگ کی حالت نہ ہوتی تو وہ اتنی آسانی سے اس کنارے پر اپنی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔

اب آہنی تختیں مشینوں سے لڑی ہوئی تھیں اور رے تاریک گہرائی میں جمبول رہے تھے۔ یہاں ہوا کی شدید کٹ کے سبب ہاتھ پاؤں منجمد ہو رہے تھے۔

رستم نے جانسن سے پوچھا۔ "ان برسوں کے ذریعے کتنی گہرائی تک اترتا ہے؟" رستم کا یہ سوال نامصر نے ترجمہ کر کے جانسن تک پہنچایا۔ جانسن نے نامصر کے ذریعے جواب دیا۔ "ہم قریباً چالیس میٹر نیچے جا سکیں گے۔ یہاں ہمیں پہلا اسٹاپ مل جائے گا۔"

"پہلے اسٹاپ سے کیا مراد ہے؟" رستم نے پوچھا۔

نامصر نے بتایا۔ "مسٹر جانسن دن کی روشنی میں اس جگہ تک مکمل سر دے کر چکا ہے۔ جانسن کے اندازے کے مطابق قریباً دو سو میٹر نیچے ایسی گہرائی ہوئی چٹانیں موجود ہیں جن پر ہم پاؤں نہ جاسکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ رستہ بند ہے۔ اس کے بعد جانسن پھر تختیں وغیرہ کا زے گا اور مزید نیچے جانے کے لئے انتظام کیا جائے گا۔"

"دوسری مرتبہ کتنا نیچے جانا ہوگا؟" رستم نے پوچھا۔

جانسن نے نامصر کی وساطت سے بتایا۔ "قریباً 60 میٹر یعنی 200 فٹ اور درحقیقت یہی چارے اس سفر کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ یہ بالکل عموماً ہیڑی جاتی ہے بلکہ ایک دو جگہ عموماً سے بھی زیادہ ہے۔ اسے اور دھڑکنگ کہا جاتا ہے۔ ہم چور سے یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں ہمیں کتنا نیچے جانا ہوگا لیکن اندازہ وہی ہے جو ہم نے نہیں بتایا ہے۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد ہمیں پھر اسٹاپ ملے گا اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ بعد میں اترائی نسبتاً آسان ہو جائے گی۔ یہ مکمل Vertical پوزیشن میں نہیں ہوگی ہم اپنے پاؤں کا استعمال

کر سکیں گے۔"

"پہلے نیچے کون اترے گا؟" رستم نے دریافت کیا۔

"میں نے جانسن سے طے کر لیا ہے۔" نامصر نے کہا۔ "سب سے پہلے میں اتروں گا اور نیچے جا کر صورت حال کو سنباہل لوں گا۔ اس کے بعد باری باری سب اتریں گے۔ یہاں پر جانسن کنٹرول کرنے گا۔ آپ یا جانسن آخر میں اتریں گے۔"

جانسن نے جلدی جلدی نامصر کو وہ جاگتے تازہ چڑھتی ہوا "سٹ ہارنس" کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد دستانے اور ہیلمٹ وغیرہ بھی پہنا دیئے۔ اس نے رستے کو مختلف "کیور ایئر" میں سے گزارنے کے بعد نامصر کو بتایا کہ اس نے کس طرح رے کو آہستہ آہستہ ہاتھ سے چھوڑنا ہے اور نیچے کو چھلٹنا ہے۔ نامصر نے یہ سب کچھ بڑی آسانی سے سمجھ لیا۔ رے سے جھولنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے کا اور ٹھوس ہیڈر بعد تار کی کاٹھن بن گیا۔ وہ سب بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ آخر نامصر نے نیچے پہنچ کر رے کو خاص انداز میں بلایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ لوگ رے کو اوپر کھینچ لیں۔

"اب یہ رے کو اوپر کھینچیں گے؟" شریف نے رستم سے پوچھا۔ "اس معاملے میں، میں بھی تمہاری ہی طرح ہوں۔ بس ایک اندازہ سا ہے کہ جو سامان نامصر کے ساتھ نیچے گیا ہے وہ اوپر آئے گا۔"

رستم کا اندازہ درست تھا۔ جب جانسن اور رستم نے مل کر رے کا ایک سر اوپر کھینچا تو اس کے ساتھ دستانے، ہیلمٹ اور ٹائیکون کی وہ جاگتے تازہ چٹانیں جہیں جانسن "سٹ ہارنس" کہتا تھا۔ دراصل وہ چٹانی کا یہ سامان صرف ایک شخص کے لئے تھا۔ نامصر یہ چیزیں پہن کر نیچے گیا تھا اور اب اس نے اوپر کھینچ دی تھیں۔ جانسن کی ہدایت پر رستم نے رسا پھر نیچے گہرائی میں پھینک دیا۔

دوسری باری بالیڈ کی تھی۔ وہ بھی کامیابی سے نیچے اتر گئی۔ سامان پھر اوپر واپس آ گیا۔ شریف ہنسیاں ہاتھ دھو رہا تھا۔ وہ بار بار شکلیوں پر زبان بھیرتا تھا اور نیچے تاریک گہرائی میں بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ رستم کو اسے نیچے بھیجنے میں محنت کرنا پڑی۔ اب زری کی باری تھی۔ وہ مسلسل رستم کے ہاتھ سے چمپی ہوئی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ بار بار کہتی تھی۔ اس کے بعد مقامی زبان کے دو چار ناقابل فہم لفظ بولی تھی اور کہتی تھی۔ "میں تم کے ساتھ جاؤں گا۔"

جانسن مقامی زبان میں شدید رکنا تھا۔ اس نے پچھلے ایک گھنٹے میں زری کو نیچے

اترے کے حوالے سے کافی کچھ تھا یا تھا۔ رستم نے بھی کافی کوشش کی اور اسے بتایا کہ وہ دیر کر گئی تو سب شخصے میں پڑ جائیں گے۔ انہوں نے زری کو ابھی طرح سٹ بارش میں بٹھایا اور کسی نہ کسی طرح نیچے اتار دیا۔

رستم کا خیال تھا کہ چائنس سب سے آخر میں آئے۔ پسند کر کے لکین وہ کچھ خوف زدہ نظر آتا تھا۔ بار بار سستی کر رہا پڑ دیکھنے لگا تھا۔ رستم مشورہ کے بغیر ہی وہ اپنے رک سیک کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ اب رستم اس ناچو کے کنارے بنی رائلز اور نوک کے چھوٹے سے قصبے کے ساتھ تھا۔ یہ قصبہ اوقت رخصت واس کی بی بی کے بیٹے آنکھوں اور دعاؤں کے ساتھ اسے تھا یا تھا۔ قریباً بیس منٹ رستم نے اس کنارے پر تھا گزارا ہے۔ اس سے چند فیٹر دور ایک انسانی اور دو حیوانی لاشیں پڑی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ اور لوگ اسے لاش ہانے یا خود لاشیں بننے کے لئے اس کنارے پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر رستم کی باری آئی اور وہ بھی بن بنست تار کی میں جھولنے ہوئے طویل رے کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ اس کے پاؤں جس جگہ برف پڑ گئے وہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ یہ مشکل بارش برف پانچ فٹ کی ایک چٹان تھی جو عمودی دیوار سے باہر لگی ہوئی تھی۔ جیسے خوفناک بلندی پر واقع ایک بالکونی بغیر حفاظتی ڈنگے کے۔ وہ سب سکڑا کر وہاں بیٹھے تھے اور ہوا کی طوفانی کات کا مقابلہ کر رہے تھے۔

”اوپر خبر نہ رہی ہے نا؟“ ناصر نے رستم سے پوچھا۔

”ہاں..... اور یہاں؟“

”صرف شریف کو تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ وہ سٹ بارش سے نکلے ہوئے پھسل کر گر گیا تھا۔ سر پر چوٹ لگی ہے۔“

رستم نے تاریخ کی روشنی میں دیکھا۔ شریف کی ایک آنکھ سوچ کر کہا ہو گئی تھی۔ ماتھے پر چٹنی باندھی ہوئی تھی جو یقیناً ناصر نے ہی باندھی تھی۔ رستم نے اسے تسلی دی اور اپنے قبیلے میں موجود قانون نظر سے تھا دیا۔ چائنس نے ہمارے کے ساتھ رہنا پہنچائی تھا۔ اب وہ پھر سے چائنس اسکرپوٹ لگانے کے لئے مناسب پانچ برف صوبہ رہا تھا۔ ناصر بھی اس حوالے سے اس کی مدد کر لگا۔ تاریخ کی روشنی میں وہ منتہی جہان کو دیکھتے اور مشورہ کرتے رہے۔ آخر ایک جگہ انہوں نے منتہی کر لی۔ یہاں وہ آئیں انہیں یار کے ذریعے ہتھکڑی لگائی اور مشورہ دیا کہ وہاں نہ جاتے جو وہاں سہار سکتا۔ رستم نے ساتھ میں رہنے والے تھے۔ اس کی بجائے بار بار دینہ سوٹ اوپر کھانی کے کنارے کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ وہ چاروں سمت سے جان سے لئے تیار تھا۔ وہاں لگانے کے لئے ایک مشین دھڑ دھڑاتی تھی۔ جاتے جاتے انہیں قریباً ایک گیند مزید

لگ گیا۔ اس دوران میں رات کا آخری سپر شروع ہو چکا تھا۔ برف باری ہلکی ہو گئی تھی لیکن جی نہیں تھی۔ انہیں بار بار اپنے کندھوں اور نوپوں سے برف بھارتا پڑ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات کے گہرے اندھیرے میں اچالے کی آمیزش ہونے لگی۔ چائنس بار بار نیچے نہا کر رہا تھا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رے کے دونوں نیچے سرے اس مقام تک پہنچے ہیں یا نہیں جہاں انہیں لینڈ کرنا ہے۔ ضروری تھا کہ اچالا بڑھ جائے تاکہ وہ ٹھیک سے دیکھ سکے۔ دوسری طرف یہی اچالا ان کے لئے خطرناک بھی تھا۔ بے شک برف باری جاری تھی مگر انہیں اوپر سے دیکھا جاسکتا تھا۔

”کیا بات ہے شریف؟ تم بالکل چپ ہو گئے ہو؟“ رستم نے پوچھا۔

”کچھ نہیں جی۔ بس ذرا سرگرم رہا ہے۔“

”لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کچھ بات ہے۔“ ناصر نے اسے کر دیا۔

”نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بولا۔

رستم اور ناصر نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ حقیقت جوں جوں اندھیرا چٹ رہا تھا ایک نہایت خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ اس گہرائی کا منظر تھا جس میں وہ اترے تھے اور ابھی انہیں مزید اترنا تھا۔ رستم نے سوچا یہ سب کچھ اندھیرے میں ہی لینڈ کرنا تو اچھا تھا۔ جس مختصر عرصے پر وہ بیٹھے تھے اس سے نیچے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور انہیں صرف دیکھنا ہی نہیں تھا نیچے اترنا بھی تھا۔

”حوصلہ رکھو شریف پہلے ہم اتریں گے۔ تم بے شک سب سے آخر میں اتر جانا۔“ ناصر نے اسے تسلی دی۔

وہ چپ رہا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان بھیر کر رہ گیا۔ کچھ لوگ غیر معمولی بلندی سے خوف کھاتے ہیں، خاص طور سے ایسی بلندی جہاں کوئی حفاظتی انتظامات نہ ہوں۔ شاید شریف بھی کسی ایسے فوجیا کا شکار تھا اور حقیقت یہ تھی کہ وہ سب ہی اس خوفناک بلندی کو اچالے میں دیکھ کر کانڈر سے لرز گئے تھے۔ چائنس کا اندازہ تھا کہ مزید ڈیرہ وہ دو سو فٹ نیچے ہانے کے بعد اترنا قدرے آسان ہو جائے گا مگر ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ نیچے کی صورت حال مشکوک لگتی تھی۔

ناصر کو ایک مرتبہ پھر سب سے پہلے اترنا تھا۔ اس نے سٹ بارش پہتا اور دیگر اوزامات ہارنے کرنے میں مصروف ہو گیا۔ چائنس اس کی مدد کر رہا تھا۔ رستم نے آکس

کے علاوہ کچھ مخصوص اسپرنگ اور بک بھی ایک چھری والی دراڑ میں بٹھائے گئے تھے۔ ہاسر کے اترنے سے پہلے وہ سب کے سب تناؤ کی یکیت میں تھے۔

ایک ایک لپٹا چلائی۔ ”وکیو۔ وکیو۔“ ”واٹ از کوئٹ آن۔“

رستم اور ناصر نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا اور مڑی طرح چونک گئے۔ شریف دیوار کے ساتھ ٹپک لگا کر بیٹھا تھا اور ایک طرف ہو جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ ”شریف۔ شریف۔“ رستم نے اسے کندھوں سے قہقہہ مچھوڑا۔

شریف کی آنکھوں کی چٹائیاں اوپر کو چلی گئیں اور وہ رستم کے ہاتھوں میں پھینکا چلا گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا۔

ناصر بھی لپک کر قریب آیا۔ شریف کا منہ کھل گیا تھا اور سانس ایک آواز کے ساتھ آ جا رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ناصر اس یکیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ ”اسے کیا ہوا ناصر؟“ رستم نے چلا کر پوچھا۔

”کوئی ایکلک سا ہے۔ شاید ہارٹ ایکلک۔“

ناصر نے جھٹکے سے اس کی بیٹھ کی زپ کھول دی۔ مظر چہرے سے ہٹا دیا۔ ”شریف۔ شریف۔“ اس نے پکارا پھر اس کی بغلیں دیکھنے کے بعد اپنے ہاتھوں کے دباؤ سے اس کے دل کو پک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شریف کی سانس رکتے گئی، ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ یہی وقت تھا جب ان پر ایک اور آفت ٹوٹی۔ اوپر پاؤں کے پٹیلے کنارے پر کتوں کا شور مچا دیا۔ یہ وہی شور تھا جس کا اندیشہ کتھنوں سے انہیں ڈار رہا تھا۔ یہ زیادہ ٹھٹھے تھے۔ یقیناً ان کے ساتھ زیادہ محافظ بھی تھے۔ یقیناً اوپر موجود لوگوں کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ مین ٹمکن تھا کہ محافظ اور کتوں کی لائش دیکھ لی گئی ہوں یا پھر۔ ایسے ہی ہستی میں ان کی فیروزہ کی کاچا ہلی گیا ہو۔

”دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔“ رستم نے پکار کر کہا۔

وہ سب دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ اس طرح ٹمکن ہو گیا کہ وہ اوپر سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد سے وقتی طور پر بچ جائیں۔ یہ ایک قدرتی سائنس کا ساتھ گراس کی چوڑائی دو ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اوپر سے زوردار آواز میں آتا شروع ہو گئیں۔ غالباً وہ لوگ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ فرار ہونے والے کس طرف سے اترے ہیں۔ ناصر نے سر کوئی کی۔ ”انہیں پتا چلانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اوپر لگا ہوا آٹکڑا بڑی جلدی مل جائے گا۔“

”اب کیا کریں؟“ رستم نے کہا۔

”ابھی پوری طرح روشنی نہیں ہوئی۔ برف باری کی وجہ سے بھی دیکھنے کی حد کم ہے۔

ہم جتنی جلدی نیچے کی طرف چلے جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔“

چند سیکنڈ بعد ہی بات جانسن نے بھی انگریزی میں دہرائی۔ کتوں کا شور سننے کے بعد اس کا چہرہ برف کی طرح سفید نظر آنے لگا تھا۔

ناصر نے ایک بار پھر تیشوں ناک نظروں سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس کی سانس خراہٹ کے ساتھ چل رہی تھی۔ گردن پیچھے کی طرف پھٹی تھی۔ وہ بے ہوش تھا۔ رستم اور ناصر دوسرے نے اپنی اپنی جگہیں اٹھ کر اس پر ڈال دی تھیں۔ ڈاکٹر مالینا کے پاس نہ جانے کب سے دو ادویات کا ایک چھوٹا سا بیگ موجود تھا۔ اس میں زبان کے نیچے رکھنے والی کوئی بھی موجود تھی۔ گوئی اس نے شریف کی زبان تلے رکھ دی۔ ناصر اور مالینا کی کوششوں سے شریف کی سانس قدرے بہال ہو گئی۔ ڈو بی ہوئی بغلیں بھی ابھرا آئیں لیکن وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ ”اب اس کا کیا کیا جائے؟“ ناصر نے پریشانی سے کہا۔

”فونین۔ اس کو لمبے نیچے سانس لے جاسکتا۔“ مالینا نے ہانسی سے کہا۔

”لیکن اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔“ رستم نے کہا۔

”تو پھر سب ادویہ مرد۔“ جانسن بیک دم بھڑک کر بولا۔

ناصر نے ہاتھوں کے اشاروں سے جانسن سے کہا کہ وہ دراصل سے کام لے۔ جانسن بڑبڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

رستم نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سے کوئی شریف کو اٹھا کر نیچے اتر جائے؟“

”کیسے کریں گے بھائی یہ نہیں ہو سکے گا۔“ ناصر نے کہا۔

رستم اور ناصر ایک بار پھر شریف کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔ وہ نیم بے ہوش کے عالم میں گر اور رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مل رہے تھے۔ وہ کسی عورت کا نام لے رہا تھا۔

”آمنہ کون ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”اس کی بیوی۔ دونوں میں بھگڑا ہے۔ وہ کسی اور گاؤں میں رہتی ہے۔“

چند سیکنڈ بعد شریف کی سانس پھر بھاری ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن طبی امداد یہاں دور دور تک نہیں تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ زندگی سے عاری برف اور قاتل دشمن سر پر پہنچ چکا تھا۔ رستم مسلسل یہ اعزازہ لگانے کی

کوشش کر رہا تھا کہ یہاں پہنچنے والے لوگ کون ہوں گے۔ شوق کے ہرکارے یا برقی جان کے کاغذ؟ اس سوال کا جواب اس بات سے بھی مشروط تھا کہ اوپرستی میں ہونے والی لڑائی میں کس کا پلڑا بھاری رہا ہے۔

ایک ایک اوپر سے چند لٹکارے سنائی دیئے۔ پھر تڑکی لڑ رہا خیزہ آواز نے ان کے دل دجا دئے۔ یہ کاشفوف کی فائرنگ تھی۔ بالگونی کے باہری کنارے سے بہت سی تازہ برف اچھل کر گہرائی میں گر گئی۔ جب دوسرا برست چلا۔ یہ برست تھوڑا دیر نہیں چلا۔ اندازہ ہونا تھا کہ اوپر موجود لوگوں کو بھی ان کی کچھ پوزیشن کا پتا نہیں چلا۔ وہ صرف قیافے سے گولی چلا رہے تھے۔ وہ بلند آوازوں میں چلا بھی رہے تھے۔ اپنی زبان میں علانیہ وہی الفاظ دہرا رہے تھے جو صمدیوں سے ہر آقا اپنے بھانجے والے غلام یا قیدی کے لئے پکارتا ہے۔ ”رک جاؤ۔ رک جاؤ۔“ میں تم سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار ہوں۔ لہذا مجھے حق ہے کہ تمہیں غلام رکھوں۔ رک جاؤ۔“ در نہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

ہر زمانے میں ان فکروں کے الفاظ اور انداز مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم یہی رہتا ہے۔ جاسن جھٹکا کر بولا۔ اس کی پشیمانی ہوئی اگر بی بی میں سے بس چند الفاظ ہی رستم کی سمجھ میں آئے۔ علانیہ وہ ناصر سے کہہ رہا تھا کہ تم شرقی لوگ پرلے در پے کے بے وقوف ہوتے ہو۔ ایک مرتے ہوئے شخص کے ساتھ سارے سرجاتے ہو۔

رستم کا دل چاہا کہ اس سے کہو۔۔۔ اگر اپنے بے بس ساتھی کو بے رحم دم کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ جاتا تو بی بی سے تو اس پر ہم بھراؤں عقل مند یا قربان کر سکتے ہیں۔

جاسن اب ڈاکٹر مالینا سے مخفی گفتگو تھا۔ وہ بچرے ہوئے انداز میں اسے کچھ بھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مالینا الجھن میں نظر آتی تھی۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ رستم نے ناصر نے پوچھا۔

”کہہ رہا ہے میں نیچے جا رہا ہوں۔ تم بھی آنا چاہو آ جاؤ۔ جو بھی آنا چاہے آ جائے۔“

تو ہمارے پاس اب دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔“

اس دور ان میں دو برست اور پلے۔ گولیوں کی گون گونک گہرائی میں گونجتی رہی۔ رخ بستہ گہرائی جو کسی عفریت کی طرح منکھوئے ان کے سامنے موجود تھی۔

گوخ شتم ہوئی تو اوپر سے ایک جانی پچانی آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ بے شک ان کے کان دھکا نہیں کھارہے تھے۔ یہ مترجم داس ہی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”رستم! تم لوگ جہاں بھی ہو جیو رک جاؤ۔ در نہ مارے جاؤ گے۔ تمہارے بچے کا کوئی چانس نہیں ہے۔“

اس نے کچھ اور بھی کہا لیکن الفاظ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ جاسن نے خلا میں جھونکا ہوا راسپے سٹ ہارنس کے ساتھ مسلک کر لیا تھا اور اب نیچے اترنے کے لئے تکرر تیار تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی مہارت کے ساتھ راسپے سے جھول کر نیچے اترنے لگا۔ وہ ہلکی براؤن شلوار قمیض اور سفید جینٹ میں تھا۔ ہیٹس بھی آف دباؤ تھا۔ یہاں برف میں ڈھک کر برف کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔

مالینا نیچے جانے کے لئے ٹیم رہنما مد نظر آتی تھی جب کہ ناصر بھی بار بار سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھتا تھا۔ ان کے سامنے اہم ترین سوال یہ تھا کہ کیا وہ اپنے ساتھی کو یہاں چھوڑ کر اپنی جان بچا سکتا ہیں یا بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بے حد مشکل تھا۔ شریف کا سر رستم کی گود میں تھا اور اس نے ٹیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہی رستم کی تمام ملی جملی چیخیں اس پر فیلنے جنم اور ان سٹاک دشمنوں کے درمیان یہ لگائی اس کا آخری سہارا ہو۔

”تم اسے کسی طرح میری پشت پر باندھ دو۔“ میں اسے نیچے لے جاؤں گا۔“ رستم نے ایک عزم سے کہا۔

”کیبی بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میں نیچے اترنے میں آپ سے زیادہ آسانی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں شریف کو آرام سے لے جاؤں گا۔ یہاں فالتو رسیاں اور ریٹینس موجود ہیں۔ آپ اور مالینا مل کر اسے میرے ساتھ باندھ دیتے اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دیتے۔“

ڈاکٹر مالینا نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس تجویز سے اتفاق کر رہی تھی۔ رستم نے اپنی ہی کوشش کی مگر ناصر نے اس کی ایک ٹیکس پٹنے دی۔

مالینا اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ”دو بے باک کو نامیں لگنا کورن (ایک گھٹنے) سے پہلے برقی جان کا کارڈز نیچے آتریں گے گا۔“ مائنٹنگ“ کے سامان کے بغیر یہ ایک ڈبلی کلف ناسک (مشکل کام) بائیں۔“

شریف اب بولے بولے کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون ریں رہا تھا اور ایک آنکھ سوچ کر بالکل بند ہو گئی تھی۔ مالینا کا مشورہ تھا کہ شریف کو ناصر کی پشت پر باندھنے کے بجائے سامنے کی طرف اونچا کیا جائے۔ یہ زیادہ آسان اور عملی ہوگا۔ دو رستم کے ساتھ مل کر رستیوں کو بچھانے لگی۔ زری حسب معمول رستم سے جڑ کر کھڑی تھی۔

گہرائی میں لنگھتے ہوئے راسپے کے تار اور حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ جاسن ابھی اتر رہا ہے۔ برف باری کچھ دیر تک دھس رہنے کے بعد پھر تیز ہو گئی تھی۔ پکا ایک رستم کی آنکھوں

کے سامنے برق ہی لہرائی۔ ایک ساعت جھن دھماکے نے اسے سن کر دیا۔ جس برقی چٹان پر انہوں نے پناہ لے رکھی تھی اس کے کنارے کی بہت سی برف اچھل کر اتھاہ گہرائیوں میں بکھر گئی۔ اس کے ساتھ ہی رستم نے اس آکڑے کو بھی فضا میں اچھلنے اور اوڑھل ہوتے دیکھا جس کے سہارے جاسن کھائی میں اتر رہا تھا۔

یہ بڑے سارے دتی بم کا دھماکا تھا۔ ایک پرچی رستم کے سر کے بالوں کو ٹھونکا ہوا گزر گیا۔ دوسرا مالینے کا پاؤں میں لٹکس لگا۔ وہ دروسے بیچ کر دیوں دہری ہوئی۔ رستم اور ناصر پھٹی پھٹی آنکھوں سے برقی بالکونی کے اس کنارے کو دیکھ رہے تھے جہاں جاسن نے شخص وغیرہ لگا انٹر تیار کیا تھا۔ اب وہاں ایک گڑھے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جاسن بیچنی طور پر برقی کھائی کی اتھاہ گہرائی میں گر چکا تھا۔ شاید پرے والی بدھٹوں نے اسے کھالیا تھا یا پھر اس کے اپنے دہم نے اسے نکل لیا تھا۔ غائب دوسری بات ہی درست تھی۔ پرے، پھول اور دریا تو خوب صوری کا استعارہ ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بدھٹوں انسان خود وابستہ کرتا ہے۔ انسان کی تقدیر ان بدھٹوں میں نہیں اپنے ارادوں میں پوشیدہ ہوتی ہے اور جب وہم ان ارادوں کو چاہتا ہے تو بدھٹوں خود خود وجہ ثابت ہو جاتے ہیں۔

ناصر مالینا کی طرف لپکا اور اس کے پاؤں کے زخم کو دیکھنے لگا۔ ایک آہنی ٹکڑا اس کی نازک پنڈلی کو زخمی کر رہا تھا۔ ”بڈی بیچ بچا ہے۔“ ناصر نے گزراں آواز میں کہا۔ اسی دوران میں اوپر سے واس کی پکارتی ہوئی آواز پھر ان کے کانوں تک پہنچی۔ ”سامنے آکر تھپا۔ پچھلے دو روٹہ ہیں ختم ہو جاؤ گے۔“

یہ زبان تو اس کی تھی لیکن الفاظ برقی جان وغیرہ کے تھے اور یہ لوگ اپنی۔ فضا کی میں بیٹھا تھے۔ اس۔ فضا کی ایک ثبوت انہوں نے ابھی چند سیکنڈ پہلے دتی بم پچھلے کر فراہم کیا تھا۔ ایسے ہی مزید ثبوت وہ آنے والے منٹوں میں فراہم کر سکتے تھے۔ یہ مختصری چٹان انہیں زیادہ دیر بچا نہیں سکتی تھی۔ دو ڈھائی فٹ چڑے قدرتی سمجھنے نے انہیں غارتگی کی براہ راست زد سے محفوظ کر دیا تھا لیکن یہاں کرنے والے دتی بم کی مار سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔

اوپر کنارے پر اس مسلسل پکار رہا تھا اور برقی جان وغیرہ کی دھمکیاں شرافتور کر رہا تھا۔ بجاد کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ بات رستم اور ناصر اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر وہ کچڑے گئے تو ان کی سراسر موت سے کم نہیں ہوگی۔ ان کے ہاتھوں کم از کم ایک بندہ قتل ہو چکا تھا۔ مین ممکن تھا کہ دوسرا بھی چل بسا ہو۔

”یہاں ایک دراڑ ہے لیکن اس کے سامنے یہ پتھر ہے۔ اگر ہم اسے کسی طرح سرکا

تکس تو ماضی پتلاں سکتی ہے۔“ ناصر نے کہا۔
”لیکن اسے ہلانے کے لئے تو آٹھ دس بندے بھی کافی نہیں ہوں گے۔“ رستم نے کہا۔

ابھی رستم کا فخر مکمل ہوا ہی تھا کہ ایک اور ساعت جھن دھماکا ہوا۔ کنارے پر بہت سی برف اچھلی اور بارود کی تیز جھیل گئی۔ یہ دتی بم مین نشانے پر گر تھا۔ چند گڑھے سامنے والی دیوار سے ٹکرائے اور بہت سے عکازے سے چاروں طرف بکھر گئے۔ رستم نے جلدی سے شریف کو دیکھا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ زری گوشے میں دبی ہوئی تھی۔ ناصر نے اسے اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ مالینا شاید دھماکے کے زور سے گر گئی تھی۔ رستم نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ بم کے ایک ٹکڑے نے اس کے سینے کو یوں ادھیڑا تھا کہ پھٹی ہوئی جیکٹ میں سے لگی ہوئی پٹیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

گرم خون برف پر راست بناتا تیزی سے گہرائی کی طرف جا رہا تھا۔ رستم کا چہرہ چٹان کی طرح سخت نظر آنے لگا۔ راضل پر اس کی گرفت مضبوط تر ہوئی۔ اگر مالینا کو مارنے والے اس کی زو میں ہوتے تو وہ یقیناً اس وقت آٹھ دس بندوں کو ڈھیر کر دیتا لیکن وہ تو اسے دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ مالینا کی لاش دیکھ کر ناصر بھی سکتے زوہ کھڑا رہ گیا۔ زری کی نگاہ زخم پر نہیں پڑی تھی تاہم بچتے خون کو دیکھ کر بھی زور زور سے چلائے لگی۔

یہ جگہ ان کے لئے چوہے دان ثابت ہو رہی تھی۔ وہ بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ اگر شریف کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو رستم اور ناصر بھی کچھ نہ کچھ گزر رہے۔ محراب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گر نہ والا اگھا دتی بم ان چاروں کے پرچے آڑا سکتا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور دتی بم ہوا میں تیرتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور نیچے لٹکیں گرا کر پھٹ گیا۔ وہ مزید رسک نہیں لے سکتے تھے۔ یہ بہادری نہیں حماقت تھی۔ وہ لڑائی مار گئے تھے۔ رستم نے زری کا سفید اوٹی اسکاٹ بندوق کے سرے پر باندھ کر ہوا میں لہرایا۔ یہ ایک طرح سے ہتھیار بچھٹنے کا اشارہ تھا۔

کچھ دیر بعد اوپر سے واس کی پکارتی ہوئی آواز سنائی آئی۔ ”ہم نے سفید کپڑا دیکھ لیا ہے۔ تم اپنے ہتھیاروں سے تھکے سامنے آ جاؤ۔“
رستم اور ناصر آنکھوں سے تھکے سامنے آ گئے۔

برف باری رہی ہوئی تھی۔ ابالا اچھی طرح پچھل چکا تھا۔ اوپر سے سن کا ایک لمبا رسا چٹان کی خون آلود بالکونی تک پھیل گیا۔ اوپر کنارے پر درختوں کا شکل برقرار رہا ہے۔

ترب کر کر بیٹوں کے زرنے سے نکلا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس صورت حال کو بھٹکا یا کچھ کر سکا، رستم نے ایک قریب کھڑے عمر رسیدہ پاؤندے کی کمر سے چھوٹے دستے کی مخصوص کلباڑی کھینچی لی۔ اگلے دو تین منٹ میں گھمسان کا دن پڑا۔ ناصرتو پاؤں میں بیڑی ہونے کے سبب بے بس ہو گیا تھا، رستم بے بس نہیں تھا۔ اس نے مزاحمت کا حق ادا کر دیا۔ پانچ پاؤندے اس کے مقابل تھے۔ باقی سب ایک وسیع دائرے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ وہ سب ششدر تھے۔ وہ سب کے سب پیدائشی جنگجو اور لڑاکے تھے لیکن وہ جس کو برسرِ پیکار دیکھ رہے تھے وہ سب سے جدا تھا۔ وہ آسانی برقی کی طرح اپنے حربیوں کے درمیان چکا اور لپکا۔ اس نے تین افراد کو زخمی کر کے گرا دیا۔ ان میں سے ایک "نمان" بھی تھا۔ کسی کی کلباڑی اور کٹائی دونوں ٹوٹ گئی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ سات آٹھ افراد حیرت لڑائی میں شریک ہو گئے اور انہوں نے رستم کو چھاپ لیا۔ رستم برف پر گر گیا اور کلباڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ "نمان" درد اور غضب سے چنگھاڑتا ہوا رستم پر پھل پڑا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے رستم کے جڑے پر طوفانی کے رسیدہ کے اور اس کی داڑھی لہو لہان کر دی۔ رستم کے لیے بال کم از کم چار باتوں کی گرفت میں تھے۔ "نمان" نے گلے سے "آخ" کی آواز نکال کر رستم کے چہرے پر قھوٹے کے لئے لعاب قہقہہ کی گمراس سے پہلے کہ وہ قھوک سکا ایک شوکر اس کے کنبے پر پڑی۔ وہ رستم کی چھاتی سے لڑھک کر دور جا کر۔

"نمان" کو شوکر رسید کرنے والا برق جان ہی تھا۔ اس کی ایک آستین ہوا میں جھول رہی تھی۔ اس نے گرج کر "نمان" سے بکھ کیا۔

رستم کی سمجھ میں ایک دو لفظ ہی آئے۔ غالباً اس نے "نمان" سے کہا تھا کہ وہ شرم کرے۔ اس نے کئی افراد کے ساتھ مل کر رستم کو پھیناڑا۔ اسے رستم کے منہ پر قھوٹے کا حق حب تھا جب وہ اسے اکیلا گرا۔

رستم کو بھڑکنے والے افراد نے اس کے پاؤں میں وہی مخصوص بیڑی پہنا دی جس کے شکنجے سے لٹکانا قریباً ناممکن تھا۔ مترجم وہ اس کے ذریعے برق جان اور رستم میں جو مکالمہ ہوا وہ اس طرح تھا۔

برق جان نے رستم کو تبر آود لیے میں ہی غلبہ کیا۔ "تم نے ہم کو صو کا دیا۔ ہم نے تمہیں لڑائی کے لئے آزاد کیا تھا۔ تم نے بھائی کی کوشش کی۔"

"بھری یہاں کھی سے لڑائی نہیں ہے۔ ہمیں یہاں چھ مینے سے جس بے جا میں رکھا ہوا

ہے۔۔۔۔۔ جب کہ ہمارا کوئی جرم بھی نہیں ہے۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہمارا حق ہے۔"

"اور بھائیے والوں کو سزا دینا ہمارا حق ہے۔ تم لوگوں کو وہ دفعہ معاف کیا جا چکا ہے، اب نہیں کیا جائے گا اور اب تمہیں بھی نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھوں ایک چہرے دار ہلاک اور دوسرا شدید زخمی ہو چکا ہے۔ تمہیں پوری پوری سزا ملے گی۔" برق جان کا لہجہ انقیص تھا۔

"چہرے دار کو مارنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم نے صرف اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ ہمارا نشانہ ٹھٹھے سے لگن گولی ان کا تھا اسے لگ گئی۔ جہاں تک بھائیے کی بات ہے، بھائیے کی کوشش کرنا ہمارا حق ہے۔ ہم ہی حق اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک ہمارے ہمسوں میں جان ہے۔"

رستم کا آستین لہجہ اور کھری کھرن بائیں سر کر برق جان خاموش ہو گیا۔ وہ گہری نظروں سے رستم کے سراپا کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اس فخرناک لیکن بہادر دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس کی آنکھوں سے بھی شعلے نکلے محسوس ہوتے تھے، وہ بھی یہ آنکھیں نظر میں کھو جاتی تھیں۔

"قہار کیا خیال ہے۔ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟" برق جان نے پوچھا۔

"سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جو چاہو کر سکتے ہو لیکن ہمارا یہ سانچہ بنا رہے۔ اس کے ساتھ کم از کم وہ سلوک ضرور ہونا چاہیے جو جڑی اور پانچ رشتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

برق جان چند قدم چل کر آگے آیا اور تختے پر پڑے شریف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا بازو لینے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایت جاری کیں۔ وہ لوگ شریف کو اٹھا کر روانہ ہو گئے۔۔۔۔۔ ناصرتو بھی ساتھ بیچھا دیا گیا۔

رستم نے زری کو دیکھا۔ وہ دو تونہ جاری عورتوں کی گرفت میں تھی اور بڑی طرح کسمسا رہی تھی۔ اس کی آنکھ کا مرکز صرف اور صرف رستم تھا۔ وہ اس کی طرف آتا جا پوری تھی لیکن جب وہ تھی۔ عورتیں۔۔۔۔۔ بروہی اپنے ساتھ لے گئیں۔ رستم کو پا بجولاں ہستی کی انگوٹھی کھوہ کی طرف اٹان کر دیا گیا۔ اسے لے جانے والوں کا رویہ سخت معاندانہ تھا۔

رستم کو کھوہ کے اندر قید تھائی میں رکھا گیا۔ یہ کھوہ کے اندر چھری کی بنی ہوئی ایک نہایت انتہا اور تاریک کوغزی تھی۔۔۔۔۔ یہ مشکل چھبڑ چھبڑت کی۔ پانی کا ایک دھکا، ایک پٹائی اور ایک پھنا پرانا گیل۔ یہ اس کوغزی کا کل اسباب تھا۔ کوغزی کے اندر یہ گہرائی میں جاتی ہوئی ایک دراڑی تھی۔ اس دراڑ کو نوٹس کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کوغزی کی سب سے بڑا سزا یہاں کی سردی تھی۔ رات کے وقت تو یہ جگہ بکسر برف خانہ بن جاتی تھی۔

”ناصر اب شریف کے ساتھ ہی ہے؟“
 ”نہیں۔“ واس نے ہاپی سے سر ہلایا۔ ”نکل اسے بھی تمہاری طرح کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا ہے۔“

”بابر کے حالات کیا ہیں؟“ رستم نے پوچھا۔
 ”تم اندر کے حالات کی بات کیوں نہیں کرتے؟“ واس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ لوگ یہاں کتنے ٹھیک رہتے ہیں۔ کچھ کی تو دو تین ہفتے بعد لاش باہر آ جاتی ہے۔“ واس نے کہا اور دم گم سم کو بچھ گیا۔ سردی اس کی کمزور ہڈیوں میں اثر نہ تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ”جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے اپنی جینٹ آئنا کر تمہارے کندھوں پر ڈال دوں۔“ کچھ دیر کے لئے تو جینٹ آرام ہو لیکن ڈر ہے کہ کسی کو چتا جل جائے گا۔“
 ”ہم پہلے بھی بیچ کر نکل آئے تھے۔ اب بھی نکل آئیں گے۔ تم ان باتوں کو چھوڑو واس، مجھے بتاؤ کہ بابر کیا صورت حال رہی ہے؟“

واس نے اٹنے لگے اچھے سے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔ ”برق جان کا چلڑا بھاری رہا ہے۔ شوقم خان اور ارقا خان کو مزید پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ درحقیقت وہ اب مارگہ کے صرف ایک چوتھائی حصے پر چدے ہوئے ہیں۔ وہاں بھی ان کے پاؤں نکلنے نہیں آتے۔ برق جان نے اپنے داماد سامی خان کو بھی اس کے باپ کی قید سے چھڑا لیا ہے۔ وہ سخت ڈھکی حالت میں ملا ہے تاہم جان بچ گئی ہے۔“

”عام لوگوں کی کیا رائے ہے؟“
 ”شوقم خان کا بھانڈا اُمڑی طرح کچ چورا ہے پر چوٹا ہے۔ یہ عورت اور اس کی بھانجی نے وعدہ معاف گواہ بن کر سب کچھ صاف صاف بول دیا ہے۔ شوقم خان نے دونوں عورتوں سے تاجائز تعلق قائم کر رکھا ہے۔ پہلے اس کا تعلق عورت سے تھا۔ جن دونوں وہ اپنی خاص کیفیت میں ہوتا تھا اُمیاسے میں جاتا تھا اور اس عورت کو بلا لیتا تھا۔ بعد میں وہ اور بھی بے باک ہو گیا۔ اس نے لڑکی سے بھی تعلق قائم کر لیا۔ اب سارے ثبوت مل گئے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ شوقم اور ارقا کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ بھی ابھن میں ہوں گے۔“

”ہمارے بارے میں کیا سوچا گیا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔
 ”واس خاموشی سے سامنے ساٹ چھریلی دیوار کو گھورتا رہا۔ اس کے چہرے پر درد کی چند نئی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

درحقیقت یہاں رات اور دن میں تیز، سردی میں اضافے اور کسی سے ہی کی جانسی تھی۔ رستم ایک دفعہ پہلے بھی پورے ایک ماہ تک اس کوٹھڑی کی ”سہلوں“ سے فیض یاب ہو چکا تھا لیکن وہ یہ کوٹھڑی نہیں تھی۔ اس طرح کی ایک اور کوٹھڑی تھی۔ رستم کے اندازے کے مطابق ایسی تین چار ”کوئی آئی لی“ کوٹھڑیاں یہاں موجود تھیں۔

رستم کے کندھے کا ڈھم بھر برا ہو گیا۔ اوپر سے سردی کی مار۔ کوٹھڑی میں فی موجود تھی جس کے سبب چٹائی اور کبل بھی غم رہتے تھے۔ اس کی بھی کہ ساتھ رات گزارنا، پل صراط پر سے گزرتا تھا اور رستم کو ہر رات پر پل صراط پار کرنا پڑ رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ علم نہ تھا اور نہ باہر کے حالات کے بارے میں۔ بھوک، سردی اور درد کے آنکھوں میں اپنے درجنوں بازوؤں میں اسے بکڑے ہوئے تھے۔ یہ لذت کی انتہا تھی۔ اگر وہ اس لذت کو چھیل رہا تھا تو اس کی وجہ تھی۔ اس کے پیچھے کوئی توانائی تھی۔ کوئی چہرہ تھا۔ ایک امید جو اپنے گرم بازوؤں میں اسے سہارا دیتی تھی اور کبھی تھی۔ جنہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں سے لٹکا ہے رستم۔ کیونکہ کوئی تمہارا انتھار کرتا ہے۔ سرنگی شاموں۔ چاندنی راتوں اور چمکیلی صبحوں میں جنہیں دھڑکتا ہے۔ جنہیں اس سے ملتا ہے۔ کم از کم ایک بار تو ضرور ملتا ہے۔ جی بھر کر دیکھنا ہے اور پھر۔ پھر۔ آگے جانے کی اجازت لینی ہے شاید۔

پورے چار دن تک ایک دانت اُڑ کر رستم کے منہ میں نہیں گیا۔ چوتھے دن جب غارِ شام کا وقت تھا، کوٹھڑی کا آہنی رنگ آلود روزانہ نکلا اور واس اندر آ گیا۔ آج وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ اندر آ کر واس نے دروازہ بند کر دیا۔

”شریف کا کیا حال ہے؟“ رستم نے چمنہ سے پوچھا۔
 ”اس کی جان بچ گئی ہے لیکن ابھی بستر پر ہی ہے۔“ واس نے دم آواز میں جواب دیا، جیسے اسے فطریہ ہو کہ پاس کوئی سن لے۔ واس اپنے ساتھ ایک چھوٹی لائٹیں بھی لایا تھا۔

”اور ناصر؟“

”ناصر نے شریف کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ یہاں برق جان کے پاس کچھ ایلو پیتھک دوائیں موجود تھیں۔ کچھ دوائیں ڈاکٹر یالینا کے شولڈر بیگ میں تھیں۔ ناصر انہی دواؤں کی مدد سے کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی مقامی نباتاتی دوائیں بھی استعمال ہوتی رہی ہیں۔“

”کیا کوئی نئی خبر ہے؟“ رستم نے استفسار کیا۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے، یہ لوگ اپنے ضابطوں کے بڑے سخت سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بارہ سال سے زیادہ کا عمر ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے پہلے یہاں کبھی بدامنی نہیں دیکھی۔ اگر یہ ایسا والا واقعہ نہ ہوتا تو شاید امن و امان اور انصاف کا یہ بھرم اور کئی برسوں تک برقرار رہتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ برقی جان تہوار کے فرار اور ایک محافظ کے قتل ہونے والے واقعے کو کسی صورت نظر انداز کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اسے اپنے قریبی ساتھیوں کو جواب دینا پڑے گا۔ تمہیں تو کوئی کوسراہر صورت ملنی ہے۔ کم از کم جس کے ہاتھوں سے محافظ کو گولی لگی تھی اسے تو ضرور مرنا پڑے گا۔“

”اور گولی میرے ہاتھوں لگی تھی۔“ رستم نے اطمینان سے کہا۔

”نکسین تم ہامس یا شریف کو بچانے کے لئے تو ایسا نہیں کہہ رہے ہو؟“

”میں بڑی سے بڑی قسم کھاتے ہوئے ہوں۔ ہاں اگر ان دونوں میں سے کوئی یہ الزام اپنے سر لے گا تو یہ جھوٹ ہوگا۔“

”اس حوالے سے امید کی صرف ایک کرن ہے اور یہ کرن بھی جب باقی رہے گی جب تم تینوں میں سے کوئی بیوقوفی کر کے یہ الزام اپنے سر نہ لے لے۔ میرا مطلب انجمنی جانسن سے ہے۔ اگر دونوں تون اور محافظ کی موت کا ذمے دار جانسن کو قرار دے دیا جائے تو تم تینوں کے لئے بچاؤ کی کوئی راہ نکل سکتی ہے مگر اس کا امکان بھی دو چدرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے اس کے بعد قانون کا قاعدہ سے اور سخت ہو گئے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو، پانچ دن پہلے ہونے والی لڑائی میں 300 کے قریب لوگ مارے گئے ہیں۔ جن 30 کے قریب لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس بار برقی جان کی ذاتی رائے تمہارے بارے میں کیسی ہے؟“

”تم تینوں ابھی تک زندہ ہو۔ تم میں سے کسی کو کئی (ٹھکنے کی کئی) کاٹنے کی سزا بھی نہیں دی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ برقی جان کی ذاتی رائے تم تینوں کے بارے میں بری نہیں ہے۔ خاص طور سے تمہارے بارے میں اس کی سوچ مختلف تھی۔ تم جی داری سے رچھہ کے کیبل میں حصہ لیتے رہے ہو۔ بھرت نے جس طرح ہر خطرے کو نظر انداز کر کے شوم کا راستہ روکا تھا، وہ اس کے دل پر نقش ہے لیکن تمہارے فرار اور محافظ کے قتل نے سب کچھ اٹ پٹ کر دیا ہے۔ اب یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔“

رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”ذری تو شیریت سے ہے؟“

ذری کے ذکر پر اس کے دل پر جیسے حیرانگہ۔ ایک سیکنڈ میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”وہ اب نہیں بچے گی۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کل جرے میں تین تین گیارہوں کو بیسٹ چڑھانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ ان میں ایک ذری بھی ہے۔ بیسٹ کے بڑے پوزھوں کا کہنا ہے کہ بیسٹ پر غور سے سائے ہیں۔ دامن پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے کا خون بہایا جا رہا ہے۔ اس آفت کو ٹالنے کے لئے خصوصی عبادتوں اور مذہبی رسوں کی ضرورت ہے۔ اتفاق ہے کہ دشمنی کا سالانہ تہوار بھی قریب آ رہا ہے۔ اس تہوار میں عموماً ایک یا دو گارڈین کو بیسٹ کیا جاتا ہے لیکن اس مرتبہ تین لڑکیاں جان باریں گی۔ ذری شاید اس تہوار پر بچا جاتی لیکن پانچ دن پہلے جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد اس کا بچنا محال نظر آتا ہے۔ اسے بیسٹ میں شامل کر لیا گیا ہے۔“

یہ ساری باتیں رستم کو عجیب سی لگ رہی تھیں جیسے وہ کوئی کہانی سن رہا ہے یا قلم دیکھ رہا ہے۔ جو کچھ بھی تھا، یہ وہ راز ملک کا حصہ تھا۔ یہاں جو کچھ ایک قلمی رسم کے نام پر ہو رہا تھا وہ حیران کن حد تک بے رحمانہ تھا۔ کیا یہاں کبھی کوئی صفائی نہیں پہنچا؟ کوئی تحقیق کار کوئی پڑھا لکھا شخص جو یہاں کی خرافات کو باہر کی دنیا پر آشکارا کر سکے۔ جو لوگوں کو ان پاؤندوں کے نیچے و غریب رہن سہن سے آگاہ کر سکے۔ رستم کو یوں لگا جیسے یہ بھی قدرت اللہ دانی جاہلیت کا ہی ایک روپ ہے۔ یہ جاہلیت اور توہم پرستی ایک ہزار شاخوں پر درخت کی طرح ہے جس نے ہر شیطانی اور حرام کے گلوں پر اپنا زہریلا سا بیج پیلا رکھا ہے۔

”کس سوچ میں تھو گئے؟“ اس نے دل دکھارے انداز میں پوچھا۔

”کب سے یہ تہوار؟“ رستم نے پوچھا۔

”تین مہینے بعد۔ لیکن ہر چدرہ دن بعد اس تہوار کی تیاری شروع ہو جائے گی۔ مقامی لوگ اس تہوار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی تیاریوں کا آغاز ایک بڑے ہلوس کی سورت میں کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ حالات خراب ہیں۔ لیکن بے کہلوس نہ لگلا جائے مگر دس ہاتھیں گرم پانی کے شیشے میں نہا کر مقدس آبک پر اپائیں کے پھول چھاد کر یں گی۔ یہ بھی یہاں کی ایک رسم ہے۔“

”لعنت ہے یہاں کی رسوں پر۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا اس اکیلا واقعی ان بیسٹ جاگتی لڑکیوں کو ذہب کے نام پر ذبح کر دیا جاتا ہے؟“

”تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟ کیا تم نے سری کے پیازوں میں گورے کے پٹنگے کے

بجٹی بجیٹ سے چند دن پہلے ہو گئی تھی۔ وہ کیسے ہوا تھا؟

واس چونک کر رستم کی طرف دیکھنے لگا پھر تجھے مجھ سے لہجے میں بولا۔ ”وہ امید سے ہو گئی تھی۔ بجیٹ چڑھانے جانے کے لئے گارنی کا کنوارہ ہونا ضروری ہے۔ گارنی کو بھوننا ایک بہت بڑا اٹھنا تھا۔ اس گناہ کی پاداش میں نوجوان پاؤندے کو کسی نہیں اس کے پورے گھر کو موت کا منہ دیکرنا پڑا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو مکان کے اندر زندہ جلادیا گیا تھا۔ سات افراد موت کے گھاٹ اترے تھے۔ یہاں کسی گارنی کی طرف نظر بد سے دیکھنا ایسا بھیک تک جرم ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

رستم کچھ دیر عجیب نظروں سے واس کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”واس! اگر ہم میں سے کوئی ذری کے ساتھ شادی کر لے تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں، ناصر یا شریف؟“

واس نے چپٹی چپٹی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ اس کا جسم لڑنے لگا تھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”میں اپنے حواس میں ہوں واس۔“

واس بدگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ذری کی نظروں سے دروازے کو دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کوئی اس آگاہی متعلقے کے ساتھ لگا کھڑا ہوگا۔ پھر وہ رستم کی طرف مڑا اور بولا۔ ”مجھے تمہاری باتوں میں دیوانہ پن نظر آ رہا ہے۔ شاید اس کوغری کی اندھیرا تمہارے ذہن پر اثر کر رہا ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے واس! تم میری بات پر غور کرنا اور اگر اس کے علاوہ کوئی بہتر راستہ تمہارے ذہن میں ہو تو دو مجھے مجھے بتانا۔ ذری کو مرنا نہیں چاہیے۔“

”تم کس دنیا میں بس رہے ہو رستم! تمہارا کیا خیال ہے کہ برقی جان جنہیں صبح سلامت چھوڑ دے گا؟“

رستم نے عجیب آہنگ میں کہا۔ ”میں مرنے بھی دینا دیکھی ہے واس۔ برقی جان ہمیں زندہ رکھے گا اور صبح سلامت بھی رکھے گا۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے ایک دوخت شریفیں رکھے اور مجھے امید ہے کہ چار چھ ہفتے کے اندر وہ ہمیں یہاں سے نکال کر تمہاری موجودگی میں ہم سے بات چیت کرے گا۔ مجھے پتا چلے گا کہ یہ فیصلہ یقیناً ہے کہ ایسا ہوگا۔“

رستم کے اعتماد نے واس کو ذرا سا مرعوب کیا۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے رستم کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

رستم بڑے ایزی سوڈ میں آ گیا تھا۔ دیوار سے ٹک لگتے ہوئے وہ بولا۔ ”اب جھپیں

اندروگوں کو ذبح ہوتے نہیں دیکھا تھا؟“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ رستم نے تانسف سے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”کیا ان بد قسمت لڑکیوں کو..... میرا مطلب ہے کہ انہیں گولی ماری جاتی ہے یا ذبح کیا جاتا ہے؟“

”ان کی گردنوں پر مقدس کھڑا کی کاٹم کھل چھری کے انداز میں چلایا جاتا ہے۔“

شروع شروع میں یہ سب کچھ مرعوم ہوتا تھا مگر اب تیس چالیس برسوں سے یہ سب کچھ رازداری سے چار دیواری کے اندر ہوتا ہے۔ گارنوں کی جان لینے سے پہلے ان کو ایک نشہ آور مشروب پلا دیا جاتا ہے۔ وہ نیم بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ بعد ازاں ان کے خون آلود کپڑوں کی تلاش کی جاتی ہے۔ لیکن تم مجھ سے یہ سب پوچھ کر میری اذیت میں اضافہ کیوں کر رہے ہو؟“

”میں معافی چاہتا ہوں واس۔ مجھے واقعی ایسا نہیں کہہ چاہیے لیکن میں تمہاری بھتیجی کے لئے فکر مند ہوں۔ میں اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس کی..... جان بچنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”کوئی نہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ واس نے تانسف سے کہا۔ ”اور رستم! تم کبھی کیا سکتے ہو۔ تم تو اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نئی طرح چمک گئے ہو۔ شاید تم نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ ذرا راضی رہو۔ اگر تم لوگ برقی جان کی طرف سے لڑائی میں حصہ لینے اور ابھی کا کارڈی دکھاتے تو تمہارے لئے حالات مزید سازگار ہو سکتے تھے۔ جنہیں بہت سی نحوشیں مل سکتی تھیں۔ پھر تم ان نحوشوں کا فائدہ اٹھا کر کسی اور مناسب موقع پر کوشش کر سکتے تھے۔ اب دیکھو، مالینا بھی مرنے والی ہے، جس میں مارا گیا۔ یہ بھی اس زد میں آنے سے بال بال بچا ہوں اور تم اس چوہے دان میں آ چکے ہو۔ اب تم اس بے چاری کی کیا مدد کرو گے؟“

رستم نے سرد دیوار سے ٹک لگا کر ایک طویل سانس لی اور اپنی کوغری کو دیکھ کر عجیب لہجے میں بولا۔ ”یہ چوہے دان زیادہ دیر مارا راستہ نہیں روک سکتا واس۔ یہ پاؤندے اسے اپنی زنجیریں پھینکی بھی مونی کر لیں، ایک دن ہم نے انہیں توڑ جانا ہے۔ ہماری کوشش ابھی ختم نہیں ہوئی..... یہ لڑائی ابھی جاری ہے۔ تم ہماری فکر پاگل نہ کرو۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی صورت ہے جس میں ذری کی جان بچ سکے؟“

”نہیں۔“

”نہیں، تم بھول رہے ہو واس۔ تم نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ایک لدائی گارنی کی جان

بتاؤں، تم یہاں کس مقصد کے لئے آئے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے آنے کا اصل مقصد؟“
”کیا مقصد ہے؟“

”تمہارے اس لبوداد برق جان کو اندیشہ ہے کہ جانسن کی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو یہاں سے چپکے چپکے فرار ہونے کے طریقے سوچ رہے ہوں گے۔ اس نے تمہیں یہ ذمے داری دے کر میرے پاس بھیجا ہے کہ تم مجھ سے کچھ اگلوؤ۔ اگر میں کچھ چسپانے کی کوشش کروں تو پھر مجھے دھمکاؤ۔“ ناصر اور شریف کی زندگی کا حوالہ دے کر مجھے راجہ راست پر لانے کی کوشش کرو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”اس نے قدر سے حیرت۔۔۔ رستم کو دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔
”تمہارا انداز کافی حد تک درست ہے۔ اب، بتاؤ، میں جا کر اسے کیا جواب دوں؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ میری جان بھی لے لو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اس بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔“ رستم نے نہایت تعلیمی سے کہا اور تب بولے سے مسکرایا۔
”اس کے چہرے پر ابھی تک حیرت جمی ہوئی تھی۔“ تم اور ناصر کیا چیز ہو رستم! مجھے تمہاری کچھ باتیں آ رہی۔“ وہ روپائی آواز میں بولا۔

”ان دونوں کے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔“ اس کو رستم کی حالت زار پر بہت تشویش ہو رہی تھی۔ خاص طور سے یہاں کی سردی نے اسے دہلا دیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے رستم سے کہا۔ ”تمہارا کھانا آج بحال کر دیا جائے گا، بلکہ ابھی تھوڑی دیر میں کھانا آ جائے گا۔ میں جنسین ایک اچھا کھل بھجوانے کی بھی پوری کوشش کروں گا۔“
”میرے جیسے کا کھل ناصر کو بھجوا دینا۔“

”نہیں۔۔۔ ابھی اس کے لئے کچھ نیکرا ہو سکتا۔ مجھے پتا ہے کہ چار پانچ دن تک اسے کوئی رعایت نہیں ملے گی۔ اس کے لئے، ماہ سوکتی ہے کراؤں والا اسے ہم دے۔“
اور پھر اس اپنی لائین کی خوشنما روشنی سمیٹ چلا گیا۔ رستم اس تار کی، سٹین اور جان لیوا خشک میں تھا رہ گیا۔ اس کی وال روٹی، بحال ہوئی تھی اور کیا بُرا بھلا کھل بھی مل گیا لیکن آزادی نہیں تھی۔ آزادی کا دور دورہ تک پتا نہیں تھا۔

کہتے ہیں کہ قید تباہی انسان کے اعصاب کو توڑ دیتی ہے۔ اس کے حواس بکھرنے لگتے ہیں۔ شاید رستم سیال کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا لیکن وہ کوٹھڑی میں اکیلا نہیں تھا۔ رنگ والی کی رنگ رنگی شالی بی بی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ایک بڑے حرارت خوشبو کی طرح ہر دہن اس کے ارد گرد دھنکی تھی۔ اس کے ساتھ جیٹہ رکھنا کھانا کھاتی تھی۔ اس کے سر کے لئے اپنے زانو کا کھیر

باتی تھی، اس کے لمبے بالوں میں اگلیاں چلائی تھی پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔ ”میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ سے عشق کرتی ہوں۔ آپ بھی مجھ سے کرتے ہیں نا؟“

”ہاں، میں بھی آپ سے عشق کرتا ہوں۔“ وہ کہتا تھا اور اس کی آنکھوں کی نمی اس کی تمدن کر دیتی تھی۔ وہ اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اس کے ٹھنڈے ہوئے چہرے کو اپنے مہربان جسم کے غم میں چسپاں لیتی تھی۔

رات ہوتی تھی اور اس کی سرد کوٹھڑی سرد تر ہو جاتی۔ پھر دن چڑھتا اور تھوڑی سی حرارت لوٹ آتی۔ حرارت اور ٹھنڈک ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتا رہا۔ باہر کیوا ہر تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا تعلق بس ایک ہاتھ کے ذریعے تھا۔ یہ ہاتھ اسے دن میں دو بار کھانا پہنچاتا تھا اور دو بار خالی برتن واپس لے جاتا تھا۔ صرف ایک دن کھانا لانے والے سے اس کی تھوڑی سی بات ہو پائی تھی۔ وہ اچھا کھانا لا رہا تھا۔ رستم کے پوچھنے پر اس نے دو تین فقرے بولے۔ ان فقروں میں سے بس دو تین الفاظ ہی رستم کی سمجھ میں آ سکے۔ اسے اندازہ ہوا کہ کبھی میں روٹنی کا تہوار قریب آ رہا ہے اور مختلف تقریبات ہو رہی ہیں۔

کبھی کبھی وہ تنہا بیٹھا بیٹھا بے قرار بھی ہو جاتا۔ اس کی بے پناہ برداشت میں دراڑیں پیدا ہو جاتیں۔ وہ اپنے فکس میں ڈھکی پھنسے کی طرح پھر پھر لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان سنگناخ دیواروں کو پاش پاش کر کے یہاں سے نکلے اور اپنی بی بی کے پاس پہنچ جائے۔ وہ بے چین ہو کر اپنی مختصر ترین کوٹھڑی میں گھلتے گھلتے تین قدم دائیں۔ تین قدم بائیں۔ پھر تین قدم دائیں۔ پھر بائیں۔

☆=====☆

ہوئے کو آئے تھے۔ ان پانچ مہینوں میں قدرت اللہ کی سادھ کو ناقابلِ تصانیف تھا۔ اس کے عملیات اور جانوروں کے ساتھ سلوک سلوک کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے گئے تھے اور ان میں سے بیشتر سوالوں کا بہروپ پچھنے کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نہ صرف دینی اور شہری علاقوں میں قدرت اللہ کی پیش قدمی رک گئی تھی بلکہ اس کے کئی "آستانے" بند بھی ہو گئے تھے۔ کچھ جگہوں پر لوگوں نے قدرت اللہ کے شائع کئے ہوئے کتابچے اجماعی طور پر بند کر دیے تھے۔

گرہیں اپنے بچے ڈیس کے ساتھ اٹھینڈ واپس جا چکی تھی۔ تاہم بذریعہ خط شانی سے اس کا رابطہ تھا۔ انسپکٹر حفیظ اپنے زخموں سے صحت یاب ہونے کے بعد ڈیوٹی جوائن کر چکا تھا۔ اجمل خان پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اپنے آبائی علاقے حسن ابدال میں تھا۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی شانی کو نہی کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا تھا۔ ریشمی طرح نرم بخواد کی طرح سخت۔

شانی رنگ والی کی حویلی میں تھی۔ اسے اپنے کھیت و اپنے گلی کو پے، اپنے کونوں اور اپنی سہیلیاں واپس مل گئی تھیں، لیکن جو لوگ ہیٹھ کے لئے کھوئے تھے انہیں کون واپس لا سکتا تھا۔ شانی کا بھائی، والدہ والدہ اور بے وفا بچا رخص بھی۔ تاجا معصوم واپس آچکے تھے۔ یہ سب کچھ ایک آف دی ریکارڈ معاہدے یا راضی نامے کے تحت ہوا تھا۔ یہ معاہدہ غالباً حاجی حیات اور ڈپٹی ریاض بھٹل کے درمیان ہی ہوا اور اس کی زیادہ تفصیل شانی کو معلوم نہیں تھی۔ اس معاہدے کے تحت تاجا معصوم اور شانی کو ڈپٹی ریاض اور اس کے ہم کاروں کے خلاف زبان بند رکھنا تھی۔ یعنی مکمل زبان بندی۔

شانی نے رنگ والی کی حویلی پر سے ایرانی کی گرد بھڑائی تھی۔ اس کا عزم تھا کہ وہ اس حویلی کو اب مزید بے آباد نہیں رہنے دے گی۔ اس کی رونقیں واپس آئے گی، لیکن کیسے؟ وہ حویلی کو آباد تو سب کر سکتی تھی جب اس کا ہنڈل آباد ہوتا۔ ہنڈل تو جیسے ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ اس میں یادوں کے آسیب چکرات تھے۔ رستم اور اس کے ساتھیوں کو، اجمل ہوئے اب پون سال ہوئے کو آیا تھا۔ ان نو نوجوانوں میں کون سا بلی کی ن کوئی ساعت ایسی تھی جس میں اس نے گھڑنے والے کو یاد نہ کیا ہو۔ اب بھی وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کینڈ کے ساتھ پچھلے صحن میں آم کے بیڑے رنگین پاپوں والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ حسن و وقار کا بیکر معلوم ہوئی تھی۔ علاقے کے دور دراز لوگوں سے مل کر اور ان کی چھوٹی موٹی شکایت سن کر وہ ابھی اچھی فارغ ہوئی تھی۔ یہ لوگ دو تین ماہ میں ہی شانی کو اس کی والدہ و دوی آچا کا سارو دینے لگے تھے۔ شانی خود کو

سردی میں گرمی کی جوت پہنے گئی تھی۔ کھیتوں میں سرسوں کھلی ہوئی تھی۔ گندم کے برے خوشے آہستہ آہستہ رنگ بدلے گئے تھے۔ شانی اب رنگ والی کی حویلی میں تھی۔ چھوٹی چو درانی بالآخر اپنے گاؤں میں واپس آگئی تھی۔ اسے گاؤں میں واپس لانے اور یہاں اس کے قدم بچانے میں حاجی حیات کا کردار بہت اہم تھا۔ حاجی حیات نے رستم سے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا اور کسی بھی موقع پر کسی بھی مشکل مرحلے میں شانی کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ حاجی حیات مکمل کر تو سامنے نہیں آیا تھا مگر ہنس پر وہ شانی کو درجنوں آنکھوں سے دیکھ کر شیوہں ہاتھوں سے اس کی مدد کرتا رہا تھا۔ حاجی حیات کے علاوہ عارف کبیرہ اور اجمل خان نے بھی اپنا اپنا کردار چال فشالی سے ادا کیا تھا۔

چو درنی بھیرے شانی کی جان اس طرح بچھوٹی تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چو درنی بھیرا، اجمل خان کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس وقت کو بھی میں موجود اس کے تمام ساتھی بھی قتل ہوئے۔ ایک شائدہ رو گئی تھی۔ اجمل نے دو بارہ جا کر اس کا کام بھی تمام کر دیا اور ہر ثبوت وہاں سے مٹا دیے۔ چو درنی کے قتل کے فوری مناظر اب بھی شانی کو چاکلی آنکھوں کا خواب لگتے تھے۔ جس طرح کبھی بھی ناکرہ جرم کی سزا مل جاتی ہے، اسی طرح کبھی بھی کیا ہوا جرم بھی آپوں آپ پس پردہ جا سکتا ہے۔ چو درنی بھیرا والے کیس میں بھی یہی ہوا تھا۔ سارا الزام چو درنی کی حریف پارٹی وحدت گروپ پر آیا تھا۔ وحدت گروپ نے یہ قتل نہیں کئے تھے لیکن سارے ثبوت اور اشارے جبران کن طور پر ان کے خلاف لگے اور وہ دھڑلے لگے۔ شاید ان کے کسی اور ہمیاک جرم کی سزا نے انہیں پکارا تھا۔ قدرت کا نظام کبھی کبھی ایسے بھی انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

بہر قدرت اللہ نے ان کی ذمہ داری سنبھالی ہے اور والے معاملے کو اب پانچ ماہ

اس عزت افزائی کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اسنے میں حویلی کے پرانے ملازم خادم حسین نے اندر آکر سلام کیا اور اب سے بولا۔ ”چھوٹی بی بی! آپ کا فون ہے جی لاہور سے۔ رانا امتیاز صاحب ہیں۔“

”اب کیا کہتے ہیں وہ؟“ شانی رو ہنسی ہو کر بولی۔

”وہی گل کرنی ہوگی جی۔ ان کے داغ میں دوا (گھسا) ہوا ہے کہ آپ کو انکیشن میں کھڑا کر کے چھوڑتا ہے۔“ شانی نے خادم حسین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اسے کہا کہ وہ انہیں نال دے۔ پھر بتائیں کیا ہوا۔ ذرا انہی ملی تو شانی ایک دم روئے گی۔ سیکندہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آخر وہ بولی۔ ”کیوں رورو کرنا ہمارا خالی کرنی ہے شانی؟“

وہ جیسے بھوت پڑی۔ ”سیکندہ! وہ سب کہاں چلے گئے؟ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان۔۔۔ کوئی بھلا ایسے بھی جاتا ہے سیکندہ؟ ایسے بھی زلاتا ہے؟ سیکندہ کہیں۔۔۔ وہ بھر پڑاؤں میں تو نہیں چلے گئے۔ ڈسے ڈسے کی جگہ کوئی اور ڈیرہ بنایا ہوا نہیں۔۔۔ کوئی اور گروہ بن گیا ہو۔ کہیں رستم نے اپنے لئے کوئی نئی دنیا تو نہیں وسائی سیکندہ؟ مجھے بھلا تو نہیں دیا کہیں؟“ ڈھونڈنے والے کو تو رہی مٹا ہے پھر وہ مجھ کو کیوں نہیں مٹا؟ کہیں اس نے مجھ سے اپنا رستہ جان بوجھ کر تو کر نہیں کر لیا؟“

سیکندہ نے آنہ بھری۔ ”میں تجھے کیا تیلی دوں شانی! میں رستم کے بارے میں بہت تھوڑا جانتی ہوں اور جی بات تو یہ ہے شانی۔ کہ یہ مرد۔۔۔“ وہ کہتے کہتے خاموشی ہو گئی۔ اس کا گھا رندہ گیا تھا۔

اسنے میں آہ سے کی طرف سے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز آئی اور کتا قد ڈولا تیزی سے اندر داخل ہوا۔ شانی کو بے تکلفی سے مخاطب کر کے بولا۔ ”ہائی جی! خان بھائی آگئے ہیں۔ اپنے ساتھ بہت سے بادام اور خشک وغیرہ لائے ہیں۔ بڑے جوش میں نظر آتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ان کے پاس آپ کے لئے کوئی خاص خبر ہے۔ آپ کو پورا بلانا رہے ہیں۔“ ڈولے نے ”فورا“ اجمل خان کے انداز میں ادا کیا۔

شانہی اُٹھ اور حویلی کی بیٹھک کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

اجمل خان نشست گاہ میں موجود تھا۔ شانی دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔ اجمل خان تھاک سے ملا۔ اس کا چہرہ سرخی مائل ہو رہا تھا۔

”اجمل! اسنے دن کہاں رہے؟ فون پر بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں تمہارے لئے بہت پریشان تھی۔“

”ام نے سبے کار میں وقت ضائع نہیں کیا ہے جی۔ اگر ام پر سے آیا ہے تو اس کا کوئی وجہ تھا۔ ام بھی آپ سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن سٹائل ٹھیک نہیں آتا تھا۔“ چند لمحوں وقفہ کر کے اصل نے اپنے سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں کیش اور بادام ہے جی۔ کچھ اخروٹ بھی ہے۔ اخروٹ کے لئے مٹا ہے ام سے خاص پر ہاتھ کیا تھا۔“

”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اتنی دیر کہاں رہے تو؟“ اپنے سوال میں شانی نے رستم کا نام نہیں لیا مگر اس سوال کے ہر لفظ میں رستم ہی کی جستجو تھی۔

اجمل خان نے جیسی آواز میں کہا۔ ”ایک کھوج تو لگا ہے شانی بہن۔۔۔ اور ام کو امید بھی ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے گا۔“

”پلیز! اجمل۔۔۔ پیلیس! نہ بھجواؤ۔“

”اصل نے کہا۔“ امارا خیال ہے جی کہ ام اس بندے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پچھلے نو سو مہینے میں امارا کھوڑا چل پڑا ہو گیا ہے۔ امارا مطلب اس لبو سے ہے جس کے پاؤں کا نشان ڈولے نے مری میں ڈھونڈا تھا۔“

یہ خبر شانی کے لئے چونکا دینے والی تھی۔ اس نے کیے کے بعد دیگرے اجمل خان سے کئی سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے جواب میں اجمل خان نے انکشاف کیا کہ وہ بندہ اس وقت گوجرانوالہ میں ہے اور اجمل کے قبضے میں ہے۔ اجمل اسے وہاں ایک کرائے کے مکان میں اپنے ہزار دوست کے پاس چھوڑ آیا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ شخص رستم اور ناصر وغیرہ کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ بتائے گا۔

”تمہیں کیسے یقین ہے اصل کے یہ وہی ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”ام نے اسے مری سے چکرا ہے جی۔ اور اس علاقے سے جہاں ہم اسے سب سے زیادہ ڈھونڈتے رہے ہیں اور اب تو اس غیبت نے خود بھی کچھ مان لیا ہے لیکن امارا خت کوشش کے باوجود یہ بندہ امارے مطلب کا بات بتانے کو تیار نہیں ہے۔“

”یعنی رستم اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں؟“

”جی ہاں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ جیوں کہاں گیا لیکن ام جانتا ہے کہ وہ بتا ہے۔ وہ چھپا رہا ہے اور سخت وحیث پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ام کو تو وہ نیم دیوانہ لگتا ہے۔ اس کا سوچ بھی بہت کمزور ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ اگر ام کو زیادہ دھندہ آگیا تو وہ امارے ہاتھوں سے ہوت (خوت) ہو جائے گا۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو اجمل۔ اگر یہ بندہ واقعی وہی ہے جو والدہ ارمانگی سے ملا تھا اور جس نے انگی کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا تو پھر یہ بندہ بہت اہم جانت ہو سکتا ہے۔“

”اسی لئے تو ہم آپ کے پاس پہنچا ہے شانی بہن۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ خود امارے ساتھ گرجا نوالہ جائے اور اس ڈھیت کے ساتھ تھوڑا سا بات چیت کرے۔ ام کو لگتا ہے جو کام ام درجنوں گولیاں چلا کر نہیں کر سکتا وہ آپ دو چار باتوں سے کر سکتا ہے۔ ام کو یاد ہے آپ نے لکھی خان کے کمرے والا مالہ کتنے اچھے طریقے سے نشانیا تھا۔“

”وہ کیا کہتا ہے؟“

”اس نے اپنا نام راکب خان بتایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ اسکرود اور چٹاس کی طرف کارہنے والا ہے۔ وہ یہ بات بھی مانتا ہے کہ وہ ان غیر ملکی لوگوں کی تلاش میں تھا جو یہاں ان پیراؤں میں..... خاص پودے سب گندل پر پھرجات کرتے پھر رہے تھے۔ وہ انچی زبان میں سب گندل کا نام کچھ اور لیتا ہے۔ اس کو سن کر کہتا ہے۔ خو..... ام آپ کو بتانا بھول گیا، وہ پستو تو یوں ہے مگر بہت رک رک کر۔ اس کا زبان اور لہجہ اور طرح کا ہے۔ اس کا اصل زبان کچھ اور ہے۔ تھوڑا بہت اردو بھی جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوس کی کاشت کرنا، اس کو استعمال کرنا اور اس کو ضائع کرنا، سب کچھ جرم ہے اور امارے بزرگوں کے نزدیک اس کا سزا موت ہے کم نہیں ہے۔ ایسا کام جو بھی کرے گا اور جہاں بھی کرے گا، امارے لوگ اس کو سزا دیں گے۔“

”چلو۔ جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ان کو سزا مل گئی۔ مگر اس کے بیٹے میں ان میں سے بہت سوں کو ذبح کر دیا گیا لیکن جو باقی تھے ان کو کس جرم میں جکڑا دیا اور وہ اب کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

”بس بی..... وہ اس سے آگے کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ ام نے اسے دو تین دن بھوکا بھی رکھا ہے تھوڑا سا مار پھینٹ گیا ہے۔ ڈرایا دھکا دیا بھی ہے۔ وہ حرامی ایسی ٹکس سے مس نہیں ہوا۔ ایسا لوگ بہت خوش قسمت کا ہوتا ہے شانی بہن! وہ کہتا ہے کہ ام تمہارے ہاتھوں مر جائے گا تو کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری دنیا میں ام کو بہت اونچا مقام ملے گا۔ ام نے اس سے کہا تم پہلے ہی سانس فٹ اونچے ہو اب اس سے اور اونچا مقام کیا لو گے۔ ویسے اس فحیث کی باتوں سے ام کو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ ام کو یقین ہے اگر آپ گرجا نوالہ چلی جائیں تو اس سے زیادہ اچھی طرح بات کر سکتے گا۔“

شانی سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اصل جو اطلاع لایا تھا وہ معمولی نہیں تھی۔ یہ لڑھکیک فحش رستم، ناصر اور شریف کی بڑا سراگندہ کی کتنی سختی بھروسہ تھا۔ اگر اجمل نے واقعی مطلوب فحش کو

ڈھونڈا تھا تو پھر چوہدری بشیر کے قتل کے بعد یہ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔ ایک عجیب سی لہر شانی کے سراپا میں دوڑنے لگی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں کئی اندیشے بھی تھے۔ اجمل اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کے لئے اسے رنگ والی سے لگنا پڑتا اور عارف کبوتر نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

شانی کو سوچ میں رکھ کر اجمل خان بولا۔ ”ام جانتا ہے آپ کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔ رنگ والی سے نکل کر گرجا نوالہ جائے میں آپ کے لئے کافی خطرہ ہے۔ آپ کے ساتھ گرجا نوالہ جانا ضروری ہے۔“

شانی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”عارف برسوں بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت اللہ کے بیٹے ملاتے ہیں مگر وہ جہاں..... ایک، دو، تین، چار..... پھر اسے پکڑا گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ قدرت اللہ کا بیٹا ہے۔ تھا۔ میں اس نے بتایا کہ وہ قدرت اللہ کی بیوی پر یہاں آیا تھا اور رنگ والی کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے اور لوگ بھی آس پاس موجود ہوں۔“

”پھر کیا کیا جائے شانی بہن..... کیا ام کسی طرح اس لہو حرامی کو یہاں لانے کی کوشش کرے؟“

”نہیں یہ بھی ٹھیک نہیں۔“ شانی نے کہا پھر توقف سے بولی۔ ”اچھا، میں ہی کچھ سوچتی ہوں۔“

شانی نے عارف کبوتر سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد اس نے پھوپھو آٹھ کے کپڑے پہنے۔ سر پر موٹی اوزمٹی کی اور ہلکا گھونٹ نکال کر اس 86 مالڈ نوینا کار میں آ بیٹھی جس پر عمو پھوپھو آٹھ سڑک کی کڑی قصیں۔ ڈولا اور اجمل خان شانی کے ہمراہ تھے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ رنگ والی کی حویلی کے مین چانگ سے باہر ابھی درجنوں افراد اپنی بی بی کی ایک جھک دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ اس میں مرد و زن اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ سب اپنی بی بی سے محبت کرتے تھے۔ اس کی راہ میں آنکھیں بجھائے رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں اس کی تصویر تھی بالکل اسی طرح جس طرح کچھ عرصہ پہلے شانی کی ماں کی تصویر تھی۔

شانی ہماری گھونٹھک کی اوٹ سے اپنے ان پرستاروں کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتی رہی اور گاڑی بند پلٹے راستے پر دوڑتی تھی تو آگے بڑھتی چلی گئی۔ شانی کے دل و دماغ میں باہل بھی ہوئی تھی۔ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ کیا وہ راکب خان نامی اس شخص سے کچھ پوچھ جائے گی؟ کیا وہ اس کے لئے اپنی چپ توڑنے پر راضی ہو جائے گا؟

اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا یہ شخص رستم اور ناصر کہاں ہیں، ان کے متعلق جاننا ہے؟

رنگ والی سے گوجرانوالہ تک کے راستے میں راکب خان نامی دراز قد شخص کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ قریباً دس دن پہلے اصل خان اپنے شہر حسن ابدال سے گلیات میں آیا تھا۔ یہاں اسے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ دوسرے گاؤں کے پاس یہ دراز قد شخص اسے بالکل اتفاقاً ہی نظر آ گیا تھا۔ اصل خان نے اسے ایک دکان کے ادھ کھلے شتر کے نیچے سے دیکھا تھا۔ یہاں وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا شادی کھیل رہا تھا۔ بس اصل خان شادی کی تقریب کو بھول بھال کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ جیسے ہی اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ مظلوم شخص ہے جو چند ماہ پہلے حوالدار ناگی سے ملتا تھا اور ناگی کو غیر ملکیوں کا پتہ لگانے کے لئے دھوت کی پیشکش کی تھی..... اصل خان نے اسے گمن پناہ پر اٹھایا..... اور پھر اسے مری سے گوجرانوالہ لے آیا۔ شاید وہ اسے رستم والی ہی لے آئے لیکن مختلف اندیشوں کے تحت رک گیا۔

شانی، اصل خان اور ڈولا جب گوجرانوالہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ اصل کی رہنمائی میں حویلی کا ڈرائیور عباس انہیں ایک مضافاتی رہائشی علاقے تک لے گیا۔ یہ ایک زیر تعمیر علاقہ تھا۔ جس چھوٹی سی مکان نما کوئی کے سامنے گاڑی رکھ کر کے ارد گرد زمین چلاٹ خالی پڑے تھے۔ اصل نے گیت کھولا اور گاڑی اندر چلی گئی۔ اصل کے دوست شیر محمد نے ان کا استقبال کیا۔ یہ شانی کے لئے جانا پہچانا شخص تھا۔ شیر محمد کی دوگلی کار میں چار پہنڈی اور سمری کے درمیان بٹائی تھیں۔ یہ شیر محمد ہی تھا جس نے چوہدری بشیر کے قتل کے بعد اصل خان کو دلیرانہ پناہ دی تھی۔ تب اصل کے ساتھ شانی کے علاوہ گریس، منا، ڈویس اور ڈولا وغیرہ بھی تھے۔ شیر محمد ایک مضبوط اور بڑے سکون شخص تھا لیکن آج وہ شانی کو کچھ ہراساں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر کد رنگ بٹا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد اصل نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے برادر؟“

شیر محمد اصل کو ایک جانب لے گیا اور کھسر پھسر کر لگے۔ شانی کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ڈولا بھی کچھ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”پاجی بی اچھے لگتا ہے کہ اندر کوئی بندہ ڈکی ہے۔ اس کا خون بہہ رہا ہے۔“

اصل اور شیر محمد تیزی سے اندر چلے گئے تھے۔ ان کے پیچھے شانی اور ڈولا بھی چلے گئے۔ ٹی وی لاؤنج میں ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ شیر محمد ایک دروازے کا لاگ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ شیر محمد اور اصل کے پیچھے وہی اندر چلے گئے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ ٹیوب

لائٹ میں اندر کا منظر چمکنا دیکھنے والا تھا۔ ایک دبلا پتلا نوجوان کمرے کے بل کمرے کے فرش پر لیٹا تھا۔ اس کے نیچے درمی خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ نوجوان کا سوز اور شلوار قمیض بھی ٹری طرح خون آلود تھی۔ خون اتنا زیادہ بہا تھا کہ اس کا رنگ کیسوں کی طرح زرد دکھائی دے رہا تھا۔ نوجوان کے دونوں ہاتھ پشت پر ٹانگیوں کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔

”یہ کیا ہوا اصل؟“ شانی نے پوچھا۔

”اس نے اپنا کھانا شیشے سے کاٹ لیا ہے۔ یہ دیکھئے جی۔ اس نے یہ شیشے کا جگ توڑا ہے اور اس کے ٹکڑے سے اپنا دونوں کھانا کھا لیا ہے۔“

شانی نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک نہیں دونوں کھانا کھا لیا تو یہی طرح کئی ہوں تھیں اور مضروب نیم بے ہوش تھا۔ بلاشبہ یہی وہ راکب خان تھا جس کی تلاش نے انہیں مینوں سرگرواں رکھا تھا۔ آج وہ شانی کو نظریں آ رہا تھا تو کس حال میں۔ وہ آخری سانس لے رہا تھا اور اپنے ہی خون میں لٹ پڑا تھا۔ شانی گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بڑے اضطراب کے عالم میں اس نے نیم خان شخص کا شانہ بھجھوڑا۔ ”راکب خان..... راکب خان۔“ اس نے پکارا۔

اصل بھی بیٹھ گیا۔ اس نے بھی راکب خان کے رخسار دیکھے تھے اور اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

راکب خان نے اپنی سفیدی مائل آنکھیں کھولیں اور عجیب نظروں سے شانی اور اصل خان کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں فتح مند کی جھلک تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو، دیکھو..... میں نے تمہاری نہیں چلنے دی اور اپنی چلائی۔ اب کیا پوچھو گے مجھ سے؟ کیسے پوچھو گے؟ شانی خوب کر رہ گئی۔ اس نے بے یقینی سے اصل خان کی طرف دیکھا۔ ”اصل کچھ کرو، یہ مر رہا ہے۔“

راکب خان نے نفی میں سر ہلایا اور ہونٹوں کو حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اب کچھ حاصل نہیں۔

شانی نے بے تاب ہو کر اس کا سراپے زانو پر رکھ لیا۔ وہ کراہی۔ ”نم نے ایسا کیوں کیا؟ اپنی جان ہی قسم کرتی۔ ہم ایسا کیا چاہتے تھے؟“

شیر محمد نے اسے پانی پلایا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھوں کی بندش کھولنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے شیر محمد کے ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ اصل خان باہر بھاگا تا کر ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی دروازے کے سین سامنے لے آئے۔ عاتباً اسے امید تھی کہ راکب کو کسی ہسپتال یا کسی پرائیویٹ کلینک تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ڈولا بھی اصل کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ شانی

کو ایسی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے راکب کو ہولے سے ہلایا اور وہ ہانسی آواز میں پوچھا۔ ”راکب! وہ سب کہاں گئے؟ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ کچھ تو بتا دو راکب۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شانی نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شاید اس کے عقیدے کے مطابق یہ کوئی مناجات تھی۔ اپنے چہرے پر بیگانی کیفیت لئے وہ بڑبڑاتا رہا اور ہاتھ کھینچ کر سامنے لیتا رہا۔

شانی نے اس کے رشکار پر ہاتھ پھیرا۔ ”جسمیں تمہارے خدا کا واسطہ۔ کچھ بتا دو۔“ اس کے ساتھ ہی شانی کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر نوجوان کی لمبوتری ٹھوڑی پر گر گئے۔ اس نے اپنی بند آنکھوں میں درز پیدا کی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لہری تھی۔ ایک جیب جونی کیفیت تھی۔ اس نے چند لمحوں تک شانی کو دیکھا پھر کچھ بولا۔ شانی نے اپنا کان اس کے سر د ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے جو الفاظ کہے وہ شانی کی سمجھ میں آئے۔ یہ بڑے بے رحم الفاظ تھے۔ اس نے کہا۔ ”ان کو بھول جاؤ۔ وہ سب ختم ہو گیا۔“ خور، برف کے اندر چلا گیا۔“

”نہیں۔ نہیں یہ غلط ہے۔ ایسا مت کہو۔ مجھے جی بتاؤ۔“ شانی نے نبدیانی انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بار بار جھنجھوڑا۔

وہ پھر آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ شانی اسے بلاتی رہی اور پکارتی رہی۔ ”خدا کے لئے زبان کھولو۔ ہمارے ساتھ ایسا مت کرو۔“ پھر ٹوہنیا کا مین دروازے کے سامنے آ کر رک گئی تھی لیکن جسے کار میں ڈال کر پھینال۔ جایا جاتا تھا، وہ سر نہ جھکا تھا۔

اجمل خان اور ڈائریکٹر عباس دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ شانی دروازہ راکب کی لاش کے پاس ٹھہری تھی۔ اس کی آنکھوں سے نپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ”کیا ہوا شانی! بہن؟“ اجمل گرا رہا۔

”یہ مر گیا۔“ شیر محمد نے راکب کی کھلی آنکھوں کو بند کرتے ہوئے کہا۔

ڈولا شانی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس نے شانی کو پانی پلایا۔ شانی کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ابھی راکب نے جو الفاظ کہے تھے، وہ بے حد اندوہناک تھے۔ یہ الفاظ کہے انکاروں کی طرح شانی کی سماعت میں آئے تھے اور پورے جسم میں پھیل گئے تھے۔ اب یہ الفاظ اسے اندر سے خاستہ کر رہے تھے۔ اچانک شانی کا پیٹ مبر لرز ہو گیا۔

اس نے انھوں میں چہرہ چھپایا اور بلند آواز سے روئے لگی۔ ڈولا، اجمل اور شیر محمد سخت گھبرا گئے۔ اجمل نے قریب کر کہا۔ ”کیا ہوا شانی! بہن؟“

ڈولا رو ہانسی آواز میں بولا۔ ”باقی جی! کیا ہوا؟ حوصلہ رکھیں۔“

شانی ہچکچاہٹوں سے رو رہی تھی۔ شیر محمد نے دھیمی آواز میں اجمل سے کہا۔ ”اس پاؤندے نے بی بی سے کوئی بات کہی ہے۔“

”کیا کہا ہے؟“

”میں سن نہیں سکا لیکن اس نے کچھ کہا ہے۔“

اجمل، ڈولا، عباس اور شیر محمد سادھے سادھے ساکت کھڑے رہے۔ شانی صوفے کی پشت پر سر نکالے رو رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں قریب آ سات فٹ لمبے راکب خان کی خون آلود لاش ایک سرست راز کی طرح پڑی تھی۔

”خیر، شانی! بہن! اس نے آپ سے کیا کہا ہے؟ آپ کو بتائیں، شاید ام آپ کو اس کا کوئی جواب دے سکے۔“

شانی بس لنگی میں سر ہلاتی رہی۔ اجمل خان اور عباس وغیرہ راکب کی لاش کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے ارد گرد بہت سی جگہ خون سے لت پت تھی اور خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ شانی نے کرا رہے ہوئے اجمل خان کو مخاطب کیا۔ ”اجمل! اتم سے یہ اچھا کام نہیں ہوا۔ تم نے اس پر اتنی سختی کیوں کی کہ یہ خوشی پر مجبور ہوا۔ اس کی جان تمہاری غفلت اور تمہاری سختی سے گئی ہے۔“

”نہیں شانی! بہن! ام آپ کے سر کا قسم کھاتا ہے، ام نے اس پر زیادہ سختی نہیں کیا۔ آپ اس کا جسم دیکھ لیں۔ کہیں چوٹ کا نشان نہیں ملے گا۔ ام اس کو دھکا تا ضرور رہا ہے لیکن زیادہ مار پیٹ اس سے نہیں کیا ہے۔“

شیر محمد نے اجمل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی گواہ ہوں بی بی جی۔ اجمل غلط نہیں کہہ رہا۔ پولیس والے حوالا تین پر متوجہ کر رہے ہیں یہ اس کا دواں حصہ نہیں تھا۔ پہلے تین دن کے سوا ہم نے اس کے کھانے اور آرام کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ یہ ایسے ہی جونی تھا۔ اس کی جیب سے اس کی ایک تصویر بھی ملتی ہے۔ اس تصویر میں اس کی جہاز جھکاؤ اڑا رہی ہے اور صفائیت سر ہے۔ اور سیرے خیال میں یہی اس کا اصل حلیہ ہے۔ یہ شیر یوں والا حلیہ تو اس نے یہاں گھومتے پھرنے کے لئے بنا رکھا تھا۔“

اجمل نے راکب خان کے گنگے سے ایک تعویذی آثار کر شانی کی طرف بڑھایا۔ یہ

دراصل تانے کی ایک چھوٹی سی تختی تھی۔ اس پر سانے کی طرف ایک درخت کی شبیہ کندہ تھی۔ تختی کی اٹھارہ ست پر دوپٹے سے بٹے ہوئے تھے۔ ان بٹوں کی شکل سانپ کے چمن سے ملتی جاتی تھی۔ شانی دیکھنے سے پہچان گئی۔ ان بٹوں اور سوپ کندل کے بٹوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اجمل نے راکب کی نیٹھ کی جیبوں سے برآمد ہوئے والی کچھ اور اشیاء بھی شانی کو دکھائیں۔ کچھ پاکستانی اور چائیز کرنسی۔ نامعلوم زبان میں لکھا ہوا ایک خط۔ ایک چاقو اور دو چار نوٹ لکھو رت چتر جو شاید برکت کے لئے جیب میں رکھے گئے تھے۔

شانی کو اپنا دل بیٹھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی لگ رہا جیسے قتل آ جانے کا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈولے نے کہا۔ "بائی مائی آپ تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جائیں۔" شانی وہیں بیٹھی رہی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپانے سکپاں بھرتی رہی۔ مرنے والے کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "ان کو بھول جاؤ۔ وہ سب ختم ہو گیا۔ خور، برف کے اندر چلا گیا۔"

یہ کیسے سفاک الفاظ تھے۔ کیا یہ الفاظ صحیح تھے۔ اور کیا ان کا مطلب وہی تھا جو کچھ میں آ رہا تھا؟ ختم ہونے سے کیا مراد ہے؟ ختم ہونے سے مراد تو نہیں تھی کہ وہ ہم سب کے لئے ختم ہو گئے لیکن زندہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دلائے دینے لگی لیکن کوئی دلا سا بھی اتنا مؤثر نہیں تھا کہ اس کے دل کی ٹوٹی ہوئی رگوں کو ٹھونسے سے سچا سکتا۔

نہیں، وہ نہیں مر سکتا۔ وہ دل ہی دل میں کراہی۔ وہ اس طرح مجھ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وقت کتنا بے رحم ہو کر اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا۔

اجمل، شیر محمد اور عباس لاش کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تیزی سے ساتھ برآمدے میں سے کچھ اشیائیں اکٹھا کر لیں۔ اب وہاں گڑھا کھودنے میں مصروف تھے۔ اس کام میں انہیں کم از کم ایک گھنٹہ لگنا تھا۔ بچنے سے کھادی کرتے ہوئے وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے تاکہ اور گردہ کسی گھر تک کھادی کی آواز نہ پہنچے۔

شانی طرہ حالی ہو کر ساتھ والے کمرے میں آن لپٹی۔ یہ بات تو اسے اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ گورے کے بچلے پر حملہ کرنے والے لوگ گلگت یا چیلان وغیرہ کی سائیڈ سے آئے تھے۔ اگر وہ رستم اور ناصر دو گروہ اپنے ساتھ لے گئے تھے تو پھر انہیں۔۔۔ ان ہی مثالی علاقہ جات میں دھڑل جانا چاہیے تھا۔ اجمل خان اور حامی حیات کے ہلکا دلوں نے ان علاقوں میں بہت خاک، پاکوٹا چاہے کہ برف چھانی تھی۔ دور دراز کی باتیں تک پہنچتے تھے۔ علاقے کے لوگوں سے سن گمن کی گئی۔ سب کندل کے حوالے سے بھی بہت فوہ لگانے کی

کوشش کی تھی کہ شاید کسی ایسے کو ہستانی قبیلے کا چل چلا جائے جو اس پودے کو خاص اہمیت دیتا ہو۔ یا کوئی ایسی جگہ جہاں یہ پودا قدرتی طور پر پایا جاتا ہو۔ لیکن ابھی تک کوئی بھی محسوس بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ کم از کم کوئی ایسا "سراغ" نہیں مل سکا تھا جس کی مدد سے حامی حیات یا اجمل خان پیش رفت کر سکتے۔ اور پھر موسم سرما شروع ہو گیا تھا۔ اب بلند پہاڑوں پر شدید برف پاری کے سبب اہم راستے بند پڑے تھے۔

شانی اپنی اوزن میں چہرہ چھپا کر لپٹی رہی اور سسکتی رہی۔ ڈولا بے بسی سے اس کے قریب بیٹھا رہا۔ آج وہ پھر جب اجمل خان نے رنگ والی کی حویلی میں آکر شانی کو طویل نامت راکب خان کے بارے میں اطلاع دی تھی تو شانی کا دل جوش اور امید سے بھر گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آکر گروہ کو روانہ پہنچ جائے اور اس شخص سے ملے۔ اور وہ پہنچ بھی گئی تھی لیکن یہاں پہنچ کر جو کچھ سامنے آیا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

راکب کی لاش کو دبانے کے بعد عباس اور شیر محمد اینٹوں کا فرش پھر سے درست کرنے لگے۔ وہ اینٹوں کو اس طرح بچے سے لگا رہے تھے کہ ان کی آکھاڑ پچھاڑ کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ اجمل اتھو نہ دھو کر شانی کے پاس آئے بیٹھا۔ وہ افسردہ تھا۔ شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اجمل۔ مجھے یقین ہے، اگر مجھے ایک دو گھنٹے مل جاتے تو میں اس سے کچھ نہ کم ضرور پوچھ لیتا۔"

"خور، آپ ٹھیک کہتا ہے شانی بہن۔۔۔ ام آپ کو یہاں لایا بھی تو اسی لئے تھا۔ مارے دہم و گمان میں بھی نہیں تو کہ یہ شخص اس طرح کا حرکت کر ڈالے گا۔ نام خود سے اور آپ سے بہت شرمندہ ہے۔ بے بندہ مارے لئے بہت پاکوٹا مند ثابت ہو سکتا تھا کاش ام اس کی دعا کرتا۔ اراد دل تم سے ایک دو پوچھو رائے را ہو گیا ہے۔"

شانی خاموش رہی۔ کمرے میں پوچھل سنانا چھایا رہا۔ اس سناٹے کو توڑنے کے لئے شیر محمد نے نہایت بھرے لہجے میں کہا۔ "میرا قصور سب سے زیادہ ہے لیکن آپ کی طرح مجھے بھی یہ شک نہیں تھا کہ یہ بندہ اپنی جان لینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ میں مات گئے تک جانتا رہا۔ سونے سے پہلے میں اس کے پاس گیا اور پوچھا، لالہ پالہ چیرو؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑا رہا تھا۔ جب تک یہ بالکل صبح تھا۔ وہ پھر کو کبھی میں نے اسے اپنے اچھے سے پاؤں کھلائے تھے۔"

اجمل رستم سے ہوئے گلے سے بولا۔ "شانی بہن! کیا راکب نے رستم بھائی کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا؟"

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور آنسو چھپانے کے لئے چہرہ پھر بازوؤں کی اوٹ میں کر لیا۔

”نہیں شانی بہن! آپ نے جو سنا ایک دم غلط ہے۔“ اصل جذباتی ہو کر بولا ”امار سے رستم بھائی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاں ہوگا بالکل صحیح سالم ہوگا۔ آپ بالکل بے باک رہو..... بالکل بے فکر ہو۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی اپنی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

راکب کی ذاتی اشیاء میں سے ملنے والا خط ڈالنے کے ہاتھ میں تھا۔ نہ جانے یہ کون کی جتنی زبان تھی۔ ایک لفظ نہیں پڑتا تھا۔ ڈالا خط کو بخور دیکھ رہا تھا مگر اس نے یہ خط تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اب ام کو اداس چلنا چاہیے شانی بہن۔ ”اجمل خان نے کہا۔

شانی کو اپنا جسم کسی کا ذخیرہ محسوس ہو رہا تھا، غائبت ہی غائبت تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا، سب لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ وہ کمرے کے دروازے کو اندر سے کھڑی چڑھائے اور بستر پر گرنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ان الوقت یہ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ کچھ ایسے ایسے جاں کسل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جیسے سخت لوگوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں..... راکب کے کہے ہوئے الفاظ پچھلے ہوئے سسے کی طرح شانی کے کانوں میں تھے اور یہ سسہ اس کے ہارے جسم کو داغ رہا تھا۔

اجنا تک گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ”اجمل خان اور شیر محمد یوں اچھلے یوں پاؤں کے قریب سے کوئی سانپ نمودار ہو گیا ہو۔“ اصل خان کے بقول شیر محمد نے یہ مکان دو تین ماہ سے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ غالباً شیر محمد کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ رات کے اس بہر گھر کے بیرونی دروازے پر کوئی دستک دے گا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیر محمد نے اجمل سے مل کر گھر کے برآمدے میں ایک اداش، ایک خون آلودری اور چند دیگر اشیاء دہائی جنس..... اب دروازے پر بے وقت کی دستک ہو گئی تھی۔

”تھمارے کسی عہدے کو تو شک نہیں ہے؟“ اجمل نے سر موٹھ میں شیر محمد سے پوچھا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ شیر محمد نے کہا اور اپنی تھیں کے نیچے نکلا۔ دے دے والا رویہ اور لگتا ہوا باہر جھن میں چلا گیا۔ اندر اجمل خان بھی چونک نظر آنے لگا تھا۔ عباس نے ایک پار پائی ٹاکر برآمدے میں فرش کے اس حصے پر بچھا دی جسے اکھاڑا گیا تھا۔ برآمدے میں سے چھوٹی موٹی منسلک اشیاء بھی ہٹا دی گئیں۔ شانی نے اندر دی کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، شیر محمد باہر چلا گیا تھا۔ شاید آنے والا اس کا واقعہ کار تھا۔ شیر محمد کے باہر جانے کے بعد

دوبی دروازہ پھر بند ہو گیا تھا۔ مگر جوانی اس مضافاتی آبادی میں رات کا سناٹا سامنے نہیں کر رہا تھا۔ جوں جوں رات بھگت رہی تھی ایک ٹھہری ہوئی ڈھند ٹھیب و فرار کو احاطہ پکڑ چلی جا رہی تھی۔

ڈولے کے کان کسی دکھاری جانور کی طرح کھڑے تھے۔ شانی نے اس سے پوچھا۔

”کون ہے باہر؟“

وہ اٹھدے سے بولا۔ ”ایک آدمی ہے۔ کسی بزرگ کا پیغام لے کر آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ پیغام آپ کے لئے ہے۔ ایک دفعہ دے رہا ہے یہ شخص شیر محمد صاحب کو۔“

شانی، اجمل اور عارف وغیرہ نے اب ڈولے کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا تھا اور اپنا انوکھا پن اس نے بہت دفعہ ثابت کیا تھا۔

شانی نے خود کو سنبھالا، اٹھ کر اوڑھنی درست کی اور جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دروازے پر کون ہے۔ ابھی وہ صحن میں تھی کہ شیر محمد اداس آنظر آیا۔ شانی نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ وہ دروازے تک پہنچی اور باہر لگی کی بجائے تارکی میں جمکا۔ اسے ایک سائیکل سوار نظر آیا جو تیزی سے گلی کے موڑ پر داخل ہو رہا تھا۔ ”کون تھا یہ؟“ شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

شیر محمد نے اپنی چادر کی نکل میں سے ایک سفید رشتہ کا پرچہ نکالا اور شانی کی طرف بڑھادیا۔ ”نور الدین راجا نام کا ایک بندہ تھا۔ آپ کے لئے دے گیا ہے۔“

ڈولے کی صلاحیت ایک بار پھر ثابت ہوئی تھی۔

”کیا کہتا تھا؟“ شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے دریافت کیا۔

”کہتا تھا مجھے ہر بابا نے بھیجا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ نبی یہاں ہیں۔ میں اس سے

بہت سی رو گیا کہ وہ کون ہے لیکن وہ اتنا نا افسانہ کیا۔“

بیرونی دروازے کو کھڑکی چڑھا کر شانی اندر آئے۔ آندے میں اتنی اور بلب کی روشنی میں بچہ دیکھنا شروع کیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ایک ہونے بسے شخص نے نورانی اندوخال اس کی نظروں کے سامنے نمایاں ہوئے تھے۔ وہ اس شخص کو کیسے بھول گئی تھی جس نے ہمارے ہمارے کے ایک تاریک ویرانے میں شانی کو بچہ بدری شیر کے نژاد باہر کی روئندگی سے بچایا تھا۔ اس واقعے کا ایک ایک لمحہ شانی کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔ اور ساتھ ہی اس مہربان بزرگ کی صورت بھی جسے اس کے ساتھی ہار دیا تھا باہر بابا کہتے تھے۔ ہاں، وہ واقعہ شانی کے ذہن پر کندہ تھا۔ بارش سے بھیسے ہوئے تاریک درختوں میں بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگ ایک

دو شاہد بڑ میں پھنس گئی تھی۔ باہر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے شانی کی جانگ پھڑانے کی بجائے اسی حالت میں اس پر بھڑانہ حملہ کرنا چاہتا تھا۔ جب میرا بن بزرگ پیر بابا ایک فرشتے کی طرح نمودار ہوا تھا اور شانی کی حفاظت کی تھی۔

یہ اسی پیر بابا کا خطہ تھا۔ شانی ان کی تحریروں پہنچائی تھی مگر اس کا دل گمواہی دینے لگا تھا کہ یہ ان کے لکھے ہوئے الفاظ ہیں۔ پیر بابا نے شانی کے لئے اپنا مخصوص لفظ ”میرا بچہ“ استعمال کیا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

”میرا بچہ! آج بہت عرصے بعد تمہیں مخاطب کر رہا ہوں لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ میں تم سے سکرے خبر ہوتا ہوں۔ تمہارے حالات کی کچھ نہ کچھ آگاہی مجھ کو رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں میرا بچہ اس وقت تم بہت دکھی ہو۔ تمہاری آنکھیں سادوں بھادوں کی طرح برس رہی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی دکھ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور نہ ہی خوشی کے بغیر مکمل ہوتی ہے۔ خوشی میں سے دکھ اور دکھ میں سے خوشی کی کوئی گنجشک نفعی ہیں۔ قدرت ہمارے دکھوں کا مداوا ضرور کرتی ہے۔ کوئی ایک خوشی ہمیں نڈل سکے تو اس کے بدلے میں دوسری خوشی دوسرے طریقے سے مل جاتی ہے۔ تو میرا بچہ بہت نہیں ہارنی۔ سفر جاری رکھنا ہے۔ رات کتنی بھی لمبی ہو، کتنی بھی کالی ہو، صبح کا راستہ تو ہمیں روک سکتی ہیں۔ ہمت کرو میرا بچہ، بہت کر دو۔ اس وقت کچھ لوگوں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔ یہاں سے تمیں چالیس میل دور گجرات ہائی پاس سے ذرا آگے نور جینٹری کے پیچھے ایک گاؤں کا بھی وال ہے۔ کا بھی وال کے تھانیدار کا نام عاشق گوندل ہے۔ عاشق کی حوالات میں ایک میاں بیوی ہیں۔ ان میاں بیوی کو پھنچانا بہت ضروری ہے اور تم انہیں پھنچا سکتی ہو۔ عاشق نے ابھی تک ان پر کوئی ٹھوس الزام نہیں لگایا ہے، بس جیسے میں بکڑ رکھا ہے۔ تم ان کی ضمانت دے دو گی تو تھانیدار انہیں چھوڑ دے گا۔ ہو سکے تو ان دونوں کو اپنے ساتھ رنگ والی لے جانا۔ بعد میں میں جنہیں بتا دوں گا کہ ان دونوں کا پھنچا جانا کیوں ضروری تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جنہیں خود ہی پتہ چل جائے۔ اس موقع پر میں جنہیں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر تمہیں کوئی مجبوری نہیں تو ابھی یہاں سے گجرات روانہ ہو جؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کئی سوال کھلنے لگے ہوں گے۔ ان سوالوں کے جواب میں میں جنہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ان میاں بیوی کا تعلق رستم سیال سے ہے۔“

اس تحریروں نے شانی کو سکندر زدہ کر دیا۔ شرمشہ نے پیغام پہنچانے والے کا نام راجا بتایا تھا۔ جب وہ سائیکل پر سوار کی گئی کہ سوز پراوہ مل بورہا تھا تو شانی نے اسٹریٹ لائٹ میں اس کی

ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔ وہ یقیناً راجا ہی تھا۔ پیر بابا کے اس مرید کو بھی شانی کسی نہ کسی حد تک جانتی تھی۔ رقص شانی کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ اور محترم بزرگ کا چہرہ شانی کی نگاہوں میں محسوس رہا تھا۔ محترم بزرگ کا اصل نام آصف وارثی تھا۔ وہ ماضی میں قلموں کے ایک معروف اداکار رہے تھے لیکن اب یہ خوب روادا کار ایک کش فیکر کا روپ دھار چکا تھا۔ ان کی کسی ”وینٹیو پراؤٹ جیسی آواز“ شانی کو اپنے کانوں میں گونجنے ہوئی تھیں۔ وقت و رست انہوں نے شانی سے کیا تھا۔ ”میرا بچہ! میں جانتا ہوں تو تمہیں کچھ گھبرے میں ہے لیکن جس مالک نے تجھے مشکلیں دی ہیں اس نے تجھے حوصلے بھی دیا ہے۔ بس اس حوصلے کو نونے نہ دینا۔“

شانیا کا دھیان ایک بار پھر قلعے کے مندرجات کی طرف چلا گیا۔ پیر بابا نے جس مرد اور عورت کا ذکر کیا تھا وہ کون تھے؟ رستم سے ان دونوں کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ کہیں وہ بے جی اور چاچا ابراہیم تو نہیں تھے؟ کئی سوال شانی کے ذہن میں اوجھم جانے لگے۔ ایک جاگ وہ نری طرح چوک بن گئی۔ اسے لگا کہ اس کے سارے جسم پر بیخوشیاں کی رنگ بکری ہیں۔ کہیں یہ میاں بیوی رستم کی بہن اور بیہوش تو نہیں تھے۔ شانی کو یہ بات معلوم تھی کہ رستم کی ایک بڑی بہن آپو زیادہ ہیں جنہیں وہ بہت زیادہ چاہتا ہے۔ اپنی بہن اور بیہوش کی خوشی کی آگ اور پولیس کی دستبرد سے بچانے کے لئے رستم نے انہیں کسی محفوظ مقام پر رکھا ہوا تھا۔ رستم کے دوست زیادہ اور اس کی بیوی شیری کے سوا اس مقام کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے کہیں اپنا تو نہیں تھا کہ اب یہ مقام سب سے راز نہ رہا ہو اور وہاں بیوی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہوں۔ چند لمحوں میں شانی کی ہتھیلیاں پیسنے سے جھجک گئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈپٹی ریاض کی ٹخنوں صورت کھنسنے لگی۔ وہ بڑے عرصے سے ان میاں بیوی کی تلاش میں تھا اور انہیں ہر صورت اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ تو کیا ڈپٹی ریاض کی یہ خواہش پوری ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے؟

آنکھل خان، لیڈور شانی کے چہرے کا بدل رنگ دیکھ رہا تھا۔ ”شانیا بہن! ام کو بتائیں کیا لکھا ہے اس خط میں؟“ اس نے پوچھا۔

شانیا نے ایک گہری سانس لی۔ خط پر ایک نگاہ مزید دوڑائی اور بولی۔ ”بھل خان! ابراہیم نے یہاں سے گجرات جانا ہو تو کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ لگے گا، لیکن وہاں خبر یہ تو ہے؟“

”بے جی اور نہیں بھی۔ ہمیں گجرات سے تھوڑا آگے کا بھی وال گاؤں پوچھنا ہے۔ تم نے

نام سنا ہوا ہے گاؤں کا؟

اجمل کے بچائے ڈیوید رحمان نے جواب دیا۔ "بالکل بی بی جی! سنا ہوا ہے۔ وہاں کسی سے ملنا ہے آپ کو؟"

"تھانیدار سے..... وہاں تھانہ ہے ناں؟"

"ہاں جی! ابھی ایک سال پہلے ہی بنا ہے۔" ڈیوید رحمان نے جواب دیا پھر ڈوا پریشان لہجہ میں بولا۔ "خیریت ہے بی بی جی؟"

اجمل نے ذبح ہو کر کہا۔ "اوسے اللہ کے بندے! کبھی تھانے میں بھی خیریت ہوتا ہے؟" پھر اس نے اپنا رخ شانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بے فکر رہو جی۔ ام خود گاڑی چلائے گا۔ ان شاء اللہ آپ کو ایک گھنٹے سے پہلے گجرات پہنچائے گا۔ آپ آج اسکا پورا۔"

شاننی نے چند لمحوں کے لئے سوچا پھر اودھنی لے کر شولدر بیگ کندھے سے لٹکایا اور جانے کے لئے تیار ہوئی۔ اس طرح صرف ایک تحریر پڑھنے کے بعد گجرات کے لئے روانہ ہو جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا مگر نہ جانے کیوں شانی کے دل میں یہ بات میٹھ گئی تھی کہ یہ تحریر ایسی محترم بزرگی کی ہے جنہیں وہ اٹھنے بیٹھنے یا دوکرتی ہے۔ اور اس تحریر پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اجمل خان نے شیر محمد کو ایک طرف لے جا کر اسے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان ہدایات کا تعلق یقیناً اس کرائے کے گھر سے ہی تھا۔ اگر گھر کے فرش میں ایک لاش دفن ہو چکی تھی اور ان درود پورا کو کھنچی جلدی چھوڑ دیا جاتا، اتنا ہی بھرت تھا۔

کچھ ہی دور بعد 86 ڈال کی ٹویٹا کار تارک کی سائین چرتی ہوئی ٹی روڈ کی طرف جاری تھی۔ ان کا رخ گجرات شہر کی طرف تھا۔ کار میں شانی اور اجمل خان کے علاوہ ڈوڈا اور ڈیوید رحمان بھی موجود تھے۔ شانی ڈولے کے ساتھ کچھ نشست پر بیٹھ چکی۔

اجمل خان کی پھولی ہوئی چری جیکٹ میں ماؤزمر موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا بٹل بھی تھا۔ ان دونوں ہتھیاروں کے علاوہ قانون اور مذہبی اجمل کی جیکٹ میں موجود تھے۔

اجمل اپنے طے اور بول چال کے لحاظ سے ایک عام بندہ نظر آتا تھا۔ ایک خوش خوراک اور بے فکر سا بھٹان۔ لیکن شانی جانتی تھی کہ اس کے اندر کتنا مضبوط اور دنگ انسان چھپا ہوا ہے۔ وہ ڈے کی لڑائی میں خان کی شامت اور گھر کرائے کی قحطی اور کئی موقعوں پر اس نے رستم کو بھی دنگ کر دیا تھا۔ اس کے بعد چنڈی کی زہائشی کوشی میں اجمل کے ہاتھوں

چوہدری بشیر کا قتل بھی ایک ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ شانی اس خون ریزی کو یاد کر کے کانپ گئی۔ اجمل نے بشیر اور اس کے چہ کردوں کو کھینوں کی طرح مار ڈالا تھا۔

بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اجمل نے کہا۔ "شاننی بہن! ام کو تھوڑا سا آئینہ یاد سے دو..... تاکہ ام کو تیار رہا جائے۔ کیا وہاں کوئی لڑائی کا مالہ ہے یا بس بات چیت کرتا ہے۔"

"تھانیدار نے دو بندوں کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ ان کی ضمانت کرائی ہے۔" "اوہو۔" اجمل خان نے لمبی سانس لی۔ اس سانس میں گہری داپھی بھی شامل تھی۔

عائنا وہ کسی ہنگامے کی توقع کر رہا تھا۔

شاننی نے کہا۔ "لیکن معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تھانیدار کسی طرح کی حکمران کرے لیکن حق یہ بھڑکتا نہیں ہے۔ جوش کو دبا کر رکھتا ہے۔"

اجمل نے اطاعت مندی سے سر ہلایا پھر شاید سخت مٹانے کے لئے اس نے نسواری دنیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تاہم اسے راستے میں یاد آ گیا کہ نسوار پر پابندی ہے۔ اس کا ہاتھ چوٹ پاگٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے پاکٹ میں لے جانے کے بجائے چہرے کی طرف لے گیا اور بے وجہ دانا مٹی کھانے لگا۔

ڈولاب کچھ دیکھ کر ہاتھ لیکن تھا کہ وہ اس موقع پر کوئی مسکرانے والی بات کر تا مگر کچھ دیر پہلے والے واقعے نے ان سب کو گہری تنجید کی میں ڈیوید رکھا تھا۔ راکب خان نے جس طرح اپنی آہنی گیس کاٹ کر اپنی جان لی تھی اور خون میں لٹ پت ہو کر زمین پر ہوا تھا، وہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔ راکب کی ساری ذاتی اشیاء ڈولے نے ایک چھوٹے بیگ میں ڈال کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ یہ بیگ اب ڈولے اور شانی کے درمیان گاڑی کی نشست پر پڑا تھا۔ شانی کی ہدایت پر ڈولے نے بیگ کچھ نشست کے نیچے گھسا دیا۔

وہ جس وقت گاڑی وال گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف جگمگاتے ہوئے گھومتے تھے اور سردی معمول سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی..... شانی جب بھی دریائے چناب کے پاس سے گزرتی تھی، اسے اپنے اور رستم کے حوالے سے بہت کچھ یاد آتا تھا۔ آج بھی یاد آتا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ آج وہ اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل بپا کی تحریر میں الجھا ہوا تھا۔ جبر یا کہاں تھے؟ انہیں کبھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت میں گوجرانوالہ کے ایک خاص مکان میں پائی جاتی ہے؟ اور اگر انہیں یہ سب معلوم تھا تو پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ گوجرانوالہ کے اس

مکان میں آج ایک لاش برآمد سے کہ فرش میں دوپائی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد شانی کا دھیان ایک بار پھر رستم کی بہن اور بہنوئی کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنے سارے جسم میں سنسناہٹ کی بلند لہریں محسوس ہوئیں۔ دل زیادہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا وہ واقعی رستم کی بہن آپ زادہ اور بہنوئی اکرام سے ملنے جا رہی تھی؟ کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ اس نے رستم کی زبان سے آپ زادہ کے بارے میں کئی بار سنا تھا۔ خاص طور سے شادی کے بعد روایت سستی میں رہتے ہوئے رستم اکثر اپنی آپ زادہ کا ذکر کرتا تھا۔ اپنی آپ زادہ کا نام لیتے ہی رستم کی آنکھوں میں ایک محبت بھری نمی آ جاتی تھی۔ اس نمی میں بے شمار سہانی رتوں کی آن گت سہری یادیں ابھر کر آتی تھیں۔ رستم کی زبان سے آپ زادہ کے بارے میں سن کر شانی کے دل میں ان کے لئے بہت تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بڑی حیرت کے ساتھ سوچا کہ کیا اس کمر آلود رات میں اس شہم پختہ گاؤں کے پولیس اسٹیشن کے اندر وہ رستم کی بہن سے ملنے جا رہی ہے؟ ذرا دیر کے لئے اس نے سوچا، کاش ایسا ہو مگر پھر فوراً ہی سوچا کاش ایسا نہ ہو۔

گاؤں کو جانے والے کچے کچے راستے پر انہیں ایک موٹر سائیکل سوار حوالدار نظر آیا۔ انہوں نے گاڑی اس کے قریب روکی اور تھانے کا راستہ پوچھا۔ نیچے کوٹھنٹی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں والے حوالدار نے انہیں راستہ بتایا۔ اس کی موٹر سائیکل کے ہینڈل سے دو بڑے شاہرہ لنگ رہے تھے۔ ایک میں شاہرہ چھلی کا کچا گوشت تھا۔ دوسرے میں کاغذی بادام تھے۔ نمازوں میں مصیبت زدہ لوگ ایسی سوغاتیں بیچتے ہی رہتے ہیں۔

”تھانیدار صاحب ہوں گے؟“ شانی نے پوچھا۔

”آہو جی! تھانیدار صاحب سوتے ہی تھانے میں ہیں لیکن اس دیشے آپ ان کو تنگ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ سیرے آٹھ نو بجے کے بعد آجائیں۔“

”نہیں، ضروری کام ہے۔“ شانی نے کہا اور عباس کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

حوالدار بھی غائب چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا، آگے بڑھ گیا۔ اس کی موٹر سائیکل کی آواز بھی اس کی اپنی آواز کی طرح پہنچی ہوئی تھی۔

شانی کو امید تھی کہ رات کے اس پہر کچھی وال کا تھانیدار پر نفس نہیں تھانے میں موجود ہوگا اور جاگ رہا ہوگا۔ یہ فیر جسم اور گہرے گندی رنگ والا اسے ایسے آتی عاقل مگوئل تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک پرانی چوٹ کا نشان اس کے چہرے کو ایک کرخت وضع دے رہا تھا۔ وہ تھانے ہی کے ایک کمرے میں بڑی سی چار پائی ڈالے بیٹھا تھا اور عقدہ لی رہا

تھا۔ فرش پر مونگ پھلی اور گندہ ریوں کے چھلکے تھے۔ مٹی کی گچھٹھی دھبہ رہی تھی اور تین افراد تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ کمرے کے مین سامنے برآمدے میں ایک پچاس سی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ ایسی موٹر سائیکل بغیر کچے کے ہوتی ہیں۔

شانی اور اممل وغیرہ کی بے وقت آمد نے سب اسٹیکرو بد مزہ کیا۔ اس نے انہیں بیٹھنے کا بھی نہیں کہا اور کھڑے کھڑے سوال جواب کرتا رہا۔ بہر حال جب شانی نے اس سے اپنا تعارف کر لیا تو وہ بڑی طرح چونک گیا۔ نہ صرف چونکا بلکہ کھڑا بھی ہو گیا۔ ”اوہو۔۔۔ تو آپ رنگ والی کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

امملی بولا۔ ”خوب تم نے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تم چپ کرتا تو بی بی صاحبہ کچھ عرض کرتی تیں۔“

”اوہو ہو۔۔۔ میں شرمندہ ہوں جی۔ مجلس آئیں دفتر میں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے نوٹی اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا پھر اپنے باقت کو بھانڈ کر بولا۔ ”چل دوئے رفاقت! کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ چل بی بی ہواں کو کھٹا دفتر میں آ جاوے شائے خنرا۔“

کچھ ہی دیر بعد شانی، اممل اور سب اسٹیکر عاقل تھانے کے چھوٹے سے آفس میں بیٹھے تھے۔ عاقل کا قلم مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اس گاؤں سے رنگ والی کا فاصلہ چالیس پچاس میل سے کم نہیں تھا لیکن رنگ والی کی چھوٹی چوہداری کی حیثیت سے شانی کی شہرت یہاں موجود تھی۔ شانی نے کہا۔ ”عاقل صاحب! اممل آپ سے ان میاں بیوی کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں جنہیں آپ نے آج صبح سویرے پکڑا ہے۔“

”نہیں چھوٹی چوہداری! ہم نے صرف بندے کو پکڑا تھا۔ اس کے پاس سے چوری کی موٹر سائیکل برآمد ہوئی ہے۔ بعد میں اس کی صورت بھی یہاں آگئی۔ اس نے بہت شور مچایا اور دھمکیاں دیں۔ مجبوراً اسے بھی بند کرنا پڑا ہے۔“

”بندہ کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

عاقل نے اپنے باقت سے کہا۔ ”اوئے رفاقت علی! آ کر اس شریٹے کو یہاں اور جھٹڑی نہیں کھولی، خطرناک بندہ ہے۔“

ہنر کا کاشیل رفاقت علی ایک کاشیل کے ساتھ لاک آپ کی طرف چلا گیا۔ عاقل نے بغیر کچے والی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ موٹر سائیکل برآمد ہوئی ہے جی اس سے۔۔۔ اس کا پتہ نہیں اور کاغذات شائد اس سب متعلق ہیں۔ دو سینیٹے پہلے اس کی چوری کی رپٹ بھی درج ہوئی ہوگی۔“

اسی دوران میں دو کاشییل ایک دروازہ کھٹکھٹے ہوئے اندر لے آئے۔ اسے جھٹکری لگی ہوئی تھی اور چہرے پر تازہ چٹوں کے نشان تھے۔ رستم نے شانی کو بتایا تھا کہ اس کے بہنوئی اکرام کا ایک بازو دشمنی کی جھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اس نے مخالف پارٹی کی ایک بدتمیز عورت کو تھپڑ دیا تھا۔ بدلے میں اس کا ہاتھ ہی کاٹ ڈالا گیا تھا۔ شانی نے اندر آتے والے حوالاتی کے بازو دیکھے۔ اس کی گموں میں خون سنہا گیا۔ یہی رستم کا بہنوئی اور آپ زائدہ کا شوہر تھا۔ اس کا دوسرا بازو عمار دھما۔ وہ سینہ تلے کھڑا تھا اور ملتی ٹھکروں سے تھانیدار کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے خود پر بے پناہ ضبط کر رکھا ہے۔ اگر وہ اپنے اندرونی غضب کو آزاد کر دیتا تو شاید یہاں خون ریز ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

”اوائے نظریں نیچی کر“۔ تھانیدار عاقل گرجا۔

”میں نے کسی کی بہن کو اغوا نہیں کیا ہے۔“ حوالاتی بھی جواب میں دھاڑا۔

”اوائے تیری تو“۔ تھانیدار پھٹکارا اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

شانی دونوں کے درمیان آگئی۔ ”تمہیں عاقل صاحب! آپ حوصلے سے کام لیں۔“ وہ پوری طرح ڈٹ کر بولی۔

عاقل ذرا ڈھیلا پڑا تو شانی نے حوالاتی کو ڈانٹا۔ ”میں یہاں آپ لوگوں کی مدد کرنے آئی ہوں۔ آپ معاملے کو اور بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ذرا ہوش سے کام لیں۔“

صورت حال میں تھوڑی سی بہتری آئی تو شانی نے درخواست کر کے حوالاتی کو لاک آپ میں واپس بھجوادیا۔ اسے بچاؤ نے فیصلہ یقین ہو چکا تھا کہ یہی حوالاتی رستم کا بہنوئی ہے۔

”میں اس کی بیوی سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں ہے؟“

”تھانے کے چھوڑے ہے۔ لیڈر یا ہلکاروں کے پاس۔“ عاقل نے جواب دیا۔

شانی نے کہا۔ ”میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

تھانیدار عاقل نے پہلے تو بس دیکھ کر پھر اجازت دے دی۔ شانی اور اہل خانے کے چھوڑے سے واقع کو اور ٹھرا کر سڑوں میں پہنچے۔ ساتھ میں بیٹے کا کاشییل رفاقت بھی تھا۔ پھر رفاقت اور اہل خانہ کو باہر کھڑے رہے اور شانی ایک لیڈر کا کاشییل کے ساتھ کارروائی میں چلی گئی۔ یہاں موجود دوسری لیڈر کا کاشییل دیہاتی لباس میں لوہے کی چار پائی پر پھیل کر سوری تھی۔ اس دوسری کا کاشییل نے جانچنے کے بعد شانی کو فوراً پہچان لیا اور قدر سے مودب نظر آنے لگی۔

”حوالاتی کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”آؤ جی میرے ساتھ۔“ اس نے چابیوں کا گچھا پکڑا اور اپنے بھاری جسم کو ہلکودے دی جی شانی کے آگے آگے چل دی۔

اس نے بند کر کے دروازہ کھولا۔ سامنے چٹائی پر تین عورتیں بیٹی ہوئی تھیں۔ ایک بکھرے بالوں والی کوئی نفی عورت تھی۔ دوسری ایک تیس پینتیس سالہ بیٹھن دکھائی دیتی تھی۔ تیسری عورت پرشانی کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ پینتیس چھتیس سال کی ایک دروازہ قبول صورت خاتون تھی۔ شانی نے اس سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن ایک ہی لمحے میں وہ اسے پہچان گئی۔ یہی رستم کی بہن آپو زائدہ تھی۔ بہن کی شکل میں اپنے بھائی کی کئی مشابہتیں پائی جاتی تھیں۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ ہانگ کر جائے اور اپنی نند سے پٹ جائے۔ ان کے گلے سے لگ کر اتار دے کہ دل کا سارا بوجھ آ نکھوں کے راستے بہہ جائے لیکن دقت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنہالا اور دھیان سے آپو زائدہ کا جائزہ لینے لگی۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھیں۔ سر پر گرم اوڑھنی تھی۔ ان کی پیشانی پر بھی ایک نڈل پڑا ہوا تھا۔ غالباً گرفتاری کے وقت انہوں نے بھی مزاحمت کی تھی۔

شانی نے کاشییل سے کہا۔ ”میں ان سے اسکیے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

لیڈر کا کاشییل نے اثبات میں سر ہلایا اور باقی دونوں عورتوں کو یوں بانک کر باہر لے گئی جیسے وہ بھیج کر بلاں ہوں۔

شانی بے تکلفی سے چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار آپو زائدہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سینے میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو اس نے بڑی مشکل سے روک رکھا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو بہن؟“ آپو زائدہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ آپ کی صورت بہت جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ جیسے پہلے بھی آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

”نہیں۔“ آپو زائدہ نے ذرا ہٹکا کر کہا۔ شانی کو یاد آیا کہ رستم نے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپو زائدہ اور بھائی اکرام فرضی ناموں سے رہ رہے ہیں۔ شانی نے رستم سے بہت پوچھا تھا لیکن اس نے ان دونوں کا اتنا جانتا نہیں بتایا تھا۔ مگر آج..... اس صبح بہت شب میں ایک حیران کن اتفاق کے سبب آپو زائدہ اور بھائی اکرام دونوں شانی کے زورہو گئے۔

چند سیکنڈ بعد زائدہ نے شانی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم کون ہو۔۔۔ اور اتنی ملیسی سے

کیوں بول رہی ہو۔ یہاں تو جو بھی آتی ہے سواری کی طرح چلتی ہے۔ حرامزادیاں.....
وردی جان کر خود کو آسمانی شے سمجھنے لگی ہیں۔“

”میں آپ کی مدد کرنے کے لئے آئی ہوں۔ جو ہر باؤ کی طرف ہماری زمینیں ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ لوگ بات ماننے میں اب خود اہت احرام کرتے ہیں۔ خاص طور سے عورتوں کے مسئلے مسائل حل کر کے مجھے بہت اطمینان ہوتا ہے۔ مجھے شام کو بتا چلا تھا کہ تھاندار عاقل نے آپ کو اور آپ کے شوہر کو حالات میں ڈالا ہوا ہے۔ قانون کے مطابق کسی بھی عورت کو شام کے بعد عام تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ جسے ایسے بھیجا دیتا ہے یا پھر غیر مناجات پر مگر بھیجا ہوتا ہے۔ اگر آپ کے شوہر کو بھی کل تک بھجورینٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا تو اس کو یہاں رکھنا غیر قانونی ہوگا۔“

”تم دیکھ لو۔“

”نہیں جی! پر ان لوگوں سے غصے کے لئے تھوڑا بہت قانون تو معلوم ہونا چاہیے نا۔“

آپ زادہ کی آنکھوں میں نمی چمکی گئی۔ ”ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ہم جو جرخان کے قریب ”پہارو“ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ تھوڑی سی قیمتی باڑی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا عاقلی کے ابوا ایک تھوڑے سے معذور ہیں۔ مشکل سے بال بچوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ بچوں کو اسکول لے جانے اور لانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ ایسی موٹر سائیکل دھوڑ رہے تھے جو ایک تھوڑے سے مل سکے۔ ان کے ایک جاننے والے نے بتایا کہ یہاں مہرات میں ایک بندے کے پاس ایسی موٹر سائیکل ہے اور سستی مل رہی ہے۔ عاقلی کے ابو پر سوں سویرے یہاں آئے اور موٹر سائیکل کی بات کی۔ سو دا ہو گیا۔ آج صبح سویرے وہ موٹر سائیکل لے کر واپس گاؤں آ رہے تھے کہ یہاں ایک ناکے پر پولیس والوں نے انہیں روک لیا..... اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا۔ مجھے تو بچے ہی اطلاع ملی۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے بہن جو مشکل وقت میں ساتھ دے۔ میں کراں ماری ان کی ہی گوجرخان سے جس میں جیڑہ کر یہاں پہنچ گئی۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ پولیس والوں نے عاقلی کے ابو کو موٹر سائیکل سمیت تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ اب یہ عاقلی کے ابو سے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے اور بھی ساتھی ہیں اور تم گاڑیاں پیچھتے ہو۔“

آپ زادہ سسکنے لگی۔ ”اللہ کی بار ہو ان پر۔ ایک ایسے بندے پر جھوٹے الزام لگا رہے ہیں جو حق حلال کی روزی کے لئے سچ سے شام تک کھیت میں پانی کی طرح پینہ کرتا ہے۔“

انہوں نے عاقلی کے ابو سے مار پیٹ بھی کی ہے۔ عاقلی کے ابو کو کچھ اور تھاندار کی باتیں ان کر مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اسے نرا بھلا کہا تو اس نے مجھے بھی حوالات میں بند کر دیا۔ اب ہمارے بچے کچھ میں اکیلے ہماری اذیت میں سرور رہے ہوں گے۔ یہ لوگ خون بنے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ موتی سپاہی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ جان بھڑائی ہے تو کسی طرح میں چالیس ہزار روپے کا انتظام کر لو۔ بات عدالت میں چلی گئی تو لہا دھتا پڑے۔ ہائے گا۔ اب میں غرق غمی اتنے پیسے کہاں سے لاؤں۔ مشکل سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ میں نے تو اس موتی سے کہا تھا، یہ افادہ دی ہزار کی موٹر سائیکل رکھ لو اور ہماری جان چھوڑ دو۔ کہہ رہی تھی کہ اس موٹر سائیکل کو اب کسی گنتی میں نہ لاؤ۔ یہ تو پولیس کے قبضے میں آگئی ہے۔ چنڈا بچانا ہے تو نقد رقم کا بندہ دست کر دو۔“

شانی نے بڑی محبت سے اپنی انگلی بار بند کے کندھے پر ہاتھ بھیرا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں آیا جی۔ میں سب ٹھیک کر رہی ہوں۔ آپ نے ان لوگوں کو کچھ دیا تو نہیں ہے؟“
”دیا تو نہیں..... میرے سونے کے جھمکے انہوں نے اتر و اٹھائے ہیں۔ عاقلی کے ابو کی گھڑی اور پیسے وغیرہ بھی ان کے پاس ہیں۔“

”میں سب واپس لے لوں گی۔ آپ سے فکر ہیں۔“ شانی نے کہا۔

”جی ہاں۔ اب وہ بد شانی سب انسپیکر عاقلی سے مصروف گفتگو تھی۔ وہ پولیس والوں کے روایتی انداز میں شانی پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔“ بی بی جی! آپ کا کہنا سرائیکھوں پر سینک دہم نے بھی تو کسی کو جواب دیتا ہے اور پتی بات یہ ہے کہ مجھے تو وہ دنوں میاں بیوی کچھ منکڑوں سے لگ رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے کہ یہ جو اس عورت کا خاوند شریف محمد ہے یہ کسی اور معاملے میں بھی ملوث رہا ہے۔ اب کچھ داغ میں نہیں آ رہا..... پر کوئی پکڑ ہے ضرور۔“

شانی اندر سے گلاب کی گھرائی سے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ خود کو مستیال کر اس نے عاقلی کو عدالت کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ ”کیا پھر..... حاجی حیات صاحب سے ہی فون کرنا پڑے گا؟“

شانی کو یقین تھا کہ حاجی حیات کا نام سن کر عاقلی ذرا نرم پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ قدرے دھیلے لہجے میں بولا۔ ”یہ بات نہیں لی بی۔“ لیکن دیکھیں ناں ہم کو بھی تو پانا آپ بچانا ہوتا ہے۔ گاڑی چھیننے کی وارداتیں علاقے میں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ناک میں دم آیا ہوا ہے۔ اب یہ جو موٹر سائیکل ہے اس کا چابی نمبر پر حادی نہیں چارہا۔ انجین نمبر میں بھی گڑبڑ کی

کوشش کی گئی ہے۔ یہ مشکوک گڈی ہے۔

”لیکن شریف محمد تو کہتا ہے کہ اس نے دفتر سے ریکارڈ چیک کر دیا ہے۔ انہوں نے کبیر کیا ہے۔“

”انہوں نے تو رجسٹریشن سے کبیر کیا ہے ہاں۔ گاڑی سے تو کبیر نہیں کیا۔ مسئلہ گاڑی کے نمبروں کا ہے۔“

پندرہ میں صفت تک شانی اور گوندل میں بٹ ہوئی۔ شانی کو اندازہ ہو گیا کہ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ موٹر سائیکل کا چیسو نمبر ٹھیک ہے پڑھنا نہیں چاہا تھا۔ اس کو بتایا بنا کر عاقل نے مسئلہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ شانی نے بی بی فراسا سے عاقل گوندل کو باور کرا دیا کہ اس معاملے سے اسے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ اگر بات حاتی حیات تک پہنچ گئی تو اتلا سے مصیبت پڑ سکتی ہے۔ عاقل گوندل ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آچہ زادہ اور اکرام کو شانی کی شخصی ضمانت پر دہاکر لے کر تیار ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سونے کے جھمکوں کے سلسلے میں آنکھ کی کوشش کی اور شانی کو بتایا کہ جیسے حوالہ دے کر دراز میں رکھے تھے۔ وہ چھٹی کے بعد چابی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ سامان ابھی تھانے میں رہ گیا تو پھر دستیاب نہیں ہوگا اور وہ ابھی تو لمبی چوڑی کوٹنی کے بعد ہوگا۔ اس نے اصرار کیا تو دراز کی چابی بھی تھانے کے اندر سے ہی مل گئی۔

شانی بااحتیاط نظر آری تھی مگر اندر سے کاپ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس والے آچہ زادہ اور بھائی اکرام کی اصلیت سے آگاہ نہیں۔ اگر آگاہ ہو جائیں تو کچھ بھی وال سے گجرات تک اور گجرات سے لاہور تک تھمک بچ جائے۔ یہ کام چھٹی جلدی نٹ جاتا تا جی بہتر تھا۔ آچہ زادہ و رسم کی بہن تھی اور رسم کی بہن اور بہنوں کے لئے ڈینی ریاض جیسے خرباک آفیسر کی برس سے خون آٹاشی کرتے پھر رہے تھے۔ مین ٹھکانا کسی موقع پر کہیں نہ کہیں عاقل گوندل کی نظروں سے بھی اور رسم کے بہنوں کی اکرام کی تصویر وغیرہ گزری ہو۔

قریباً آدھ بجنے بعد جب تھانے میں وال لاک کی سویاں رات کے ایک بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ شانی، اکرام اور آچہ زادہ کو لے کر گاڑی وال سے روانہ ہو رہی تھی۔ عاقل گوندل کا شکر یہ ادا کر کے وہ لوگ ٹوپی کا کار میں آ بیٹھے۔ شانی نے دیکھا کہ بھائی اکرام اور آچہ زادہ دونوں حیران نظر آ رہے تھے۔ خاص طور سے بھائی اکرام حیران تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ صرف ٹھیک ہو جائے گا بلکہ وہ تھانے کی چار دیواری سے بھی چھوٹ جائیں گے۔ بھائی اکرام کی نگاہوں میں شانی کو ہلکا سا اضطراب بھی

نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ شانی اور اجمل وغیرہ کی طرف سے ابھی تک پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ انہیں جاننا ہو رہا ہے یہ خدشہ لاحق ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ پولیس سے چھوٹ کر کچھ اور لوگوں کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔ شانی نے محسوس کیا کہ ایک عورت دوسری عورت کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ رہی ہے۔ یعنی آچہ زادہ موجودہ صورت حال سے مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

”اب ہم کہاں جائیں گے؟“ آچہ زادہ نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”آپا بی امی تو یہ خواہش ہوئی کہ آپ پہلے میرے ساتھ چلیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کے بیٹے آپ کے لئے پریشان ہوں گے۔ اس لئے آپ کی میزبانی کی خواہش پھر بھی پوری کر لوں گی۔ فی الوقت ہم آپ کو آپ کے گاؤں لے جا رہے ہیں۔“

اکرام نے کہا۔ ”بہتر تو یہ تھا کہ آپ ہمیں کچی مرکز پر پہنچا دیتے وہاں سے ہم بس کے ذریعے چلے جاتے۔“

”نہیں یہ ٹھیک نہیں بھائی صاحب۔“ شانی نے کہا۔ ”رات کے اس پہر آپ کے لئے پھر کوئی مصیبت بن سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی موٹر سائیکل بھی آپ کے گاؤں پہنچانی ہے۔“

”موٹر سائیکل کیسے جائے گی؟“ اکرام نے پوچھا۔

”میرا ڈرائیور اسے کار کے پیچھے پیچھے چلا کر لے جائے گا۔ پٹرول وغیرہ ہے ناں اس میں؟“

اکرام نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک ابھمن میں نظر آتا تھا۔ اجمل خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عباس موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ شانی، زادہ و بھائی نشست پر اور ڈوٹا اجمل خان کے ساتھ پر ارجحان ہو گیا۔

کار تھانے سے باہر نکل تو شانی نے سکھ کا سانس لیا۔ ”آپ نے کسی طرح کی گھر نہیں کرتی۔“ شانی نے انہیں پھر ٹھیک دی۔ ”کوئی پولیس والا آپ کے پاس نہیں آئے گا اگر آیا تو بھی آپ نے اسے ایک ٹیڈی پیس نہیں دینا اور نہ کوئی رعب برداشت کرتا ہے۔ میں آپ کو ایک فون نمبر دے دوں گی۔ کوئی بات ہوئی تو مجھے اس پر اطلاع کریں۔“

”تم تو ہمارے لئے رخصت کا فریضہ بن کر آئی ہو۔“ آچہ زادہ نے گھوگھیرا آواز میں کہا۔ ”دوڑا کیسے رات میں کون کسی کے لئے لکھا ہے اور بھاگ دوڑ کرتا ہے۔“

”لیکن آپ کو ہمارے بارے میں اطلاع کس نے دی؟“ اکرام نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی اس بات کا کوئی جواب دیتی ایک موٹر سائیکل کی روشنی دکھائی

دی۔ یہ موٹر سائیکل مخالف سمت سے گاؤں کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ موٹر سائیکل میں کار کے سامنے آن کر رک گئی۔ موٹر سائیکل کی پہلی ہوئی آواز سے ہی پتا چل گیا کہ اس پر کون سوار ہے۔ یہ نیچے لوگلی ہوئی موٹھوں والا وہی حوالدار تھا جس سے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے اجمل خان نے تھانے کا راستہ پوچھا تھا۔ اب یہ حوالدار گاڑی کے سامنے ٹھہرا تھا۔ ہیڈ لائٹس میں اس کے چہرے پر بیانیہ کیفیت دکھائی دیتی تھی۔

”خو، کیا بات ہے حوالدار صیب؟“ اجمل نے گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

حوالدار نے شک مجھ سے انداز میں موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی اور کار کے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”تساں دے ساتھ کون ہے جی؟“

”کیوں، کیا بات ہے؟“ اجمل نے زور سے لہجے میں دریافت کیا۔

اسی دوران میں موٹھوں والے حوالدار کی نگاہ گاڑی کے اندر بیٹھے اکرام پر پڑ گئی۔ اکرام کو پہچانتے ہی حوالدار کے چہرے پر ڈر لے کے آواز نظر آنے لگے۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔ ”تساں اس حوالاتی کو کھٹے لے کے جا رہے ہو؟“

”یہ اب حوالاتی نہیں ہے۔ یہ امار سے ساتھ جا رہا ہے۔ تم اپنا یہ پھٹ پھٹی سامنے سے ہٹاؤ۔“ اجمل نے پھینکا کر کہا۔

اچانک حوالدار نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ کا پستول باہر نکال لیا۔ وہ بے حد دلیری سے بولا۔ ”خبردار۔“ باہر نکلو۔ ورنہ گوئی چلا دوں گا۔“

”بات کیا ہے حوالدار؟“ شانی نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر پوچھا۔

”بات بھی ساری سمجھا دیتا ہوں۔ یہ حوالاتی اتنی آسانی سے نہیں چھوٹ سکتا۔ میں نے پہچان لیا ہے اسے۔ اور اس کی بیوی کو۔“ حوالدار کی آواز ہڈ بات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

شانیا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا اندر بیٹھا۔ قتل کی صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ کار اب تھانے سے کافی دور آ چکی تھی۔ قریباً تین فرلانگ کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ شانی نے گاڑی کے اندر اجمل کے کان میں سرگوشی کی۔ ”اجمل! اسے پکڑ لو۔“

ان چار الفاظ نے اجمل پر وہی کام کیا جو بارود کے ڈھیر پر چنگیاں کرتی ہیں۔ وہ جیسے پہلے ہی پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہٹا دیاں ہاتھ حوالدار کے دیکھی ساخت کے پستول پر ڈالا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے حوالدار کو آہنی زور سے اپنی

طرف کھینچا کہ حوالدار کا سر دھماکے سے گاڑی کی کھڑکی سے نکل گیا۔

حوالدار کی اگلی پستول کے ٹرا پیچر پر دب گئی۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگھا لیکن کوئی زمین میں گئی۔ دوسرے فائر سے پہلے ہی اجمل نے پستول حوالدار کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے سر کی زوردار نگر حوالدار کی پیشانی پر ماری۔ حاضر سروں حوالدار ”ساقبت“ حوالدار کی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا اور پستول کے ہٹ اپنی کھٹارا موٹر سائیکل پر گر آ۔ دونوں اوپر نیچے دھڑکے ہوئے۔ موٹر سائیکل نیچے حوالدار اور پستول۔

”اسے گاڑی میں لے آؤ۔“ شانی تیزی سے بولی۔

اجمل خان نے ہدایت پر عمل کیا اور شیم ہے ہوش حوالدار کو کھیت کر گاڑی کی پیچیل نشست پر لے آیا۔

”اس کی موٹر سائیکل کا کیا کرنا ہے؟“ ڈولے نے پوچھا۔

”موٹر سائیکل کو آگے لے جا کر کھیت میں چھپا دو۔“ شانی نے کہا۔

”ساتھ ہی نالہ ہے۔ اس میں کیوں نہ پیچیک دیں۔“ ڈولا بولا۔

”کہاں ہے نالہ؟“ اجمل نے دریافت کیا۔

”یہاں کہیں پاس ہی ہے ہم۔۔۔۔۔ مجھے پانی کی آواز آ رہی ہے۔“ ڈولے نے جواب دیا۔

ڈولے کی حیات سے انکار کرنا مشکل تھا۔ اجمل نے کہا۔ ”تو چلو پھر نکلو باہر اور پچینگو اس پھٹ پھٹی کو تالے میں۔“

ڈولا جلدی سے باہر نکل آیا اور حوالدار کی گری ہوئی موٹر سائیکل کو سیدھا کر لیا۔ مونتے سے نشانات ملنے کا اندریشہ ہی تھا کیونکہ راستہ ایٹوں سے پتتہ کیا گیا تھا۔ شانی آگلی سیٹ پر بیٹھ آیا۔ اکرام نے کسمسا تے ہوئے حوالدار کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کام میں زاہد نے بھی اس کی مدد کی۔ کار کے شیشے بند تھے اس لئے حوالدار کی کھٹی کھٹی آوازیں بس گاڑی کے اندر ہی گونج رہی تھیں۔

گاڑی چل پڑی۔ حوالدار کی کھٹارہ موٹر سائیکل کو ڈولا دھکیلتا ہوا اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ قریباً نصف فرلانگ آگے کھیتوں کے درمیان واقع ایک ”سوا“ (چھوٹی نہر) موجود تھا۔ ڈولے نے حوالدار کی موٹر سائیکل دھکیل کر اس کے اندر پیچیک دی۔ اور ہاتھ جھامٹا ہوا واپس کار میں آ بیٹھا۔ کار ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ تاہم اب اس کی رفتار پہلے سے بہت تیز تھی۔ اجمل خان جانتا تھا کہ حوالدار کے ہاتھ سے چلنے والی کوئی کی آواز دور دور تک گئی

ہوگی۔ میں ممکن تھا کہ کچھ لوگ اس آواز سے چونک گئے ہوں۔

مضطرب حوالدار پشت کے بل جھکی نشست پر بڑا تھا۔ اسے بے حرکت رکھنے کے لئے اکرام نے اپنی دائیں ران اس کے سینے پر رکھی ہوئی تھی۔ حوالدار کی نیچے کوٹلی ہوئی سوجھیں کچھ اور بھی لٹک گئی تھیں۔ وہ کراہ رہا تھا اور دمکیاں دے رہا تھا۔ "مینڈی بات یاد رکھو۔ تھانوی کی طرح چھسو گے۔ اب بھی وقت ہے بجھے چھوڑ دو۔ یہ بڑا سیریس کیس ہے۔"

ابھل خوش دلی سے بولا۔ "خو، وہ کبھی سیریس کیس پسند ہے۔ چھوٹے موٹے کیس سے امارا راجھا راضی نہیں ہوتا ہے۔"

"تم ایک حاضر ذہنی پولیس والے کو غور کرنے کا جرم کر رہے ہو۔" اس نے دمکی آئینے کے میں اطلاع دی۔

"مکرام پوچھتا ہے کہ یہ پولیس والا افواہوں کے لئے مکر سے واپس کیوں آگیا۔ ابھی تو ہی دیر پہلے تم چھٹی کر کے گھر گیا تھا۔"

"شاید اس کو بد قسمتی کہتے ہیں۔" ڈولا بولا۔

"نہیں۔۔۔ ام سمجھ گیا ہے۔ سارا کام اس کی ابھی یادداشت کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ اس کو خواہ مخواہ ایسی باتیں یاد آگیا جو اس کو نہیں آتے چاہے تھا۔ ابھی تم نے سنا تو ہے کہ یہ کیا کب رہا ہے۔ اس نے شاید بھائی شریف محمد (اکرام) کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی اٹلے سید سے ہوس کیس میں ان کو پہلے بھی پکڑا گیا ہو۔ جیسے ہانس لوگوں کے پیچھے تو پولیس ہاتھ دھو کر پڑ جاتا ہے۔"

اکرام خاموش رہا۔ شانی اور زبیدہ بھی خاموش رہیں۔ شانی کے سوا ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اکرام اور زبیدہ اصل میں کون ہیں۔

حوالدار نے ایک دم زور مارا اور اکرام کے اٹکو تے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کی۔ اکرام کی گرفت معمولی نہیں تھی۔ وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ شانی کو رستم نے بتایا تھا کہ جوانی میں اکرام ڈھائی من کی بوری بہ آسانی سر سے اوپر اٹھا لیتا تھا اور خالی ہاتھ تین تین بندوں کی

ٹھکانی کر لیتا تھا۔۔۔ اب بھی وہ ایک دو بندوں سے زیر ہونے والا نہیں تھا۔ حوالدار نے جو بھی اٹھ کر اپنا ہاتھ دروازے کے چینل کی طرف بڑھانے کی کوشش کی اکرام نے اسے واپس پیچھا

اور ایک زنانے کا چھڑا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ "خبردار اسکا تو ڈوڈوں گا۔" اکرام پھٹکارا۔

"ہائے۔۔۔ اوٹے میں سر گیا۔" حوالدار نے خون تھوکتے ہوئے دہائی دی۔

"خو اور یادام کھاؤ۔۔۔ اپنا یادداشت اور تیز کرو۔" ابھل خان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مصیبت زدہ حوالدار کو مشورہ دیا۔ "ایک تو یادام کھاتے ہو اور پرے رشوت کا یادام۔

ایسے یاداموں سے جو یادداشت ہے گا وہ جھپٹیں ایسے ہی ذلیل و خوار پرمانے گا۔"

"دیکھو۔ مینڈی گل سنو۔" حوالدار نے اپنا لہجہ بدلا۔ "یہ تھان کے لئے بہت دلی مصیبت کھڑی ہوگی۔ تم جھکو چھوڑ دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہاری۔ تمہاری کوئی رپورٹ نہیں کروں گا۔"

"ام سب جانتا ہے سوجھل صیب! تم لوگ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں بھول گاؤں کا سب کچھ۔"

"خو، تم نے جتنا یادام اخروٹ وغیرہ کھایا ہے اس کے بعد تمہارے لئے کوئی بات بھولنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ام تمہاری یادداشت کمزور کرنے کا انتظام کرے گا۔ جھپٹیں توڑا توڑا

نسوار کھائے گا۔ ایک دم کرک، مسالے دار نسوار۔ اور حوالدار صیب! نسوار میں جوستی ہوتا ہے اس سے بندہ بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ ایک مرتبہ تو امارا بڑا برادر سانگیل چلا تے

ہوئے یہ بھول گیا کہ وہ سانگیل چلا رہا ہے۔ اسے لگ کر وہ کسی اور کے پیچھے سانگیل پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ سو گیا۔ بعد میں اسے اتھے پر چودہ ٹانگے لگے تھا۔ تم بھی بالکل بے فکر ہو۔ ام تم کو

اصلی ہاٹ والا نسوار کھائے گا۔ اسے شام اللہ چند دن میں ہی تمہارا یادداشت نابل ہونے لگے گا۔ اس کے بعد تم چھوڑے جانے کے لئے پٹ (فٹ) ہو جائے گا۔"

"ابھل، ڈرائیونگ کی طرف دھیان رکھو۔ شانی نے اسے ڈانٹا۔ "یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ اور اب ہل پر سے بائیں طرف نہیں مڑنا، ورنہ میں طرف لٹکتا ہے۔ ورنہ بڑا باد

کی طرف۔"

اکرام نے کہا۔ "کیا اب ہم گور خان نہیں جا رہے؟"

"نہیں بھائی صاحب! اب یہ بہت خطرناک ہو گا۔ جس طرح اس حوالدار کی یادداشت کام کرتی ہے، کیا پتا تھا نے میں بھی کسی کی کر جائے۔ آپ کے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"بچوں کا کیا ہوگا؟" زبیدہ کرائی۔

"آپ بے فکر ہو جائیں آپ!۔۔۔ میں سنیاں لیتی ہوں سب کچھ۔ آپ مجھے گاؤں اور

گھر کا مکمل ایڈریس بتائیں۔" حوالدار کا داؤد غلا روکنے کے لئے ڈولے اس کے منہ میں

کپڑا اٹھوڑ دیا تھا۔ دوسری طرف توڑی سی چٹکیاٹھ کے بعد اکرام نے مکمل ایڈریس بتا دیا۔

”وہاں فون ہے کسی کے پاس؟“ شانی نے پوچھا۔
 ”نہیں فون تو نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ بچوں کو وہاں سے لانا چاہتی ہیں۔ تو پھر۔۔۔ میں آپ کو ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ یہ زاہد نام کا کریمانہ فروش ہے۔ میرا بھائی بنا ہوا ہے۔ امید ہے کہ وہ میرا رقعہ دیکھ کر بچوں کو آپ کے حوالے کر دے گا۔ پھر بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“
 ”وہاں موہاں کام کرتا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔
 ”نہیں جی۔ لیکن جو گر خان سے صرف سات آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام کر جائے۔“

”ٹھیک ہے بھائی صاحب! آپ رقعہ بھی لکھ دیں۔ میں ایسے بندے کو وہاں بھیجتی ہوں جس کے پاس موہاں بھی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کریمانہ فروش زاہد سے آپ کی فون پر بھی بات ہو جائے۔“
 ”ٹھیک ہے میری بہن! آجیسی تم مناسب سمجھو۔“ زاہد نے کہا۔ وہ بہت دہشت زدہ نظر آتی تھی۔ اس کی دہشت کی وجہ شانی سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ رستم سیال کی بہن تھی اور اس موہل حوالدار نے اسے اس حیثیت سے پہچان لیا تھا۔

حوالدار کی گردن ایک بار پھر اکرام کی ران کے نیچے چھٹی۔ اس کے منہ میں کپڑا مضبوط تھا۔ پھر بھی وہ مسلسل منہ سے خون غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کا اچھی طرح باندھا جانا ضروری تھا۔ شانی نے براؤں روڈ پر ایک منہاں جگہ درختوں کے نیچے کارروا دی۔ ڈرائیور مہاس نے بھی کار کے پیچھے موٹر سائیکل روک دی۔ اس نے شانی کو بتایا کہ کار کی ڈی میں رسا موجود ہے۔ شانی نے اسے دایت کی کہ وہ حوالدار کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دے۔

اجمل اور شانی گاڑی سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ اجمل کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ یہ بات تو وہ بہر حال جان گیا تھا کہ یہ میاں بی بی بہت اہم افراد ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے شانی بڑے سے بڑا رسک لینے کو تیار ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ ابھی کچھ دیر پہلے اس حوالدار پر حملہ کرنے کے لئے نہکتی۔ اب نہ صرف باوری حوالدار پر حملہ ہوا تھا بلکہ وہ انوا بھی ہو چکا تھا۔

شانے نے کہا۔ ”اجمل! اجانتے ہو یہ میاں بی بی کون ہیں؟“
 ”نہیں۔ لیکن اتنا اہم ضرور جان گیا ہے کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہے۔“

شانے نے نظر اٹھائے ہوئے لکچ میں کہا۔ ”یہ رستم کی سگی بہن اور بہنوئی ہیں۔“
 اجمل کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ اس نے ٹھیک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ شانی نے اسے حسیہ کی۔ ”نہیں! اجمل! ایسے مت دیکھو۔ وہ پریشان ہوں گے۔ انہوں نے ابھی ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ یہ بات حویلی میں جانے کے بعد سیکھ تو بہتر ہے۔“
 اجمل کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ دبا ہوا جوش بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ رستم کا دلوانہ تھا۔ رستم سے متعلق کوئی بھی شے اسے دل و جان سے عزیز تھی اور یہ تو جیتے جاگتے لوگ تھے۔ رستم کی ہمشیرہ اور اس کا شوہر۔ وہ ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو آمادہ ہو سکتا تھا۔

”اوہ خدایا! اب امار کی کچھ میں آیا کہ یہ موہل حوالدار اتنا داویلا کیوں کر رہا تھا۔ اس نے رستم صیب کی ہمشیرہ اور بہنوئی کو پہچان لیا ہے۔ ام کو پتا ہے کہ پولیس کا پی مرے سے ان میاں بی بی کو شوہر شہزاد گاؤں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اوہ خدایا! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کہ ام لوگ وقت پر پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت مدد پر لایا امارا۔ اور۔۔۔ آپ نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ان دونوں کے بارے میں آپ کو اطلاع کس نے دیا۔ امارا مطلب ہے کہ وہ رقعہ کس کا تھا؟“

”تھادہ بھی کوئی۔“ شانی نے رقت آمیز لکچ میں کہا۔ ”بھئی بتاؤں گی تمہیں اس بارے میں۔“
 اجمل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ”شانے! بہن! امار تو خیال ہے کہ اس موہل حوالدار کا مشکل آسان کر دیا جائے۔ ام اس کو کہاں چھپاتا پھرے گا۔ ام اس کو وہاں کھیت میں لے جا کر خنڈا کر دیتا ہے یا پھر مرا تے میں نہر کے اندر پھینک دے گا۔“

”نہیں! اجمل! اس کا کتاہ اتنا بڑا نہیں کہ موت کی سزا دی جائے۔ اس کو اپنے پاس رکھنا پڑے گا۔۔۔ پوری حفاظت کے ساتھ۔“

”تو ٹھیک ہے۔ اس کا انتظام ام کرے گا۔ آپ اس بیماری کو حویلی میں لے کر نہیں جائے گا۔“

شانے نے چند لمحوں سوچا۔ ”لیکن اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو۔۔۔“
 ”نہیں! شانے! بہن! جب آپ سے وعدہ کر لیا تو پھر کر لیا۔ آپ رستم صیب کی ہمشیرہ اور بہنوئی کو پوری عزت کے ساتھ رنگ والی کی حویلی میں لے جائیں۔ ام اس مردود کا بندوبست پیر محمد کے ساتھ مل کر کرتا ہے۔ اور اگر رستم صیب کی ہمشیرہ کے بچوں کو گور خان سے حویلی

میں پہنچاتا ہے تو اس کے لئے بھی حاضر ہے۔ آپ ام کو ایڈریس وغیرہ.....
 ”نہیں نہیں۔“ شانی نے اس کی بات کاٹی۔ ”اس کے لئے میں عارف کو فون کر رہی ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ تم جس عہدے سے مل کر حوالدار کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ لو..... اور منہ پر کچرا بھی لٹیک سے کس دو۔ یہ آواز نہ نکال سکے۔“

”آپ بے فکر رہو جی۔ یہ تو منہ کھٹنے کے بعد بھی آواز نہیں نکال سکے گا۔“

شانہ نے اپنے موہاں پر عارف کیسہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہی..... عارف اپنے کسی کام سے گوجرانوالہ میں ہی موجود تھا۔ شانی نے اسے مختصر الفاظ میں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ رستم کی بہن اور بیٹوں کی بارے میں جان کر عارف بھی ششدر رہ گیا۔ اس نے کانچنی آواز میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ..... یہ وہی دونوں ہیں؟“

”ہاں، میں نے انہیں پہچان لیا ہے عارف..... اور تھانے سے چھڑا کر بھی لائی ہوں۔ اب ایک کام تم سے کرنا ہے۔“

”ہاں ہاں، بتائیں۔“ عارف نے کہا۔ رات کے اس پہر بھی اس کی آواز ایک دم چوکس ہو گئی تھی۔

”رستم کا ایک نوٹس سالہ بھانجا سہرا در چھ سات سال کی بھانجی عاشری ہے۔ وہ دونوں اس وقت گوجرانوالہ کے قریب پہاروہم کے ایک گاؤں میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ پولیس کو کسی طرح کا شک بڑے تم ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے آؤ اور رنگ والی پہنچا دو۔“

”آپ مجھے ملے اتنا پتہ دیں۔ میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔ وہاں مجھے ملنا کس سے ہوگا؟“

”میں جنہیں ساری تفصیل بتا دیتی ہوں اور اس شخص کے نام رقدہ بھی دیتی ہوں جو دونوں بچوں کو تہار سے حوالے کرے گا۔ تم فوراً وزیر آباد کی طرف آ جاؤ۔ میں وزیر آباد اور گجرات کے درمیان راج روڈ پر ہوں۔ ہم نو یونہ 86 بیٹھے ہیں۔ آخوین میں سے آ گے۔ وزیر آباد پہنچ کر تم دو بارہ رابطہ کرو۔“

”میں بس ایک گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔“ عارف نے کہا۔ رستم کے دو نہایت قریبی عزیزوں کا سن کر عارف کے جسم میں جیسے چارہ بھر گیا تھا۔

☆ ===== ☆

رات ڈھانکے سے لگ بھگ شانی نے عارف اور اس کے ایک دوست ڈکی کو گوجر

نات کی طرف روانہ کیا۔ خود وہ اچھل اور ڈولے کے ساتھ رنگ والی کی سمت روانہ ہو گئی۔ بندھے ہوئے حوالدار کے علاوہ اکرام اور زاہدہ بھی شانی کے ہمراہ تھے۔ ڈرائیور عباس۔ وزیر سائیکل پر پیچھے آ رہا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے کے قریب بہ چھانت رنگ والی پہنچ گئے۔ انہی منہ اندر آ رہا تھا۔ کھیت کھلیاں..... گھر اور ڈیرے سب کچھ کھراڑو جاتی کی میں چھپا ہوا تھا۔ حویلی میں شانی کی پھولی کے علاوہ کسی کو مل نہیں تھا کہ وہ حویلی سے باہر رہی ہے۔ نو یونہ کار سیدھی ایک اندر والی احاطے میں پہنچائی گئی۔ یہاں دو دوسری گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اچھل خان نے بندھے ہوئے حوالدار کو ایک بندہ بیپ میں منتقل کر لیا اور اسے لے کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔ شانی اپنے مہمانوں کے ساتھ حویلی کے اندر والی حصے میں پہنچی۔ شانی کو حویلی میں کسی تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ پہرے دار وغیرہ تو پہلے بھی چوکس ہوتے تھے لیکن آج کچھ زیادہ چوکس نظر آ رہے تھے۔ ان کی تعداد بھی شانی کو معمول سے زیادہ محسوس ہوئی۔ اصل میں قدرت اللہ کے جو شیپے اور جون زور مریدوں کی طرف سے حویلی کی سکیورٹی کو عموماً خطرہ رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی خاص اطلاع کی وجہ سے سکیورٹی سخت کر دی جاتی تھی۔ شانی نے سمجھا شاید آج رات کے لئے بھی کوئی ایسی اطلاع تھی۔

وہ آج زاہدہ اور اکرام کو شست گاؤں میں بٹھا کر اوپر پہنچی تو پھولی آتہ کو جانتے ہوئے پایا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر شانی کا ہاتھ چوما۔

”کیا بات ہے پھولی۔“ آپ سب پریشان لگ رہے ہیں؟“

”بس تیری وجہ سے ہی پریشان تھے۔ مگر بے ڈخیریت سے آگئی ہے۔“

”یہاں کوئی کڑ بوٹو نہیں ہوئی؟“

اس سے پہلے کہ پھولی آتہ جواب میں کچھ کہتی چوہدری بار نظر آیا۔ شانی کے ساتھ اس کی سلام دعا ہوئی۔ چوہدری اشیر کا یہ سن کر اب بہت حد تک بدل چکا تھا۔ اس نے پھولی کو بیٹنی ڈاڑھی رکھ لی تھی اور نیکی کے کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ بیٹنی میں ایک دو بارہ رنگ والی کی حویلی کا پتہ بھی لگ گیا تھا۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ”بابا! کیا بات ہے۔ کیا میرے بعد یہاں کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”نہیں۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔“ بار نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”قدرت اللہ کا ایک حرامی چیلہ پکڑا گیا ہے حویلی کے باہر سے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔“

پھولی آتہ نے گلوکیز آواز میں کہا۔ ”یہ ساری تیرے اس بھائی بابا کی ممبرانی ہے۔ نہیں تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ بابا اس صبیحت کی نو میں کل شام یہاں پہنچا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ پکڑا

بھی گیا ہے۔ اتنا بے تحاشہ تھا کہ اس کے پاس ہے۔ ڈاکٹر بہرہ روز کو شک ہے کہ بھڑ پر نہ ہر بھی کا ہوا ہے۔ جب وہ بکڑا گیا تو اس نے بہت دوا دلا دیا۔ گالیاں نہیں بھرے لگے اور چٹا نہیں کیا کچھ کہا۔

”اس نے مانا ہے کہ وہ قدرت اللہ کا ساتھی ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا۔ وہ تو لگا کرے مار رہا تھا۔ میں حضرت صاحب کا دیوانہ ہوں۔ میں..... چھوٹی آنند کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ شاید یہ بات ان کے دماغ میں آگئی تھی کہ انہیں چیلے کی دھمکیاں شانی کے سامنے نہیں دہرائی جائیں۔

بابر نے شانی کو ایک طرف لے جا کر ساری صورت حال سمجھائی۔ بابری باتوں سے معلوم ہوا کہ کل سہ پہر شانی کے یہاں سے جانے کے فوراً بعد بابر یہاں آ گیا تھا۔ اس کے ایک خبر نے اسے اطلاع دی تھی کہ قدرت اللہ کا ایک دیوانہ جس کا نام رمضان ہے، خطرناک ارادے سے لی بی کی تلاش میں ہے۔ قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف کی موت کا بدلہ لینے کے لئے وہ رنگ والی کی حویلی میں ٹھکانا چاہتا ہے۔ اس کا اصل نام گیت لی بی ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد بابر اپنی چھاپہ پر سوار رنگ والی آ گیا تھا۔ اس نے سکریٹر کو وارنٹ کروا دیا تھا۔ اسی دوران میں چٹا چلا کر ایک بھگدڑ مکا سویرے سے حویلی کی دیوار سے لگ کر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بنا راور آنکھوں سے معذور ہے۔ جب اس بھگدڑ کو بچک کیا گیا تو وہ منگولک لگا۔ جب پھر سے داروں نے اس کی تلاش لینے کی کوشش کی تو اس نے اپنے ایک خبرنگار لیا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر سے داروں نے اسے گھیر کر اس پر کبل ڈال کر اسے بکڑا۔ اس کوشش میں ایک پھر سے دار معمولی زخمی بھی ہوا۔ خبرنگار نے اسے بعد اس شخص کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے اور بعد میں پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ رنگ والی کے قہانے میں بند ہے۔ اس واقعے کے بعد حویلی کی سکریٹر سخت کردی گئی تھی اور رور کردی اچھی طرح تلاش بھی کی تھی۔

بابر نے کہا۔ ”مجھے چھوٹی آنند سے بہت دیر سے بتایا کہ آپ حویلی میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد مجھے دوسری طرح کی پریشانی لگی۔ آپ کسی کو بتا کر بھی نہیں گئی تھیں کہ کہاں گئی ہیں اور اس لئے۔ بس اتنا چٹا چلا کر اصل خان آیا تھا اور وہ آپ کو لے گیا۔“

”بس ایک ضروری کام تھا، میں بعد میں بتاؤں گی۔“ شانی نے کہا۔

”یہ عورت اور مرد آپ کے ساتھ ہی آئے ہیں؟“

”ہاں۔“ شانی نے مختصر جواب دیا۔

بابر کچھ گیا کہ وہ ابھی اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے،

آپ آرام کریں۔ میں تو صبح بارہ بجے واپس چلا جاؤں گا مگر آپ اگلے تین چار دن تک زیادہ احتیاط کریں۔ حویلی سے باہر بالکل ناشائستہ۔“

”نہیں بابر! اب تو کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے۔ بہر حال تم بھی اب آرام کرو۔ جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا۔“

بابر، جی اچھا کہتا ہوا واپس چلا گیا۔ شانی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ سرتاپا بدل گیا تھا۔ کون کبھی لگتا تھا کہ یہ تار پور کا وہی اکھڑ چوہدری زادہ ہے جو چھاتی چوڑی کر کے زمین کو پاؤں سے روندتا ہوا چٹا تھا اور جس نے ایک آبرو خوردہ میاں دھیمان درشتوں کے اندر شانی کے لئے درندے کا روپ دھار لیا تھا۔

بدل سے رنگ آ جاں کیسے کیسے۔ شانی نے سوچا اور گہری سانس لیتی ہوئی نشست گاہ کی طرف چلی گئی۔ آپو زادہ اور اکرام اپنے بچوں کے لئے از حد پریشان تھے۔ شانی نے انہیں ہر طرح تسلی دی اور ان کے پاس طبیعی باتیں کرتی رہی۔ انہیں چاہے وہ غیرہ چلانے کے بعد شانی نے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

آپو زادہ نے کہا۔ ”بھن، تم ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہو۔ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ ہماری وجہ سے تم کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ۔ میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

شرانی جانتی تھی کہ وہ کیا بتانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس سے پہلے کہ بکڑا جانے والا حوالہ داریاں بات کھول دے، وہ خود ہی شرانی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کر دیں۔ اسے بتا دینا کہ وہ اشتہاری رحم سیال کی بہن ہیں۔ اور پولیس ان کی تلاش میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

شرانی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپا! آپ ابھی آرام کریں۔ اپنے دل و دماغ پر کسی طرح کا بوجھ نہ لائیں۔ آپ جو بھی کہیں گے میں سن لوں گی۔ اور آپ یقین رکھیں، میرے روئے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میں نے اپنا ہاتھ آپ دونوں کی مدد کے لئے بڑھایا ہے، اب کسی بھی وجہ سے یہ ہاتھ کھینچوں گی نہیں۔“

آپو زادہ کو بولنے کا موقع دینے بغیر وہ نشست گاہ سے باہر آ گئی۔ فی الوقت اسے سب سے زیادہ انتظار دونوں بچوں کی یہ خبریت دستیاب کا تھا۔ اس نے موہاں پر عارف سے رابطہ کرنے کی دو تین خوشیں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بسز پر مٹا کسی معصوم فرشتے کی طرح خبر سرور ہا تھا۔ شانی نے اس کی پیشانی سے ہال بنا کر اس کے

ریشارہ پر ممتا بھرا ہوس دیا۔ وہ سوراہا تھا مگر اس کا چہرہ ہاتھ کا تھا کہ وہ شانی کا ارتقا کر کے کرتے سویا ہے اور شاید سونے سے پہلے وہ چار آنسو بھی بہائے ہیں۔ شانی نے ایک بار پھر اسے چہرہ وہ ڈرا ہرے لئے کمرید می کرتا چاہتی تھی۔ وہ ابھی تک پھوپھو آسنے کے کپڑوں میں تھی۔ اپنا سوڈا آتا کر اس نے بالوں کو کھولا اور دوبارہ اچھی طرح ڈوڑے کی شکل میں باندھا پھر ہنسنے کے ساتھ ہی لٹاف میں پھسل گئی۔ گرم لٹاف نے اسے سکون دیا۔ اچانک اسے لگا کہ ڈولا دروازے کے آس پاس موجود ہے۔ وہ کچھ دیر تک سن گمن لیتی رہی۔ وہ دروازے کے آس پاس ہی موجود تھا۔ یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟ شانی نے سوچا۔
 دو تین منٹ مزید گزر گئے تو وہ لٹاف سے نکل آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ڈولا برآمدے میں پکڑا رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر وہ چپکلا۔

”کیا بات ہے بڑے؟“
 ”کچھ نہیں باقی جی۔ بس یونہی۔۔۔ اب صبح ہونے والی ہے۔۔۔ میں نے کہا اب سو کر کیا کرتا ہے؟“ ڈولے نے کہا۔

”چلو نہ سونا۔۔۔ تھوڑی دیر سے ہی لیٹ جاؤ۔۔۔ شانی نے کہا۔
 ”جی اچھا۔“ ڈولے نے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا دوسری طرف نکل گیا۔
 شانی کو کچھ عرصہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کچھ نہیں پایا۔

شانی دوبارہ آکر لٹاف میں لیٹ گئی۔ اس کا ذہن مسلسل عارف اور اپوزا دہ کے دونوں بچوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ پھر سوچتے سوچتے اس کی سوچ کا رخ گوجرانوالہ کے خونی واقعے کی طرف مڑ گیا۔ راکب خان کی موت کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ ٹوٹے ہوئے جگ کے ٹکڑے سے راکب نے اتنی کامیابی سے اپنی کالیوں کی رگیں کاٹی تھیں کہ تھوڑی ہی دیر میں اس کا سارا خون جسم سے خارج ہو گیا تھا۔ یہ فرسودہ عقیدے اور وہم انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ وہ سوچتے لگی۔

اچانک۔۔۔ بالکل اچانک شانی کو احساس ہوا کہ کمرے میں اس کے اور نینے کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ یہ خیال اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ چند سیکنڈ کے لئے نکتے میں رہ گئی پھر اس نے تیزی سے لٹاف پھینکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیم تیار کی میں کچھ نظر نہیں آیا مگر یوں لگا کہ قدم آدم الماری کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ پھر وہ اپنا پتول شانی کی الماری میں موجود رہا تھا۔ وہ الماری کی طرف لپکی مگر اس سے پہلے ہی وہ ہمیشہ تک خوف مجسم حالت میں سامنے آ گیا جو کمرے میں موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا جو بے پناہ وحشت کے عالم میں الماری کے عقب سے

برآمد ہوا تھا۔ شانی نے دیکھا کیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چنگلی تھے تھی۔ اس نے پوری طاقت سے شانی کی گردن پر داریا۔ اسطرح ہی مل کے تحت شانی نے پیچھے ہٹ کر خود کو بچایا۔ خنجر کی دھار جیسے اس کے کندھے کو کھونچ کر لے گئی تھی۔

ایک ہیما تک چنگھڑا کے ساتھ حملہ آور نے دوسرا در کیا۔ اگلے پاؤں پیچھے ہٹنے کے سبب شانی گر گئی۔ اس کا گردن اس کی زندگی کے لئے سوند جیت ہوا۔ یہ دوسرا در ابھی خالی گیا۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور تیسری مرتبہ شانی کو نشانہ بناتا کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور شانی نے کوتاہی ڈوڑے کو دیکھا۔ وہ دلیرانہ انداز میں جست کر کے حملہ آور پر چاڑھا۔ دونوں اوپر پیچھے فرش پر گرے۔ حملہ آور کا سر چنگ کے پائے سے ٹکرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شانی نے خنجر کسرش پر لٹکنے کی آواز سنی۔ یہ آواز نسل کش تھی۔ شانی نے سہا کر یہ خنجر بھی زہر بھی بچھا ہوا ہے تو پھر اس کا حملہ آور کے ہاتھ سے نکل جانا اچھا لگتا ہے۔

ڈولا کم وزن ہونے کے سبب حملہ آور کو اپنے پیچھے نہیں دبا سکا۔ حملہ آور نے ڈولے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور بڑی بے دردی سے کمرے کے اوٹھ کھلے دروازے پر دے مارا۔ تسادم آٹھ شاہد یہ تھا کہ دروازے کی لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی اور ڈولا لڑھکتا ہوا برآمدے سے پھوٹا جا کر۔ اس دوران میں شانی کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ الماری تک پہنچے اور دروازے میں سے اپنا پتول پتول نکال لے۔ اس نے دروازے کے اندر ہی پتول کا سیٹھی کچ بٹایا اور حملہ آور کی طرف کھوی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نشانہ بنا سکتی اس نے پورے زور سے ٹانگ چلائی۔ یہ بڑی خوفناک ضرب تھی۔ شانی کی پالیوں کے نیچے شہید چوٹ لگی اور وہ جیسے ہوا میں اڑ کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے دماغ میں لال پللی چنگا پلائی ہی صجوت نکلیں۔ اس کے کانوں میں سننے کے چلانے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ اس شور قیامت سے اٹھ بڑھا تھا اور اب بلند آواز سے رور رہا تھا۔ شانی کا سر سخت دیوار سے ٹکرایا تھا اور شاہد چند ساعتوں کے لئے وہ سن ہی سہی تھی۔ تاہم اس حالت میں بھی اس کے ذہن میں یہ احساس موجود رہا کہ پتول اس کے ہاتھ سے لٹکا نہیں اور وہ فرش پر نیم دراز ہے۔ اس نے پوری آنکھیں کھولی کراہنے سامنے دیکھا۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ حملہ آور جو ایک درمیانی عمر کا شخص تھا خود ک ٹھروں سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ پتول یا ماڈور وغیرہ نکال رہا ہے۔ یہ بس چند ساعتوں کا کھیل تھا۔ شانی نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں سوچا۔ کیا وہ حملہ آور کے ہتھیار نکالنے تک خود کو سنبھال سکے گی؟ اور اس پر فائر کر سکے گی؟ ابھی جواب اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ اچانک برقی گوند گئی۔

شانی کو لگا کر ایک پہرے دار حملہ آور پر چاڑھا ہے۔ دونوں شیشے کی میز کو پھینکا تو دکر کے گرے اور ختم گھا ہو گئے۔ زوردار دھماکے سے پیلا فائر ہوا پھر دوسرا۔ پھر ایک اور۔ حملہ آور ہتھیار رہا تھا اور اتحادی گولیاں چلا رہا تھا۔ شانی نے گولہ جھٹک کر سر سے باہر نکل گئی۔ اسی دوران میں چار مسلح پہرے دار کمرے میں کھس گئے۔ حملہ آور کو بے بس کر دیا گیا۔ شانی نے نیوب لائن میں دیکھا کہ حملہ آور کے ساتھ سب سے پہلے ختم گھا ہونے والا چوہدری بابی تھا۔ وہ بدقت اندر داخل ہوا تو شاید حملہ آور شانی یا شے کو شوٹ کر دیتا۔ باہر کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔

شانی نے کو اپنے ساتھ لپٹا لے ہوئے جلدی سے آگے بڑھی۔ ”کیا ہوا بابی۔ تم ڈر ہی تو نہیں؟“

”نہیں، بس تھوڑی سی کمی ہے۔“ بابی کہہ رہا۔

شانی نے دیکھا کہ ایک گولی اس کی پنڈلی کو زخم لگاتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم گہرے نہیں تھا مگر خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

حملہ آور کے سر پر کسی پہرے دار نے بندوق کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی تھی۔ وہ نیم سبے ہوش ہو گیا تھا اور اسی حالت میں ہوئے ہوئے گر کر رہا تھا۔ یہ ایک عین شیعہ شخص تھا۔ اس کے گلے میں دو تین تھوبے تھے۔ ایک کان میں چاندی کی سرکی تھی۔ ایسی صورتیں شانی کو اکثر قدرت اللہ کے ارد گرد نظر آیا کرتی تھیں۔

ایک دہی ساری حویلی کے لوگ شانی کے کمرے کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ ہر چہرہ سرا سیمہ نظر آنے لگا۔ تاج معصوم اور پھوپھو آمنہ نے شانی کو بازو پار گلے سے لگایا اور اس کا ہاتھ چومنا۔ پھوپھو تو اسے خود سے جدا ہی نہیں کر رہی تھیں۔ تاج معصوم نے گھر کے سارے افراد کو ہدایت کی کہ وہ شانی کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے پہرے داروں کو ہدایت کی۔ ”پوری حویلی کی بیاں جلاؤ۔ ایک ایک کونے کی تلاشی لو۔ باہر کے دروازے بند رکھو۔ اگر کوئی اور حرا بھی یہاں ہے تو باہر نکلنے نہ پائے۔“

پہرے داروں نے فوراً ہنگامہ دہ شروع کر دی۔ شانی کے خالو اعجاز بھی حویلی میں ہی تھے۔ وہ خود تلاشی کے کام کی نگرانی کرنے لگے۔

حملہ آور نے ڈولے کو بڑے زور سے پیچھا تھا تاہم حیرت انگیز طور پر اسے بہت کم چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بالکل چس نظر آ رہا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تشکر بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”نہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“ شانی نے پوچھا۔

”نہیں بابی جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

شانی کو یاد آیا کہ اس غیر معمولی واقعے سے پہلا ڈولا کمرے سے باہر بے چین سا پھر رہا تھا۔ یقیناً اس کی غیر معمولی حیات اسے خطرے سے آگاہ کر رہی تھیں۔ شانی نے کہا۔ ”ڈولے اگر تمہیں کوئی شے تھا تو تم نے مجھے بتا دیتا تھا۔“

”بس میری کچھ میں خود بھی ٹھیک سے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر مجھے آپ کو بتا دینا چاہیے تھا۔ یہ میری غلطی ہے۔“

شانی نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ لگایا۔ ڈولے کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ چوہدری بابی کی پنڈلی پر پٹیا باندھی جا رہی تھی۔ پٹی میں سے تھوڑا تھوڑا خون دس رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنی تکلیف کو ضبط کر رکھا تھا۔ درحقیقت حملہ آور سے ختم گھا ہوتے ہی چوہدری بابی نے اس کا نعل والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ حملہ آور نے بس ایک گولی اپنی مرضی سے چلائی جو چوہدری بابی کی پنڈلی کو زخمی کرتی ہوئی گزری۔ باقی ساری گولیاں بابی نے نہچت کی طرف چلا دی تھیں۔ پھت کا پلستر جگہ جگہ سے اکٹھا ہوا معلوم ہوا تھا۔

شانی کو معلوم تھا کہ اس ہنگامے کے سبب آپو زاہد اور بھائی اکرام بڑے خوف زدہ ہوئے ہوں گے۔ وہ سیدھی نشست گاہ میں ان کے پاس پہنچی۔ آپو زاہد کا رنگ جلدی ہو رہا تھا۔ ”کیا ہوا تھا میری بہن! کیا کوئی چوڑا آگیا؟“

”ہاں آیا آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ پکڑا گیا ہے۔“

”بہت ہی گولیاں چلی ہیں۔ کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟“ اکرام نے پوچھا۔

”نہیں بھائی جی! اللہ نے کرم کیا ہے۔ بڑی بچت ہو گئی ہے۔“

”بس۔۔۔ بچوں کا کچھ بچہ چلا؟“ آپو زاہد کی متانہ۔ بھین بھوری تھی۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی، سو بالکل کی گھنٹی بج گئی۔ شانی نے دیکھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑک گیا۔ یہ عارف کی کال تھی۔

”ہیلو عارف! کہاں ہو؟“

”میں یہاں بہادر گاؤں میں بچوں کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک تھا کہ میں۔“ عارف کی آواز مدھم مدھم تھی اور ایک انگ کر آ رہی تھی۔

”بچوں کو لانا میں کوئی مشکل تو نہیں؟“

”آپ بس بچوں کی بات ان کی والدہ یا والد سے کرادیں۔“ عارف نے کہا۔

شانی نے مایک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپا آپ کے بیچے آپ سے بات کرنا

چاہتے ہیں، پر آپ نے انہیں یہ نہیں بتا کر آپ کہاں ہیں۔
 ”تو کیا کہوں۔“ آپ زہادہ نے پوچھا۔
 ”انہیں لاہور کا کہہ دیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ آپ زہادہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ اس لرزش میں ہلکی سی خوشی بھی شامل تھی۔

اگلے تین چار منٹ میں آپ زہادہ اور اکرام دونوں نے بچوں سے بات کی اور انہیں کہا کہ وہ اہل کے ساتھ گاڑی میں لاہور آ جائیں۔ اس کے بعد اکرام نے بچوں کے گھر آ کر یا نہ فریاد زہادہ سے بھی بات کی۔ اکرام نے زہادہ کو گھر میں سنبھالے ہوئے کچھ زہور اور نقدی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ یہ چیزیں بچوں کے ساتھ ہی بھیج دے۔

فون پر بچوں اور زہادہ سے بات کرنے کے بعد آپ زہادہ اور بھائی اکرام بہت حد تک پرسکون نظر آنے لگے۔ ان کے سکون نے ثانی کے دل سے بوجھ بھی قدرے کم کر دیا۔

”آپ آج تھوڑا سا تھک لیں۔“ ثانی نے کہا۔
 ثانی کے بہت اصرار کے باوجود دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

آپ زہادہ نے ایک بار پھر کہا۔ ”چھوٹی بہن، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی طرح تھپ گئی۔ ان کا بھوٹ۔“
 ”مجھے جیسے ہی زہادہ (وقت) ملے میرے پاس آ جاتا۔“

ثانی کو کھوس ہوا کہ جب تک یہ صاف دل عورت اپنے اندر کی بات کہہ نہ دے گی اسے سخت بے چینی محسوس ہوتی رہے گی۔ اسے بے آرام رکھنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔

ثانی نے کہا۔ ”اچھا آپ آجیں میرے ساتھ۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیں۔“

ثانی آپ زہادہ کو حویلی کی مالائی منزل پر لے آئی۔ اب دن چڑھ چکا تھا۔ حویلی میں سرائیکی کی انصافچی بھری روزمرہ کے معمولات شروع ہو چکے تھے۔ دی ہلچا ہوا تھا۔ ایک بڑے تندور میں روئیاں پکائی جا رہی تھیں۔ کچھ لڑائیں برتن دھوئے میں مصروف تھیں۔

مال خانے سے آنے والے تازہ دودھ کے برتن ایک قطار میں رکھے تھے۔ زہادہ نے ان مناظر کو قدرے حیرت سے ادراک کر دیکھا۔ دونوں ایک کمرے میں بیٹھ گئی۔ زہادہ کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔ وہ جو بات کہنے جا رہی تھی اس کا بوجھ اسے اتنا زیادہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ باپ کی گئی۔ زہادہ نے ایک گہری سانس لیجے ہوئے کہن شروع کیا۔ ”میری چھوٹی

بہن! آج تم پر جو احسان کیا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میں کس منہ سے حیران ہو رہی ہوں۔“

میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ یہاں تک کہ اس حوالدار نے تمہیں کیا تبھہ بتایا

ہے۔ پر جو کچھ سچ ہے، وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔“
 ”تم جانتی تھیں۔“ ثانی نے کہا۔

آپ زہادہ نے خشک ہونٹوں پر زبان بھری۔ پھر انہوں نے بولنا چاہا مگر آواز گنگے میں پھنس گئی۔ انہوں نے یہ مشکل کہا۔ ”اس حوالدار نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

ثانی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو مشکل ہو رہی ہے۔ چلیں میں ہی بتا دیتی ہوں۔“ آپ اس رسم سیال کی بہن ہیں جسے پنجاب کی پولیس دور دور تک ڈھونڈتی پھر رہی ہے اور جس پر جیل، انوار اور دھنکی کے کٹ آنٹ کیس ہیں۔ رسم سیال نے آپ کو ایک طویل عرصے سے گوجر خان کے گاؤں پیارو میں چھپا کر رکھا اور اٹھائیں کل آپ مایاں بیوی ایک اتفاق کے سبب پولیس کی حراست میں چلے گئے اور بعد میں اس موصول حوالدار نے آپ کو پہچان لیا۔

یہی کہنا چاہتی تھیں آپ ان؟“

آپ زہادہ کا ایک سسکتے لگیں۔ انہوں نے لگاتار انسو گراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ظالم پولیس میرے شریعے بھائی کو کھا گئی۔“

”نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ ثانی نے کہا۔ ”میری زبانوں والے لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ۔“ وہ فخر بھرا لہجہ نہ کر سکی اور ہلکیوں سے روئے گئی۔

ثانی کے دل میں بھی ایک گھونسا سا لگا اور وہ مایاں بے آپ کی طرح تھپ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ضبط کے سارے بندن توڑ کر آپ زہادہ کو گنگے سے لگالے اور ان ہی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو نہ شروع کر دے۔ اس کے کانوں میں نہ جانے کیوں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے کل سر شام جہاں بلب راکب خان کے ہونٹوں سے سنے تھے۔ کاش اس نے یہ الفاظ نہ سنے ہوتے، وہ آج اپنی اسی روتی ہوئی نند کو صدقہ دل سے تسلی دینے کے قابل تو ہوتی۔ وہ الفاظ ابھی تک جھلکے پسے کی طرح ثانی کے کانوں کو بھرجو کر رہے تھے۔ راکب خان نے چشتو نہ لہجے میں کہا تھا۔ ”ان کو بھول جاؤ۔ وہ سب ختم ہو گیا۔“

خوف، بے اندر چلا گیا۔“

ثانی نے بے پناہ کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور اپنی دھکیلائے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپا خدا سے بیوقوفی امید رکھنی چاہیے۔ وہ کہتے ہیں ناں جسب تک سانس تب تک آس۔“ مگر آپ کے بھائی کی زندگی باقی ہے تو کوئی اسے نہیں سکتا۔“

”میرا بھائی انہیں تھا۔ اسے زمانے نے نہ بنایا۔ یہ زمانہ ہی ہے جو، جوان بڑوں کے فرشتوں جیسے بھائیوں کو کھڑا اور قاتل بناتا ہے۔“ میرا بھائی تو ان لوگوں میں ایک تھا۔ پورا بڑھن اس کی تعریف کرتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، اللہ ہر ماں کو سرم جیسا بچہ دے۔ پر بھر دھن

کی ایسی حسرتی پہلی کسب کچھ سزاوارہ ہو گیا۔ دہری دشمنوں سے میری جان اور دل بچاتے ہوئے میرا چھوٹا دیر دشمنی کے منہ میں چلا گیا اور قاتل ڈاکو بن گیا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے میری بہن۔ میں تمہیں کہاں تک سناؤں، تم کہاں تک سنو گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس خطرناک قاتل ڈاکو کے اندر اب بھی میرا چھوٹا سا دیر چھپا ہوا تھا۔ چوڑی چھائی اور شرمیلی آنکھوں والا سوہنا بھلا رستم۔ وہ اب بھی اپنی آپ کی خوشی کے لئے اپنی دوستی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی دوستی اور آپ کے درمیان بیٹھ کر تصویر کھینچنا چاہتا تھا۔ سارے زمانے کے دہری اس کے پیچھے تھے اس کے اندر کا رستم بھی میری زندگی کے خواب دیکھتا تھا۔ بڑے بھری بہن، میں تجھے کیا کیا بتاؤں اس کی باتیں۔ آپ زادہ نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور چٹکیاں روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔

شانی کا اپنا دل بھی کناروں سے اچھل جانا چاہتا تھا لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اپنی آنکھوں کے تم کناروں کو چھوٹی آنکھوں سے صاف کرتے ہوئے شانی نے موڑھے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آپ زادہ سے پوچھا۔ "کیا آپ کا بھائی آپ کی خوشی کے لئے دوستی لایا تھا؟"

آپ زادہ نے آہ بھینچی۔ "ہماری اتنی قسمت کہاں میری بہن۔ کون کسے لوگ ہوں گے جو اپنی دہی کو ایک جلتی ہوئی آگ میں دھکا دیں گے؟"

"کیا آپ کے بھائی نے کوئی لڑکی پسند کی تھی؟"

آپ زادہ دوپٹے کے پلو سے آٹسو پوچھے ہوئے پولیس۔ "کہتا تو تھا کہ اسات ایک لڑکی پسند ہے۔ ایک وار میرے پاس آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہتا تھا اگلی دفعہ آؤں گا تو تیری سب سے بڑی تنہا پوری کروں گا۔ دوستی ساتھ لاؤں گا اور وہی ایسی کہ اندھیرے پنڈ میں جانن کر دے گی۔ تو اس کے لئے مجھے کپڑے کا بندوبست کر۔ پر پھر وہ کبھی میرے لئے قاب ہوا گیا۔ جب اگلی وار آیا تو سخت تنہا تھا۔ دوستی اس کے ساتھ کیا ہوئی تھی وہ تو خود بھی اپنے ساتھ نہیں تھا۔ سمجھو کہ اس کا پنڈ اور دل دونوں داغ و خراش تھے۔ وہ بچے ایک دم آیا تھا، وہی ی چلا گیا۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ پولیس اس کے پیچھے تھی اور وہ ڈسے ڈیرے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں میرا دیر کہاں کہاں گھل ہوا ہے اور آخر میں اس نصیبیاں مارے کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

شانی دیر تک آپ زادہ کو تسلی دیتی رہی۔ شانی نے آخر میں انہیں کہا۔ "آپ نے یہاں کسی سے یہ باتیں نہیں کہنی جو مجھ سے کہی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ رستم کے حوالے سے

کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ میرے لئے اب بھی اتنی ہی قابل عزت ہیں جتنی یہ باتیں معلوم ہونے سے پہلے تھیں۔ اور آنکھ دہری بھی ر ہیں گی، لیکن ملازموں اور ملنے جھٹے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

آپ زادہ نے کہا۔ "چھوٹی بہن! میں بھی تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ یہ بات صرف تیرے تک ہی رہے۔"

اسی دوران میں ایک بار پھر ہمارے کال آگئی۔ اس مرتبہ اسے اطلاع دی گئی کہ وہ انہوں بچوں کو لے کر پھر اردو گاؤں سے گوجر خان کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ وہاں سے وہ جی ٹی روڈ کے ذریعے وزیر آباد کی طرف آئیں گے۔

اس اطلاع نے شانی کے ساتھ ساتھ زادہ کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑا دی۔ حویلی میں ابھی تک افراتفری موجود تھی۔ ملازمین میں بھی خوف و ہراس تھا۔ حویلی کے بچے چپے کی حفاظت کے لئے لی گئی تھی۔ رنگ والی کے گلے توچوں سے بھی دو دھن مشکوک افراد پکڑے گئے تھے۔ ان افراد کو شانی کے سامنے لایا گیا۔ ان میں سے دو کو تو شانی نے فوراً چھوڑنے کی ہدایت کر دی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ دونوں بے قصور ہیں۔ تیسرے شخص کو اس نے تحویل میں رکھنے کی ہدایت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ اس پر سختی نہ کی جائے۔

رنگ والی تھانے کا انسپکٹر انوار احمد ازخود حویلی پہنچ گیا۔ انوار احمد یہاں کے سابقہ قنصل خانہ میں مظفر کا عزیز تھا اور میں مظفر کی طرح حویلی کے کیمپوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ پکڑے گئے حملہ آور کو انوار احمد کے حوالے کر دیا گیا۔ مشکوک شخص کو بھی شانی نے اس شرط پر انوار احمد کو دے دیا کہ اس پر بے جا سختی نہیں کی جائے گی۔ کل رات پکڑا جانے والا شخص بھی انوار احمد کی تحویل میں تھا۔

انوار احمد نے کہا۔ "لی بی! اس معاملے کو روکنے کے لئے قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہو چکا ہے۔ قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنے میں جتنی دیر ہوگی یہ مسئلہ اتنا ہی بڑے گا۔"

"تم انجی طرح جانتے ہو انوار۔ قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پکڑے جانے سے یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا پتا یہ اور پکڑے۔"

"کل رات جس بندے کو پکڑا گیا ہے اس کا نام شہت ہے۔ اس نے اندھے پن کا ڈرامہ رچایا ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ قدرت اللہ کے مہمان والے آستانے سے آیا ہے۔ اسے ہسپتال بھی آستانے میں ہی دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تجر کو زہری کاں گانے کے لئے زہر ڈیا گیا تھا اور پورا طریقہ بتایا گیا تھا۔"

چڑھ کر دکھا دیتا ہوں۔"

"نہیں، کم از کم ایک دن اور ہو۔"

"ایک دن اور رہنے سے کیا ہوگا۔ وہاں فصل سنبھالنی ہے۔ بہت سا کام پڑا ہے۔"

"میں جانتی ہوں وہاں فصل سنبھالنے کے لئے بہت سے لوگ ہیں۔ تم کہاں نے نہ بناؤ۔"

چپکے پڑے رہو۔ یہاں جو آرام جیسٹیں مل رہے ہیں وہاں نہیں مل سکتا۔"

"ہاں جی۔ یہ بات تو صحیح ہے۔" بار نے کبھی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر خاموشی رہی پھر شانی بولی۔" بار اتم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"پہلے شادی کر کے کون سا کھانا پینا تھا۔ اب تو کوئی دھڑکی اور بڑی سی

چٹکی لڑکی ملے گی تو سوچوں گا۔"

بار نے کی شادی چھ سات سال پہلے ہوئی تھی۔ لڑکی اس سے کافی چھوٹی عمر کی تھی اور

بڑی تند مزاج بھی تھی۔ بار اس سے بڑھ کر تند مزاج تھا۔ لڑکی کو اپنے جینز میں ملنے والی دس

مربع زمین کا غرو تھا، دوسری طرف بار نے کو اپنی چوہدایت کا ٹھکانہ۔ نتیجہ صرف چھ مہینے

بعد طلاق کی صورت میں نکل آیا۔ اس کے بعد سے بار اتم شادی شدہ تھا اور اب تو وہ بار بار

ہی نہیں تھا۔ شراب، جواہر و عورت بازی سب کچھ سمجھ گیا تھا اس سے۔ کئی لمبے ایسے ہی کا یا

پلٹ ہوتے ہیں۔ بار کی زندگی میں یہ سب آتا تھا جب چوہدری اشیر نے غضب سے مطلوب

ہو کر بار کو جان سے مارنا چاہا تھا لیکن شانی "بار گریڈ" ہونے کے باوجود اس کی موت کے

سامنے دیوار بن گئی تھی۔ اس کے بعد بار نے ناپور کے چوہدریوں میں رہے ہوئے بھی

در پر وہ شانی کی صفوں کو آسانوں میں بدلا تھا۔ شانی کی لگاؤ میں بار کا سب سے بڑا کام یہ تھا

کہ اس نے اپنے تاؤ شام کی گرفت سے شانی کو چھڑانے کے لئے کر دار ادا کیا تھا۔ اب تین

دن پہلے جو واقعہ ہوا تھا اس کی اہمیت بھی کم نہیں تھی۔ اپنے خبری اطلاع پر بار نے صرف رنگ

والی پہنچا بلکہ شانی کو اس دوسرے حملہ آور سے بھی بچایا جو کسی طرح شانی کے کمرے تک پہنچ

چکا تھا۔

"آپ کس سوچ میں کھنگی ہو شانی بی بی؟" بار کی آواز نے شانی کو چوکایا۔

"سوچتی ہوں، تمہارے لئے کس قسم کی لڑکی اچھی رہے گی۔"

"جو بہت نہیں کھو۔۔۔ بہت خطرہ ہو اور بے درجے کی فضول خرچ بھی ہو۔"

"گنتا ہے ناپور میں تہذیبی زمینوں کی آمدنی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔"

"بڑھ تو گئی ہے لیکن یہ برقرار رہے گی جب آپ اور تایا مجھے یہاں سے واپس

جانے دیں گے۔ اس وقت میرا تار پور میں ہونا بہت ضروری ہے۔ بس دو تین دن میں کٹائی

شروع ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے اتنا ضروری ہے تو میں نہیں روکوں گی۔"

"اول میں بھی نہیں لوگوں گا۔" منے نے تو کئی زبان میں کہا۔

بار نے اسے اپنی طرف کھینچ کر پیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی گنگدلی بھی کی۔

منے نے مستی میں آکر بار سے ٹانگ چٹائی کہ اس کی ایڑی سیدھی بار کے ڈھم پر لگی۔ وہ

کراؤ اٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سفید پٹی پر خون نمودار ہو گیا۔

شانی نے منے کو ڈانٹا اور کھینچ کر بستر سے نیچے اتارا۔ اس نے ڈولے سے کہا کہ وہ اسے

لے کر باہر چلا جائے۔ خود وہ باہر کی پٹی کھول کر اس کا ڈھم دیکھنے لگی۔ خون مسلسل رس رہا تھا۔

شانی اسپرٹ اور اینٹی بائیوٹک پاؤڈر لے آئی۔ بار کے منع کرنے کے باوجود وہ دوبارہ پٹی

بانہ منے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ منے کی حرکت کے لئے اس سے معذرت بھی

کر رہی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جی۔ وہ بچہ ہے۔ اور صرف بچہ نہیں، بہت پیارا بچہ

ہے۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بہت پیارا بچہ جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"بیاری صورت کے لئے کچھ نہ کچھ رعایت اپنے آپ ہی نکل آتی ہے۔ میرا چھوٹا

جینا بانیض بھی بالکل ایسا ہے۔" بار نے جلدی سے کہا۔

شانی نے دیکھا۔ تایا معصوم دروازے میں آن کھڑے ہوئے تھے اور اسے بار کی پٹی

کرنا دکھ رہے تھے۔

"کیا وہ بار پھر بچہ؟" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کچھ نہیں تایا جی۔۔۔ ڈھم زار دکھا گیا ہے۔" بار نے کہا۔

"منے نے ٹانگ چٹائی ہے۔" شانی نے تفصیل بتائی۔

"ایک نمبر کا بد معاش ہے۔" تایا معصوم بولے پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگے۔ "شانی

بڑے قارغ ہو کر ذرا میری بات سنتا۔"

"جی ابھی آتی ہوں۔" شانی نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ تایا کے کمرے میں ان کے سامنے رنگین پائوں والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تایا

اپنی پیید واز میں اٹھ گیاں پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ کی

الکلیاں تھج پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک شانی کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا شروع کیا۔ "دھی رانی! بندے کو زندگی میں بہت سے فیصلے ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اس کی مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتے۔ کبھی یہ فیصلے زمانے کی وجہ سے کرنے پڑتے ہیں اور کبھی اپنے مذہب کی وجہ سے۔ اور کبھی فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کی ضرورت زمانے اور مذہب دونوں کی وجہ سے پڑتی ہے۔ اور یہ فیصلے زیادہ ضروری ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کے تاپا معصوم نے چند لمبے وقفے کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "تمہارے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے شانی پتھر۔ اور یہ دنیا بڑی بے رحم ہے۔ یہاں ایک عورت کے لئے ہر قدم پر آفتیں ہی آفتیں ہیں۔"

"آپ کہاں چاہتے ہیں تپائی؟"

"فاخری موت کے بعد تم بالکل تھما چکے ہو گراوری ہو۔ ایسا کب تک رہے گا؟"

"مم۔ میں تمہیں ہوں تپائی۔ آپ سب میرے اپنے ہیں اور میرے ساتھ

ہیں۔ اور پھر میری بھابھی کی شانی بتا میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

تاپا معصوم شانی کی بات سنی ان کی کرتے ہوئے بولے۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ تو ہمیشہ

اس حوالی میں رہے۔ تو نے اس پر بادو چلی کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ یہ ساری عمارت اور

یہاں کے سارے پھول پودے اور یہاں کے رہنے والے لوگ، سب پھر سے ہی اٹھے

ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب تو کبھی یہاں سے جائے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تو ساری

زندگی ایک بیوہ کی طرح گزاردے۔"

شانی کے سینے پر ایک گھونسا لکھ خاموش رہتا اس کی بھوری خمی۔

تاپا معصوم نے کہا۔ "میں تیرے لئے ہمیشہ ایک درمیانی راستہ ڈھونڈتا رہا ہوں۔ کوئی

ایسا شریف بندہ جو تھکے و پٹا کرے اور تجھے یہاں سے لے جائے بھی نہ۔ تو ہمیشہ یہاں

رنگ والی میں ہمارے پاس رہے۔ اور یہ بھی سہاگن بن کر!"

"آپ کسی باتیں کر رہے ہیں تپائی۔ میں جس حال میں ہوں بالکل خوش ہوں۔

مجھے کوئی کمی نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔"

"تمہیں دھی رانی، کبھی ہے اور تمہارے بزرگ کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں

تمہاری زندگی کی اس کمی کو پورا کرنے کے بارے میں سوچوں۔ اور میں نے بڑی حد تک

سوچ بھی لیا ہے۔ ایک بندہ میری نظر میں ایسا ہے جو میری اور تمہاری ساری شرطوں پر پورا اتر

سکتا ہے۔"

شانی کا دل ٹری طرح دھڑک رہا تھا اور سینے میں جھواں سا بھر رہا تھا۔ اس کی کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیا یہ کیا کہے۔

وہ نیچے سے ٹیک لگائے اپنی ڈھن میں بولنے چلے گئے۔ انہوں نے آج جیسے تہیہ کر لیا

تھا کہ شانی کے روم کی پر وادہ کے بغیر سب کچھ اس سے کہہ دیتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "نار پور

والوں نے ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہر سارے کے سارے ہار پوری تو ایک

جیسے نہیں ہیں۔ وہ سب نے کیے ہیں ناں کہ انہوں میں نے ہار پوری تو ایک

ہیں۔ اب اس باہر کی مثال ہی لو۔ شتا کہ کسی چوٹ کی وجہ سے لوگ بدل جاتے ہیں لیکن

جس طرح بار بدلا ہے، کوئی کہاں بدلا ہوگا۔ لگتا ہے کہ یہ دوبارہ ہے ہی نہیں۔ کا دوبارہ

خود پر بھی بار ہمارے ساتھ بہت تعاون کر رہا ہے۔ اس نے اپنے تیل کے کارخانے کے

لئے سب سے زیادہ مٹی اور سورج بھی ہمارے پاس سے اٹھایا ہے۔ میں نے پچھلے مہینے جنہیں

بتایا تو قصاب کچھ۔"

"لیکن۔۔۔ ان باتوں کا۔۔۔ مجھ سے اور میری زندگی سے کیا تعلق ہے تپائی۔" شانی

نہایت آزرہ لہجے میں بولی۔

"تعلق اسی طرح بننے ہیں ناں شانی پتھر۔ میری بوڑھی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں،

وہ تم نہیں دیکھ رہی ہو۔ مجھے باہر میں جو سب سے خاص چیز نظر آ رہی ہے وہ اس کا اخلاص

ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بغیر کسی مفاد اور لاٹچ کے کر رہا

ہے۔ ابھی اس نے کسی کو بتایا نہیں پر میں جانتا ہوں کہ وہ رنگ والی سے باہر ڈیک نالے کے

ساتھ ساتھ کافی زمین خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ صرف خریدے گا نہیں

اسے آباد بھی کرے گا۔"

شانی خاموش رہی۔ وہ داپا سے اٹھ جانا چاہتی تھی مگر تاپا کے سامنے سے ہوں اٹھ جانا

بھی اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی تھی۔ کروڑوں کی جائیداد کی

اکوٹی مالک! لیکن اپنے بیٹوں کے احرام کی خواہش نسل در نسل ورثے میں ملی تھی۔ وہ

ایک عام لڑکی کی طرح سر جھکا لے اپنے بزرگ کے سامنے بیٹھی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد تاپا معصوم نے جیسے ہمت کر کے کہا۔ "شانی پتھر!

میں تم پر اپنی اور دوسرے بزرگوں کی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں غصوں کا اور نہ غمناک چاہتا

ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچو۔ اگر کسی طرح۔ باہر جیسا بندہ

تمہاری زندگی میں آجائے تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی آباد ہو سکتی ہے۔"

”پلیز تپائی۔“ شانی بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کی آواز گلے میں رک گئی اور وہ جیڑی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”تم کہاں ہو۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔ تم کیوں مجھے اتنا دکھ دے رہے ہو۔۔۔ میں لوگوں کو کیا بتاؤں تمہارے بارے میں؟“ وہ سسکتی گئی۔

پتا نہیں وہ کب تک اس طرح پڑی رہی۔ آنسو بہہ جانے سے دلی کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اس نے میں فون کی بجھتی پٹی۔ اس نے کال ریسیڈی۔ دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی رگوں میں ایک ایک پھر خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کپشیاں جیسے چلنے لگی تھیں۔ دوسری طرف ایک محسوس آواز تھی۔ ”ڈپٹی ریاض ہٹلری کی آواز۔“ بیلو۔ میں ڈی ایس بی ریاض بول رہا ہوں۔“

”ہاں کیا بات ہے؟“ شانی نے خود کو سناتے ہوئے کہا۔

”نفسب دشمنان ز کام لگا ہوا ہے؟ آواز کچھ بھاری بھاری ہے۔“

”بہتر ہے کہ تم کام کی بات کرو۔“

”کام کی بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک ڈاکٹر ہے جو پیسے کا بہت اچھا علاج کرتا ہے۔ اس کا نام ہیڈ کائینٹیل جلال ہے لیکن پولیس لائن میں اسے جلال کے بجائے پیار سے جلا د کہتے ہیں اور ہمیں پتا ہی ہو گا کہ نام ایسے ہی نہیں پڑ جاتا۔ ان کے پیچھے کوئی وجہ چھب ہوتی ہے۔ یہ جلال اپنے قبضے میں آئے ہوئے بندے کو نیوکی طرح چھو دیتا ہے۔“

”حت۔۔۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”بات بڑی سیدھی ہے۔ تم تپا بیجی کو چودہ ماہٹ اور فیڈری کا ہینڈ بورا ہے۔ اس پیسے کا میں ایسا علاج کر داسکتا ہوں کہ تمہاری اگلی تین نسلوں کو یہ شکایت نہ ہوگی۔“

”کیا کیا ہے ہم نے؟“

وہ ایک لمبی ڈکار لے کر بولا۔ ”جیہیں اچھی طرح پتا ہے بی بی جان کہ تم نے کیا کیا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو کہ تمہارا ہمارے ہاتھ پاؤں چٹکی طرح کھیل گئے ہیں۔ اب تم قدرت اللہ صاحب سے اگلے جھگڑے بدلے لے سکتی ہو۔۔۔ اور تمہارا ماٹرن مائنڈ وہ تمہارا بڑا حیات۔۔۔ وہ تمہاری جیڑیوں میں بھاری بھاری دھننے ڈال کر قبر میں چلا جائے گا۔ اور پیچھے رو جاؤ گی تم اور تمہاری ملوک جیڑی۔ اگر یہ جیڑی میرے قبضے میں آگئی تان تو تمہاری ساری فیڈری ناک کے راستے پستے پانی کی طرح نکلوا دوں گا۔“

”دیکھو ڈپٹی ریاض! زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں تپا کے بارے میں تمہاری گندی زبان سے ایک لفظ سننا نہیں چاہوں گی۔“

”اگر یہ گندی زبان جیہیں کچھ سنانے پر آمنی تان تو ایسا باتیں سنیو گی کہ سر سے پاؤں تک تمہارے اندر مریضیں مریضیں بھر جائیں گی اور جیہیں یہ بھی بتا دوں جس گلے پر بندھ کر تم دو تلیاں جھاڑ رہی ہو تان، میں وہ بھی اکھاڑ کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اس لئے اب زیادہ مان نہ کر جا ہی شامی گا۔“ ڈپٹی ریاض کی آواز میں نصب کے شعلے پھٹکار رہے تھے۔

شانی کے جسم پر غصہ اسپینڈ آگیا لیکن اس نے خود کو ٹھنکے نہیں دیا۔ وہ بولی۔ ”ڈپٹی ریاض! ہمارے درمیان بات ہوئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے رستے میں نہیں آئیں گے۔ اب تم پھر اپنی ٹانگ ہمارے معاملات میں گھسیڑ رہے ہو۔“

”شکر کر بی بی جان! میں صرف ٹانگ گھسیڑ رہا ہوں اور میں جیہیں بتا دوں، میں وہ عزت مآب سمجھتا ہوں جس نے کبھی کسی غصے سے بے گلو اپنے اوپر سواری نہیں کرنے دی۔ جہاں تک معاملہ ہے کی بات ہے تو وہ میں نہیں توڑ رہا تم تپا بیجی توڑ رہے ہو۔ تم قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ رہے ہو۔۔۔ اور اپنی ساری کھڑکیاں کھول کر سن لو، میں تم لوگوں کو قدرت اللہ کے قریب بھی نہیں بچھڑ سکے دوں گا۔“

شانی نے کھڑک دوار میں کہا۔ ”وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس سے قانون ٹرنے گا۔“

”اور تم میری خلاف ورزی کر رہی ہو۔ تم سے گاہک نہیں گئے۔ میں جیہیں طوائف بنا کر لا ہو کر سمیرا منڈی میں نہ بھلا دوں تو میرا نام بدل دینا۔“ ریاض ہٹلری کی آواز میں آتش فشاں تھے۔

شانی کا گلہ خشک ہو گیا۔ ”ریاض! تم بات کو بڑا حار ہے ہو۔“

”میں بات کو کھٹا رہا ہوں۔ بڑا حاد کا تو تم تپا بیجی محل دیکھ کر پتہ چلے گا میں نظر آؤ گے اور میں جیہیں پھر بتا دوں میں بہت۔۔۔ آدمی ہوں۔“ آخری فقرے میں ریاض نے خود کو ایک غلط گالی دی۔

شانی نے فون بند کر دیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے سنا تپا معصوم اور منٹا کھڑے تھے۔ تپا معصوم نے پوچھا۔ ”کس سے بات کر رہی تھیں دیکھ رانی؟“

”کس کوئی نہیں، اچھا۔۔۔ شانی نے تپا شانی سے پیسہ پوچھتے ہوئے کہا۔“

”تم چمپار ہی ہو۔ تم ریاض کا نام لے رہی تھی۔“

شانی ٹھٹھا ہونٹ دانتوں میں دبا کر دھکی۔ اس کے جسم پر ہلکی سی لرزش تھی۔ تانیہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈپٹی ریاض تھا؟“

شانی نے انہماک میں سر ہلایا اور دو تازہ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا ان تانیہ..... انکھڑا اور قدرت اللہ کی طرف نہ جھکیں۔ یہ لوگ ملے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ڈپٹی ریاض اور قدرت اللہ وغیرہ۔ ڈپٹی ریاض دھمکیاں دے رہا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ کتنا برا انداز ہے۔ انکھڑا انوار احمد نے قدرت اللہ سے جو پوچھ چوچھا ہے اس کی وجہ سے ریاض بھڑک گیا ہے۔“

”تو پھر جان لے لے ہمارے۔ مار ڈالے ہم سب کو۔ ہم سب خود چل کر قدرت اللہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی بیوی کے بدلے ہم سب کے گلے کاٹ ڈالے۔“ تانیہ معصوم آرزو ہو کر بولے۔

انہیں آرزو دیکھ کر شانی نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ ڈراؤں سے بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تانیہ جی اسب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے ہو جائے گا۔ بس ہمیں ذرا حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ جو بندہ اپنے کرقوت کوئی کی وجہ سے اپنی موت خود آپ مر رہا ہے، اسے ہم مارنے کے لئے کیوں ہاتھ پاؤں چلیں۔ آپ بس دعا کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

تانیہ معصوم نے ایک سر آہ بھینچی۔ ”بھری دھی، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ریاض اور قدرت اللہ جیسے بدمعاشوں کو والی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے تجھے ایک مضبوط سپارے کی ضرورت ہے۔ ایسا سپارہ جو ہر خطرے کے سامنے دیوار بن جائے۔“

شانی نے سوچا ایک دیوار ہے تو کسی لیکن پتائیں وہ کون اندھروں میں کھوئی ہوئی ہے۔ وہ تانیہ کا عمر رسیدہ ہاتھ تھام کر بولی۔ ”تانیہ جی! آپ اپنی بیوی کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں۔ میں ریاض جیسے لوگوں کا سامنا کر سکتی ہوں اور آپ کو کر کے دکھاؤں گی۔“

تانیہ معصوم کے سر پر سپید پیر سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی بہادر لیکن کم عمر حیثیت سے متعلق نہیں ہیں۔ بے شک انہیں اس کی ملا جلی باتوں پر اعتماد تھا اور علاقے کے لوگ بھی شانی کو پوری محبت کے ساتھ مر و مروتی آپ کی جگہ سمجھنے لگے تھے لیکن کچھ بھی تھا، تانیہ معصوم کی نگاہ میں وہ ان سارے کاموں کے لئے کم عمر تھی۔

وہ پیر سے پہلے شانی سے ملنے کے لئے سڑکوں کو لوگ آتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ یہ اجتماع عموماً ایک کھلی کچہری کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ شانی

لوگوں میں مکمل مل جاتی..... ان کے مسائل ملتی، ان کے دشمنوں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس طرح اس کے اپنے دشمنوں کو بھی مرہم ملتا تھا۔ اس کا دھیان اپنے دکھوں کی طرف سے ہٹ جاتا تھا۔ لیکن اوپر سے ہونے والے ان واقعات کے بعد تانیہ معصوم، خالو انجاز اور دیگر بزرگوں نے شانی کو اس طرح لوگوں میں ٹھٹھانے سے روک دیا۔ شانی کو قہقہے تو ہوا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لئے ہے۔ شانی نے درمیانی راستہ یہ اختیار کیا کہ تھوڑے لوگوں سے ملتی، ان لوگوں کو چھوٹے چھوٹے ڈراموں کی شکل میں اور تھوڑی سی باتوں کے بعد شانی کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ لوگ شانی کے دیوانے تھے۔ مرد و زن اور بچے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں اور پہروں کو چلیے باہر کھڑے رہتے تھے۔ وہی آپا کے بعد شانی ان کے لئے علاقے میں ایک ایسی شخصیت بن کر ابھری تھی جو ان کے دکھ درد کی سہاگنی تھی اور وہ اس کے راز قلمی تعلق محسوس کرتے تھے۔ ”شانی بی بی! چال۔“ ”بھری۔“ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ وہ حقیقت اس ہسپتال کے قریب و جوار سے قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے پاؤں اکٹھا کر دیتے تھے۔ ہسپتال سے شفا یاب ہونے والے مریضوں کا اصل محسن تو باہت و اکڑ بہرہ تھا لیکن بہت سے سادہ لوح ایسے بھی تھے جو صحت یاب ہونے کے بعد رنگ والی کی چھوٹی چوہرائی کو سلام کرنے پہنچ جاتے تھے۔ یہ ساری صورت حال یقیناً قدرت اللہ اور اس کے خواروں کے سینوں پر مومک ڈل رہی تھی اور اس کا ثبوت شانی پر ہونے والے قاتلانہ حملوں سے بھی ملتا تھا۔

دو روز بعد جب چوہر دیو باہر کو چلی سے رخصت ہونے لگا تو تانیہ معصوم نے شانی کو بتایا۔

”شانی بڑا بار بار ہے۔ جا لے رخصت کر آ۔“

”اچھا تانیہ جی۔“ شانی نے ہلے سے کہا۔

اگر دو روز پہلے والی بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید شانی اس بڑے تپاک سے رخصت کرتی مگر اب وہ اپنے دل پر ہماری بو جھمکس کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر نہیں گئی۔ وہ تانیہ معصوم کو اپنی طرف سے کوئی مثبت اشارہ نہیں دینا چاہتی تھی، لیکن میں اس وقت جب باہر جا رہا تھا شانی خود کو اخلاقی تقاضا پر مار کرنے سے باز نہیں رکھ سکی اور اسے رخصت کرنے کے لئے آگئی۔ باہر کو بھی غالباً تانیہ معصوم کی زبانی ان دھمکیوں کا علم ہو چکا تھا جو ڈپٹی ریاض نے شانی کو دی تھیں۔ باہر نے ریاض کے بارے میں چند سخت الفاظ کہے اور شانی کو یقین دلایا کہ اگر ریاض نے سچ میں کوئی نہ تو وہ سب مل کر اس سے نہیں گئے۔

بارے کے جاننے کے بعد شانی سیدھی دوسری منزل کے اس کمرے میں پہنچی جہاں آپ زابدوہ اور بھائی اکرام کا قیام تھا۔ دونوں بچے ساتھ والے کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ چاروں یہاں خاصا محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ ویسے ان کے گاؤں پہاڑ میں بھی ایسی خبر تھی کہ غزری تھی۔ شانی کو عارف کے ذریعے جو خبر ملی تھی ان کے مطابق ایسی کوئی بات پولیس والا کسی گفتگو کی غرض سے پہاڑ گاؤں نہیں پہنچاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاؤں والے گاؤں کے موچیل حوالدار کے سوا کسی کی یادداشت نے غیر معمولی تیزی سے کام نہیں کیا تھا۔ تھانیدار عاقل گوئل اور اس کا مخلص اس بات سے خبردار تھا کہ ان کے حوالا تھانہ میں پورے ایک دن بند رہنے والے میاں بیوی دو حقیقت پر تھم سیال کے ممکن پہنچتی تھے اور یہ وہ دو افراد تھے جن کی تلاش میں پولیس طویل عرصے سے ماری ماری پھر رہی تھی۔ ایک حیرت کی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ کئی دن گزرنے کے باوجود موچیل حوالدار کی بڑا سار رشکدہ کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ اس کی بلند آواز پھٹ پھٹی نالے میں پوشیدہ تھی۔ حوالدار کے بارے میں تھانہ میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اطلاع دینے بغیر نہیں گیا ہوا ہے۔

شانی، آپ زادہ کے کمرے میں بیٹھ کر وہ ان کی بیٹی تھیں۔ بھائی اکرام نیچے مردانے میں گئے ہوئے تھے۔ دونوں بیٹے ساتھ والے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ ماں باپ کی خواہش کے مطابق دونوں بیٹے تعلیم پر بہت توجہ دیتے تھے۔ چندی دنوں میں شانی انہیں بہت پسند کرنے لگی تھی۔ شانی، آپ زادہ کے پاس بیٹھ گئی۔ آپ زادہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پھر الماری کھولی۔ الماری کے ایک خانے میں سے انہوں نے وہی سکول بیک نکالا جو یہاں بیٹھتے ہوئے سر کے پاس نظر آ رہا تھا۔ شانی کے سامنے بیک کو کھولتے ہوئے آپ زادہ آہستہ آہستہ کہیں اور ہو گئیں۔ "شانی! ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اپنے پاس سنبھال لو۔"

”کیا ہے آیا؟“

”گھنے ہیں۔ کچھ میری شادی کے اور کچھ رستم کی شادی کے، جو پتا نہیں کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔“

آپوزا دہ نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ سونے کا ایک جزا اور چار کڑے اور دو خوبصورت جیسے کھل لائے۔ یہ ایک مکمل سیٹ تھا۔ اس سیٹ کے علاوہ دو تین انگوٹھیاں اور بخشی وغیرہ بھی تھیں۔ وہ یہ زیور شانی کو دکھانے ہوئے بولیں۔ ”یہ میں نے بڑے چاہ سے رستم کی دوستی کے لئے بنوائے تھے۔ اس کے علاوہ کئی جوڑے کپڑوں کے بھی تھے۔ میں ان چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی، بار بار دیکھتی تھی۔ مجھے ان بے جان چیزوں میں رستم کی دوستی کی

خوشبو آتی تھی۔ دو دو پہنی جو میر نے ابھی دیکھی بھی نہیں تھی لیکن جس کا ارہم نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا تھا۔“

شانی نے خوبصورت زیوروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "آپ کی تمنا ضرور پوری ہوگی آپ!..... ایک نہ ایک دن یہ گھنے آپ کے بھائی کی دوہنی ضرور پہنے گی۔"

”چنانچہ میں وہ دو رنگ اب آئے گا۔ اب تو سب چہلو اچھے سے میں دوتا جا رہا ہوں۔“
 جس دن ڈے ڈے کے لڑائی میں ڈینی براؤن نے دست پر بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کی ایک ناک کا ٹکڑا کٹ
 دی تھی۔ کچھ کہتے ہیں کہ دونوں ناکیں..... اور..... کچھ کہتے ہیں کہ عام لڑائی کے وقت وہ
 بندھا ہوا تھا۔ اور گولیوں سے چھانی ہو گیا تھا۔“ آخری الفاظ لکھتے کہتے آچہ زہد کی آواز
 بیٹھنے لگی۔ آئسوگر نے گلے۔

”یہ سب باتیں ہیں۔۔۔ ان میں شوت کہیں نہیں۔ میں بھی اخباروں میں اس بارے میں پڑھتی رہی ہوں۔“

”لیکن یہ تو سچ ہے جاں کہو میرے کی لڑائی میں بہت سی لائیں سڑ کر سوا ہو گئی ہیں۔ مگر پتا کس کس ماں کا پتھر اور کس کس بہن کا بھائی مرا تھا۔“

”ہاں۔ یہ تو کچھ چاہئیں۔“ شانی نے کہا۔

آپ زائدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے زیور شانی کے حوالے کر دیے اور اسے کہا کہ عارضی طور پر انہیں سنبھال لے۔

شانی کچھ دیر تک آپ زادہ کے پاس بیٹھ کر اور زہرا میں دوا لیک کے کراہنے لگے۔
میں دوا پس آگئی۔ دو بھی رسم کے لئے اتنی ہی کبھی تھی جتنی آپ زادہ دیکھی تھیں، لیکن آپ زادہ
خیال تھا کہ رسم دے دے کے آپ زادہ کی مہم ہو جائے جب کہ شانی بے بات جانتی تھی کہ دے
ڈیرے کے "اٹنی" کے بعد بھی کئی دیا تک رسم بیٹا جائے گا تھا۔ اس دوران میں اس کی زندگی
سب سے بڑی خواہش میں پھری ہوئی۔ اس نے شانی سے شادی کی تھی۔ اس کے ساتھ
حسین شامیں آگئی اور بصورت راتیں اور دوپہر تک نہیں گزاری تھیں۔ یہ زندگی کا وہ دیا گھر جو
جس پر کئی زندگیوں قربان کی جا چکی تھیں۔ اور پھر ایک صبح دوپہر دو ساتھیوں کے ساتھ
کے تارے کی طرح اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کی گمشدگی اب تک بے نام و نشان تھی۔
خوبل قاسم راکب خان کے پاس سے چند نشانیاں لی تھیں، دو بھی فی الوقت بے معنی ہی

کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ اس نے دروازے کو اندر سے کھڑی لکائی۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اپنا ہڈا کھول کر منتشر بنال سوارے۔ الماری میں سے ایک سرخ کادار اودھنی نکالی اور اپنے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ زیر پینٹنگ لگی جن کے بارے میں آپوزا بدو نے بتایا تھا کہ وہ رستم کی دلہن کے ہیں۔ یہ زیر پینٹنگ ہوئے اسے عجیب سی خوشی اور راحت کا احساس ہوا۔ ایک محبت بھری لہر اس کے دگ وہ پے میں جاگ اٹھی۔ وہ جیسے اپنے جسم کی خوشبو سے ہی مگی ہوئی۔ اس نے سرخ اودھنی اپنے سر پر درست کی تو اسے لگا کہ وہ دلہن کی طرح رستم کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ اسے مسکرائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ ستر پر نیم دراز ہو کر اپنے ارد گرد رستم کی موجودگی کو محسوس کرنے لگی۔ اس کے منہ کو کما مہربان انداز۔ اس کی مہکتی ہوئی سانس۔ اس کی محبت بھری احتیاط جیسے وہ کاغذ کا جسم رکھتی ہو اور دوسری ہے پروائی سے ٹوٹ سکتی ہو۔

اجانک نئے کی آواز نے شانی کو بھولے ہرے سپنوں کی دنیا سے باہر نکالا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ "آئی سنے۔" اس نے کہا۔ شاد دروازے پر تھا۔

وہ جلدی جلدی اپنے زیر اترارے لگی۔ درمنا ایسا تھا کہ سوالات پوچھ پوچھ کر اس ناک میں دم کر دیتا۔

زیر دروازہ الماری میں سنبھل کر اور اسے لاک کر کے وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈولا کھڑا تھا۔ اس نے نئے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بچے نے دوسرے بچے کو اٹھا رکھا ہے۔ "بائی جی! یہ بہت خند کرتا ہے۔ مجھے تھوڑا سا ناگوار میرے اوپر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ کمرے میں چکر لگاتے جاؤ۔ میرے تو اب گھڑے چھل گئے ہیں۔"

"اوسے، یہ کیا بد تیزی ہے؟" شانی نے نئے کو ڈانٹا۔

"انگل خود کہتے تھے کہ میں گھولا (گھوڑا) ہوں۔" نئے نے وضاحت کی۔

ڈولا ہنسنے لگا۔ "بائی جی! یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ یہ مجھے تھوڑی بکھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ گورت نہیں مرد ہوں۔ اگر مجھے کہنا ہی ہے تو پھر گھوڑا کہو۔ بس میرے اتنا کہنے کی دیکھی کہ یہ میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔"

"پھر گھوڑا بہت قصور تہا را بھی ہے۔" شانی مسکرائی۔

اسی دوران میں ڈولا چونک گیا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانی نے کہا۔ "کیا بات ہے، تم نے تو کئی گھڑے ہی کی طرح کان

جانے شروع کر دیئے ہیں۔"

ڈولا بولا۔ "مجھے سواری ہو آری ہے۔ لگتا ہے کہ خان بھائی تعریف لارہے ہیں۔"

"واقعی؟" شانی خوش ہو کر بولی۔

ڈولے نے زبانت میں سر ہلایا اور تیزی سے حویلی کے بیرونی چھانک کی طرف بھاگ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد وہ وہاں آیا۔ اصل خان واقعی اس کے ہمراہ تھا۔ "تم کدھے کے سر سے نیگنوں کی طرح کہاں غائب ہو جاتے ہو؟" شانی نے کہا۔

"خود، ام نے پرسوں ہی تو فون کیا تھا آپ کو۔"

"وہ تو تحیک ہے لیکن تمہارا ذاتی طور پر یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔"

"بس ام آگیا ہے۔ اب کہاں جاتا ہے ام نے۔"

"اچھا، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے پھر نسوار کھائی ہے؟" شانی نے کڑے تہور سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں اب تو ام نسوار اور گریت کے پاس سے بھی نہیں گزرتا۔"

"پاس سے گزرنے کو کون منع کرتا ہے۔ میں تو استعمال سے منع کر رہی ہوں اور ابھی ڈولے نے تمہاری آمد کا اعلان سواری کو سونگئے کے بعد کیا ہے۔۔۔ اور اب تو مجھے بھی ملکی ملکی ہو آری ہے۔"

اصل کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ پہلے شاید اس نے صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر پھر غائبی سے سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اس سے شانی کا بیان بھی چھوٹا پڑتا تھا۔ اس نے کھنکھار کر کھنکھار صاف کیا اور بولا۔ "وہیے سچا بات ہے کہ ام کو بھی منہ میں تھوڑا تھوڑا نسوار کا ذائقہ معلوم ہو رہا ہے۔ دراصل ام کل لاہور میں تھا اور وہاں اپنے ایک دوست شیر گل کے پاس اس کے ڈک کا ڈے ہو رہا تھا۔ دو تین اور دوست بھی موجود تھا۔ ام تو جلدی سو گیا لیکن وہ دیر تک وہی آہ پر غم دیکھتا رہا۔ ام کو لگا ہے کہ ان میں سے ہی کسی نے غم دیکھتے ہوئے امار سے منہ کے اندر نسوار رکھ دیا۔"

"امیر خیال ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی نے سو تے میں ہی تمہاری جیب کے اندر نسواری چھپائی سی دیا بھی رکھ دی ہوگی؟"

"ڈی!۔۔۔ اصل نے گزیرا کر کہا پھر اپنی جھینٹیں ٹولیں۔ بھلی جیب میں ڈیبا کی موجودگی صاف محسوس ہوئی۔ اصل تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا۔ "شانی بہن، آپ نے تو کمال کا دماغ پایا ہے۔ بالکل کسی نجی کے مابین (واقعی) مجھے بھی اس طرف سے نسوار کا تھوڑا سا

”اجمل انسان بن جاؤ۔ ورنہ بڑی لڑائی ہوگی میری اور تمہاری۔“ شانی نے اسے تیز دکھائے پھر ذرا سوچ کر بولی۔ ”اور مجھے لگتا ہے کہ ابھی تمہارے دماغ شریف سے نسوار والا خناس ٹھنک نہیں رہا۔ دیکھو، ابھی تم نے نسوار کو مے کے لئے خوشبو کا لفظ بولا ہے۔ بولا ہے کہ نہیں؟“

”شانسی بہن! آپ نے واقعی بہت کمال کا دماغ پایا ہے۔ آپ بات کو ایک دم کچک کر تا ہے۔ اس دن بھی آپ نے کمال کر دیا تھا جب آپ۔۔۔“

”اجمل خان۔۔۔ بات کو گھماؤ پھراؤ مت۔“ شانی نے آنکھیں نکالیں۔ ”مجھے بتاؤ تم نے نسوار کہا کیسی تھی یا نہیں؟“

اجمل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ جب کسی وقت بہت زیادہ طلب ہو تو ایک ہنگامی رکھ لیا کرو۔ ام دو تین دن سے بہت پریشان تھا۔ رات کو دیر تک نیند نہیں آتا تھا۔ رستم بھائی کا خیال امارہ سے دماغ سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ آخر وہ ام کو کیوں نہیں ملتا۔ کیوں ام پہ بس ہوتا جا رہا ہے۔ کیا آہستہ آہستہ یہ ہو گا کہ تم کب بارکر بیٹھ جاؤ گے۔ یہ سمجھ لے گا کہ رستم بھائی اور ناصر بھائی کے ساتھ امارہ اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔۔۔ اس نے چند لمبے وقفے کیا اور میری سانس لے کر بولا۔ ”میں شانی بہن! ایسا نہیں ہو گا۔ ام خود سے ایک عہد کر کے آیا ہے اور وہ یہ کہ جب تک رستم اور ناصر بھائی کا سراغ نہیں ملتا، ام اپنے گھر والوں کا منہ نہیں دیکھے گا۔ ام اپنے دو سائیکلوں کے ہمراہ اسکر دو اور چیلپاس کی طرف نکل جائے گا۔ ان برخوں میں اس وقت تک حکومت رہے گا جب تک ام مر نہ جائے یا ام کو رستم بھائی کا کھونچ نہ مل جائے اور ام کو یقین ہے کہ امارہ کو کوشش ضرور کامیاب ہو گا۔ کیونکہ اب امارہ سے پاس وہ نشانیاں بھی ہیں جو راکب خان سے ملا ہے۔ وہ چیزیں امارہ دکرے گا۔“

”آپ ٹھیکہ کہتے ہیں خان بھائی۔“ ڈولے نے تائید کی۔ ”وہ چیزیں تلاش میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔“

”وہ چیزیں کہاں ہیں شانی بہن؟“ اجمل نے پوچھا۔

شانسی دوبارہ امارہ کی طرف گئی اور لاگ کھول کر ایک دروازے میں سے دو ساری اشیاء نکالیں جو راکب سے دستیاب ہوئی تھیں۔ راکب خان کے گھر سے اترنے والا تعویذ جو تانبے کی چھوٹی تختی کی صورت میں تھا۔ اس میں ایک طرف کسی درخت کی شبیہ کندہ تھی۔ دوسری جانب پتے پتے ہوئے تھے جو صاف طور پر سب گندل کے پتے تھے۔ اس تعویذ سے

یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ گورے کے ہنگامے پر جو کچھ ہوا وہ کسی نہ کسی طور ناپاب پودے سب گندل سے متعلق تھا۔ راکب کی جینٹ میں سے کچھ پاکستانی اور چائیز کرنسی ملی تھی۔ یہ چائیز کرنسی بھی شمالی علاقہ جات کے ایک خاص رخ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ راکب کی بیبوں سے کچھ گھسے ہوئے گول پتھر برآمد ہوئے تھے۔ یہ غالباً برکت اور دافع بلیات کے طور پر رکھے گئے تھے۔

شانسی نے کہا۔ ”میرے خیال میں ان سب چیزوں میں سے زیادہ اہم یہ لکھا ہوا کاغذ ہے۔ میں نے ایک دو لوگوں سے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی درجنوں زبانیں کوہ قراقرم اور چین کی سرحد کے ساتھ کے علاقوں میں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ اگر مقامی زبانوں کے کسی ماہر سے اسے پڑھوایا جائے تو امید کی کرن پیدا ہو سکتی ہے۔“

ڈولے نے تانبے کی تختی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے یہ کوئی ایسا درخت ہے جسے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس علاقے میں اس کی پوجا کی جاتی ہو۔ ہمارے دور دراز علاقوں میں کئی ایسی قبیلے ہیں جو غیر مسلم ہیں اور سبے جان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔“

”اسی طرح وہاں سب گندل کو بھی مقدس جڑی بوٹی کا درجہ دیا جاتا ہو گا۔ گورے کے ہنگامے میں ان لوگوں کو موت کی سزا دی گئی جو اس جڑی بوٹی کا کاروبار یا استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔“ شانی نے کہا۔

اجمل نے شانی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ ہمیشہ امارہ سے دیر سے آنے پر شکوہ فرماتا ہے (فرماتا ہے) لیکن امارہ سے دیر سے آنے کا کوئی نہ کوئی وجہ ہوتا ہے۔ اس بار کی ایک وجہ تو وہ موہیل والد امارہ تھا۔ اس کا نام شاہو دین ہے۔ ام نے اسے نکالنے لگا تھا۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ شانی نے اسے گھورا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ سے ام وعدہ غلافی نہیں کر سکتا۔ ٹھکانے لگانے سے امارا مطلب یہ ہے کہ اسے کسی ایسی جگہ ٹھکانا تھا جہاں پر وہ وحالی مینے آرام سے نسوار کا کر اور گنجائی کرنا پناہ داشت کر دے۔ یہ کام کرنے کے بعد ام نے ایک اور کام کیا اور آپ کو اس کام پر بھی امارہ تقرر کرنا پڑے گا۔“

”بتاؤ تو تعریف بھی کریں گے۔“ شانی نے کہا۔

”اچھے کام کے بعد تو اس کی تحریب ہو کر بیٹھ کر رہا ہے۔ مزہ تو تب ہے جی کہ اچھے کام کا ذکر سننے سے پہلے ہی اس کا تعریب کر دیا جھگڑے۔ امارہ نے وہابی بیٹھ ایسا کیا کرتے تھے۔ اس کا ان کو بہت پانہ ہو جاتا تھا۔ آپ کو پتا ہے کہ انگریز بہت خوشامد پسند ہے۔ بس دادا

صیب کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسی عادت سے نقصان ہوا۔ جب امارا دادی صیب بہت بیمار تھا، دادا جی کے منہ سے نکل گیا۔ آپ نے ہر کام بڑے اچھے طریقے سے کیا ہے۔ اب دیکھیں آپ پوت (فوت) بھی کتنے خوبصورت طریقے سے ہو رہے۔ کہیں کوئی شور شرابا نہیں۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ آپ بھی عورت کا جانا اتنی سہولت سے لٹکے گا۔ بس اسی بات پر امارا دادی صاحبہ کو تازہ آگیا اور وہ اندھ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے دادا صیب کے مرنے تک اپنے پوت ہونے کا سوچا بھی نہیں۔

شانی دھیان سے اہمصل کو کچھ دیکھ رہی تھی۔ "اہمصل! کبھی تو لگتا ہے کہ تم بہری شخصیت کے مالک ہو۔ وہ شخص مومن اور ہے جو اوت پانگ پانگ سے اور لطیفہ شانتا ہے۔ وہ اور ہے جو رائل پانگسٹول اٹھاتا ہے اور بڑی درندگی سے اپنے کرلیوں کو کھنکھرتا ہے۔ پانگسٹم نے جان بوجھ کر خود کو اپنے ہاتھ رکھا ہے یا تم ہو ہی ایسے۔"

"نہیں جی! ام ہے ہی ایسا۔ امارا والدہ بتاتا ہے، دراصل جب ام پیدا ہونے والا تھا تو انہوں نے بہت ساموگ پھلکی کھا کر اوپر سے گلے کا رس لیا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا گلے کا رس بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ امارا والدہ گرم سرد ہو گیا۔ ام بھی گرم سرد ہو گیا۔ آپ کو سن کر بڑا حیرانی ہوگا۔ جب ام پیدا ہوا تو ام نے کچھ کھایا یا نہیں۔ امارے منہ میں پورے تین دن تک ایک چیز کے سوا کچھ نہیں گیا۔ پتہ ہے وہ چیز کیا تھا؟"

"نسوار! ڈو لے نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں، مونگ پھلی کا تیل..... مونگ پھلی کا تیل کا خوش۔ ام کو ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ اب بھی ام کہیں اچھی کوئی کا مونگ پھلی دیکھتے تو ایک دم تھراں ہو جاتا ہے۔ جب ام پیدا ہوا تو ام میں ایک خاص بات تھا۔ ام رات کو بائبل ٹھیک ربتا تھا۔ جب کبھی تھکا لیکن دن میں بھیگتا ہوا تھا اور بہت تنگ کرتا تھا۔ یہ سب اسی گرمی سردی کی وجہ سے تھا۔ آہستہ آہستہ امارا والدہ نے دن کے وقت نسوار اور رات کو جاننا شروع کر دیا۔ بائبل چرکیداروں کی طرح۔ بہت دن تک ہماری والدہ نے کسی کو پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ ام دن کے وقت بھیگتا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ بچوں کا خوشنوا زیادہ دیر تک چھپا یا نہیں جاسکتا، امارا نسبتی میں بھی لوگوں کو بہت جلد پتا چل گیا کہ ام دن کے وقت بھیگتا ہو جاتا ہے۔ امارے نا کے گاؤں میں ایک بہت پیچھا ہوٹل تھا۔ اس نے میرے والد سے کہا..... یہ بچے آگے چل کر بہت نام پیدا کرے گا لیکن اس کے لئے اپنے دل کو توڑنا سنا سخت کر کے ایک کام کرنا پڑے گا۔ مرے والد نے پوچھا، کیا کام؟ ملنگ نہ کیا۔ اس بچے کو مار کر پھاڑی چوٹی پر دھن

کرنا پڑے گا۔ اس کے حمار کا بہت شہرت ہوگا۔ لوگ دور دراز سے منتیں مانگتے اور چر حواے کے لئے آئے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟" ڈو لے نے مصنوعی تجسس سے پوچھا۔

"ہوتا کیا تھا۔ وہی ٹرینک اسٹوری..... وہی دیکھا کرنے والا اینڈ۔ ام کو زندہ رہنے دیا۔ نہ صرف زندہ رہنے دیا گیا بلکہ بعد میں پولیس میں بھی بھرتی کر دیا گیا۔"

"ہاں خان بھائی! آپ پولیس میں کیسے بھرتی ہو گیا؟" ڈو لے نے پوچھا۔

"دراصل ام بڑا ہونے کے بعد بھی بارہ دو سال تک بھیگتا ہی رہا لیکن عجیب بات تھا کہ امارا نشانت بہت اچھا تھا۔ ام نے جس چیز کو کوئی مارا ہوتا تھا اس سے تین انچ نیچے کا نشانت لیتا تھا اور امارا نشانت بھی نہیں ٹھوکا۔ پھر ایک مرتبہ ام کو ناچا کڈ بھار ہوا۔ جب ام بھار سے صحت یاب ہوا تو امارا بھیگتا پن بائبل ٹھیک ہو چکا تھا لیکن نشانت بائبل خراب..... ام بہت دکھی ہوا۔ رمضان شریپ کی سٹائیسویں رات کو ام نے رو رو کر اللہ میاں سے دعا مانگا کہ ام پھر سے بھیگنا ہو جائے لیکن امارا نشانت ٹھیک رہے۔ امارا ماں نے ام کو یہ دعا مانگتے ہوئے سن لیا۔ انہوں نے مصلے پر ہی ام کو کئی تھپتھپا دیا اور کہا..... اللہ ہی خوار..... میں نے مصلے پر وہ کر تیری آنکھیں ٹھیک کر لیا ہے۔ اب ڈو دھما دھما مانگ مانگ کر انہیں پھر سے خراب کرے..... اس دن انہوں نے ایک بڑا یادگار بات کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا..... اللہ تعالیٰ کا خزانہ بے شمار ہے اور بہت بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کھلے دل کے ساتھ مانگتے ہیں۔ مانگتے ہوئے شریٹس نہیں رکھتے۔ پھر جی امی نے دوسرے طریقے سے دعا مانگا۔ تین چار مینے بعد امارا نشانت بھی ویسے کا ویسا ہو گیا جیسے پہلے تھا۔ پولیس میں امارا بھرتی کی وجہ بھی امارا نشانت ہی بنا۔"

شانی نے کہا..... "اہمصل! یہ بڑی نڈا لیا کرو۔ جو کچھ تم نے اب تک کہا ہے اس میں سے دس پندرہ فیصد ہی سچ ہوگا۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم صرف کام کی بات کرو۔ ایک کام تو تم نے یہ کیا ہے کہ خواہ اللہ ارشاد ہو کہ میں کوئی خوشنوا ٹھکانا ہے پر چھوڑ آئے ہو دوسرا کارنامہ کیا ہے؟"

شانی کا سنجیدہ موڈ دیکھ کر اہمصل خان بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے چند سینکڑ کی خاموشی اختیار کی۔ پھر غصہ سے ہونے لگا اور بولا..... "وہاں ایٹ آباد میں رحیم اللہ نام کا ایک بندہ ہے۔ اس کا عمر ساٹھ ستر سال کے قریب ہے۔ وہ جوانی میں کانڈ کا کام کرتا تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور آٹھ بڑی بھی بول لیتا تھا اسی لئے جہان، دھیمیل سیف الملوک اور چیلاس وغیرہ کی طرف جانے والا غیر ملکی لوگ رحیم اللہ کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان علاقوں کے بارے میں رحیم

اللہ کا تجربہ اور معلومات اتنا زیادہ تھا کہ رحم اللہ کے لئے باقاعدہ ایڈوانس بینک ہوتا تھا۔ اب وہ کاپی بوز صاحبے لیکن پھر بھی مزید اربندہ ہے۔ ام پانچ بیہودن پہلے خانہ طور پر اس سے ملنے کے لئے ایبٹ آباد کیا تھا۔ وہ ایک اچھا پٹو گراہی بھی ہے۔ آج کل اس نے ایبٹ آباد میں پٹو گراہی کا دکان کھولا ہوا ہے۔ رحم اللہ سے امارا کاپی لبا چڑا بات ہوا ہے۔ آپ سننا پسند پر ماسے گا۔

”اس میں سے جو کام کی باتیں ہیں وہ بتا دو تو زیادہ اچھا ہے۔“ شانی نے کہا۔

”نیاب پودے سے سب کنڈل کے بارے میں رحم اللہ بھی کاپی کچھ جانتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ یہ پودا سرد ترین پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ ٹراؤٹ جمبلی کی طرح اس پودے کو بھی سرد ترین موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ رحم اللہ کا کہنا ہے کہ اسکردو اور کے ٹو پہاڑ کے درمیانی علاقے میں ہی کہیں وہ جگہ ہے جہاں قدرتی طور پر یہ پودا آتا ہے۔ ام یہ کہہ سکتے ہیں کہ چار چھ پہاڑ ہیں جہاں یہ پودا قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ قریباً چھ سات سال پہلے انگلینڈ سے تین لوگ آئے تھا۔ وہ اسی پودے کی تلاش میں تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے وہ وہاں کے افراد کی تلاش میں تھا جو ان سے پہلے اس پودے کی تلاش میں یہاں پہنچے تھے اور لاپتا ہو گئے تھے۔ رحم اللہ کا کہنا ہے کہ وہ ان تین انگریزوں کا گائیڈ بن کر اسکردو کی طرف گیا تھا۔ یہ جون جولائی کے دن تھے۔ وہ قریباً دو ماہ تک ان پرچوں (برٹوں) میں آوارہ گردی کرتے رہے تھے۔ انہوں نے شکار بھی کھلیا اور بہت سا یادگار پٹو بھی آجاتا تھا لیکن ان کا اصل مقصد پورا نہیں ہوا۔ انہیں ایک دو کنج بھی ملا جن سے انہیں اندازہ ہوا کہ انہیں کے ٹو پہاڑ کے ”تیس کپ“ کی طرح جانا چاہیے لیکن پھر بڑی ہو گیا۔“

”کیا ہوا؟“

”ایک حادثہ۔ نیم کے چار لوگوں میں سے دو برپ کے ریلے میں دب گیا۔ آپ شاہ جانتے ہوگا، برپ کے ریلے کو ”ایو الائی“ بھی کہا جاتا ہے۔ بہت بار برپ پہاڑ کے اوپر سے طوفان کی طرح ہوتا ہوا آتا ہے اور بہت جگہ ملبا میت کرتا ہے۔“

”میم کے لوگ بچ گئے؟“ شانی نے پوچھا۔

”ہاں بچ گئے لیکن ان میں سے ایک شخص کا دونوں ٹانگیں ٹوٹ گیا۔ دوسرا بھی زخمی ہوا۔ ان لوگوں کو اپنا ہم ادھر اچھوڑ کر واپس آتا ہوا۔ ام نے آپ کو بتایا ہے ان سے کوئی ساہو سنا پہلے کیا بات ہے۔ اس سیر کا سامرا دو روزہ جسم بھلنے اپنی دوازی میں بھی لکھ رکھا ہے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ رحم اللہ تمہارے ساتھ اسکردو کی طرف جانے کو حجام

ہو جائے گا؟“ شانی نے پوچھا۔

”ضرور ہو جائے گا۔ جی۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود وہ عمر رسیدہ نظر نہیں آتا۔ وہ بڑا سخت جان ہے جی۔ ہاں اس کا مالی حالت زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اگر اس کام میں اس کو تھوڑا سا مالی پانچہ بھی نظر آجائے گا تو اس کا ارادہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ وہ بہت اچھا بندہ ہے شانی لیکن۔“

شانسی کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اجمل تم بتا رہے ہو کہ ایو الائی والا مادہ ہونے سے پہلے ان لوگوں کو تھوڑے بہت کھونٹے تھے۔ وہ کیا تھے؟“

”ان میں سے ایک کھونٹ تو یہی ہے جو ام کو راکب خان سے بھی ملا ہے۔“ اجمل نے تانے کی سختی والا تعویذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”اس سختی پر درخت کا تصویر بنا ہوا ہے۔ ام کو یقین ہے یہ وہی درخت ہے جس کا ذکر ام سے ایبٹ آباد میں رحم اللہ نے بھی کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کے ٹو کی طرف جانے والے دشوار پہاڑوں میں کہیں کسی جگہ تھوڑی تعداد میں ایسا لوگ بھی رہتا ہے جو درخت کی پوجا کرتا ہے۔ اس درخت کو شاید ایک نام دیا جاتا ہے۔ یہ بہت کڑھم کا ذہنی لوگ ہے۔ یہی وہ بک ہے جہاں سب کنڈل نام کا بوٹی بھی پایا جاتا ہے۔ وہ سکتا ہے کہ وہاں اس بوٹی کو کسی اور نام سے پکارا جاتا ہو۔ جیسے راکب خان اس کو کسی کے نام سے پکارتا تھا۔“

شانسی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ راکب خان کی تاہمائی موت کے باوجود ابھی امید کی کر میں جاتی ہیں۔“

”کر میں نہیں شانی لیکن۔ پورا رواج یہی ہے۔ امارا دل کہتا ہے کہ کام بہت جلد آپ کو کوئی خوشخبری لا کر دے سکتا ہے۔ ام کو بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے اور ان دعاؤں کے لئے ضروری ہے کہ ام جہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ہر قدرت اللہ کو کسی ایجنے سے قبرستان میں پہنچا دے۔“

”قبرستان۔ کیا مطلب؟“

”قبرستان کا مطلب قبرستان ہی ہوتا ہے جی جہاں بڑی اچھی اچھی قبریں بنا ہوتا ہے۔ یہی بس قضا میں۔۔۔ اور ان کے اوپر بڑا اچھا اچھا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ ام چاہتا ہے کہ اب قدرت اللہ وہاں آرام پر مائے کار مارا لیکن اس کی دشمنی سے بے ظور ہو سکے۔“

”اجمل۔۔۔ تم نے پھر وہی پانچ شروع کر دی۔“

کو کچھ اور بھی سنجیدہ بلکہ تعین بنارہے تھے۔

”چمنٹے جاؤ جی رانی“۔ تایا معصوم نے ہماری آواز میں کہا۔

شانی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بزرگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر شانی کے ماموں قمر رسیدہ چوہدری یعقوب نے کہنا شروع کیا۔ ”شانی بڑا اچھا لڑکا اور شاد دلی آدمی ہے۔ اس کے بعد ہم سب پر تیری ذمہ داری آتی ہے۔ ویسے تو خود بہت بھلا دار ہے اور اپنا اچھا بھلا سمجھتی ہے لیکن کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جو بزرگوں کو ہی طے کرنے پڑتے ہیں۔“

تعمید نے شانی کو سمجھا دیا کہ بات کس رخ پر جاری ہے۔ اس کے ساموں سے پینہ بہہ لگا۔ اس کی پچھلی جس اس کی دونوں سے آگاہ کر رہی تھی کہ خاندان کی طرف سے اس پر بہت زیادہ دباؤ پڑنے والا ہے۔ یہ دباؤ اس کی شادی کی طرف سے تھا۔ ماموں یعقوب جب ایک لمبی تمہید باندھ چکے تو غواخواہی کرنے لگا۔ ”میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کروں گا۔ بس یہی کہوں گا کہ شانی بیٹی، عادل اور سجاد کے بعد اس حویلی کی اکیلی وارث ہے۔ تیرے کاندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک ذمہ داری ہماری عزت کی حفاظت بھی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

تایا معصوم نے ساکون کا بنا ہوا ایک پرانا خاندانی کپس کھولا اور اس میں سے سونے کا ایک بڑا پار نکالا۔ اس میں کئی لڑیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سبز بیروں کے علاوہ اس میں سونے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے سکے بھی جڑے ہوئے تھے جو غالباً افغانی تھے۔ تایا معصوم نے کہا۔ ”خاندان کی پرانی روایت کے مطابق یہ پار گھرانے کی وہی نوہ (بڑی بہو) کو دیا جاتا ہے۔ اب وہی یا چھوٹی کوئی نومو جو ہمیں ہے اس لئے یہ پار تیری طرف آئے گا اور اسے تو سپنہ گئی۔ اس کا یوں اس ذمہ میں پڑا رہنا ایک بہت بُرا نشان ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ نشان ختم ہو جائے۔“

تایا معصوم نے بار شانی کی طرف بڑھایا اور اس نے پکڑ لیا۔ ماموں یعقوب نے متفحص جتنے کی طویل نے کومتہ کو دباتے ہوئے کہا۔ ”اور شانی بڑا بڑا اچھی طرح جانتی ہوگی کہ اس پار کو پہننے کے لئے سہاگن ہونا بہت ضروری ہے۔“

شانی کو یوں لگا کہ یہ وزنی پار ایک دم بہت زیادہ وزنی ہو گیا ہے۔ اتنا وزنی کرا سے سنبھالنے ہوئے اس کا چوراہم کا پتہ لگا ہے۔

ماموں یعقوب بولے۔ ”تو بڑی سیانی دھی رانی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تجھے زیادہ سمجھانے بھاننے کی کوئی نہیں۔ نہ ہی ہم نے ابھی کوئی رشید ڈھونڈا ہے۔ نہ ہی ہم تجھے کسی

خاص جگہ پر شادی کے لئے مجبور کریں گے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ تیری شادی ہو جائے۔ اور یہ شادی ایسی ہو کہ تجھے حویلی سے جانا نہ پڑے۔“

شانی کا گلا خشک ہو گیا۔ برادری کے سب سے معزز افراد اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ہر کوئی اس کے لئے قابلِ صدا احترام تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، بہت حد تک سچ ہے۔ لیکن۔۔۔

اس ”لیکن“ سے آگے کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ روایت بہتی کے اس پھولوں سے لدے ہوئے خوبصورت مکان کا احوال یہاں اہمل، عارف، حاجی حیات اور ڈولے کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا اور وہ بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف یہی افراد جانتے تھے کہ شانی ایک سال پہلے رستم کی دلہن بن چکی ہے۔ بار بدستور شانی کے ہاتھ میں تھا۔ اپنی اضطراری کیفیت میں شانی نے بار کو زور سے بچھپنا تو ایک ٹوک انگلی کی پر میں گھس گئی۔ خون کے قطرے اٹھیلی پر پڑ گئے تھے۔

اس کے دل نے تپ کر کہا۔ ”کہاں ہو تم؟ دیکھو مجھے کس طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اب بھی نہ آؤ گے تو پھر کب آؤ گے؟ کہاں ہو تم؟“۔ پھر جاں بلب راکب خان کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس بازگشت نے اسے سر پاپٹنے میں نہلا دیا۔

☆ ===== ☆

رستم کو فوراً اس کی ہدایت یاد آگئی۔ کچھلی ملاقات میں وہ اس نے اس کو بتایا تھا کہ ان تینوں کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ گولی چلانے کے سلسلے میں آجمنائی جانسن کا نام لے دیں۔

رستم نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”گولی جانسن نے چلائی تھی۔ دوسرے شخص پر میں نے گولی چلائی تھی لیکن وہ صرف زخمی ہوا۔“

”اور چوتھ کس نے لگائی تھی؟“ روات نے پوچھا۔

رستم کے بولنے سے پہلے ہی وہ اس نے اسے آنکھوں سے اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں دوبارہ جانسن کا نام لے۔ رستم نے اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔

”جانسن سے تم تینوں کا رابطہ کیسے ہوا اور اس کا روانی کے لئے تم نے جتنی کار کہاں سے لے؟“ روات نے تحقیقی انداز میں پوچھا۔

اس کا جواب رستم نے پہلے سے سوچ کر تھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم نے جانسن سے نہیں، جانسن نے ہم سے رابطہ کیا تھا اور ہتھیاروں کے بار ہمیں شاید آپ بھول رہے ہیں۔ یہ ہمیں برقی جان نے ہی دیئے تھے۔“

رستم کے اس جواب پر روات کے چہرے پر حیرت، سراہت ابھری۔ ”ملک برقی جان نے یہ ہتھیار تمہیں فرار ہونے کے لئے کس دینے دیئے۔ اس سے دینے تھے کہ تم ہمارے شانے سے شانہ ملا کر شوقم خان کے ساتھیوں سے رومے میں وقت پر تعداد کی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔“

رستم نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہماری یہاں کسی سے کوئی لڑائی نہیں۔ ہماری لڑائی صرف اپنی ”قید“ سے ہے۔ ہم یہاں بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہم اپنے بال بچوں میں داپس جانا چاہتے ہیں۔“

رستم کا جواب کافی سخت تھا۔ معلوم نہیں کہ مترجم وہ اس نے اس میں کسی طرح کا رد بدل کیا یا نہیں۔ بہر حال روات کے رویے میں کوئی خفیہ فرق نظر نہیں آیا۔

”کنوں کو گولی کس نے ماری؟“ روات نے اس کی وساطت سے پوچھا۔

”ایک کو جانسن نے دوسرے کو ایک گولی جانسن کی اور دوسری میری لگی تھی۔“

”گھاری زری تہارے ساتھ کیسے چل رہی تھی۔ کیا تمہارا اسے ساتھ لے جانے کا منصوبہ پہلے سے تھا؟“ روات نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ آپ خود جانتے ہیں۔ وہ بالکل سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اسے بھلا کسی

وہ اس جاں لیوا برف زار میں تھا۔ اس کی کوفڑی بہت ہی مختصر تھی۔ بس مشکل سے چہ ضرب چھ فٹ کی۔ وہ اس مختصر غلا میں ٹہل رہا تھا۔ تین قدم دابیں تین قدم دابیں... پھر تین قدم دابیں... پھر دابیں... اس کے اندر وہی اضطراب تھا جو قفس میں بچہ پڑانے والے شہباز کے اندر ہوتا ہے۔ وہ ان دیواروں کو تو ڈر کر ٹکل جانا چاہتا تھا۔ اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تپس نہیں کر دینا چاہتا تھا مگر ارادہ بہت مضبوط ہونے کے باوجود عمل کی مد سے بہت دور تھا۔ یہ آہنی ہنجر وہ اسے کوئی راستہ نہیں دے رہا تھا۔

اس شام سردی معمول سے کچھ کم تھی۔ مختصر کوفڑی میں غلٹے مٹتے نہ جانے کیوں رستم کو بچپن میں ہی ہوئی ایک کہانی یاد آئے تھی۔ یہ شاید محمود بادشاہ اور کڑے کی کہانی تھی۔ کڑے ایک اندھے کنویں سے نکلنے کے لئے بار بار کوشش کرتا تھا اور کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی واپس تہ میں گر جاتا تھا۔ مگر اس کڑے نے جہت نہ ہار کر بادشاہ کو ایک یادگار سبق دیا تھا۔

ایک ایک اس آہنی تختے پر ایک آہٹ ہوئی۔ یہ آہٹ خلاف توقع تھی۔ اس سے پہلے تو بس ایک چوکور غلا میں سے ایک ہاتھ اندر آتا تھا اور اسے کھانا پہنچا کر اوٹھ جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور لائٹن کی روشنی اس تاریک غلا میں داخل ہوئی۔ دو افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک مترجم وہ اس تھا اور دوسرا گھنے سر والا ایک اوجیز عمر پانچوہ۔

مترجم وہ اس نے رکی کلمات کی ادائیگی کے بعد رستم کو بتایا۔ ”ان کا نام روات ہے۔ یہ ملک برقی جان کے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تم سے چند سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔“ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔

روات ہی شخص نے رستم سے پوچھا۔ ”ہلاک ہونے والے محافظ پر گولی کس نے چلائی تھی اور زخمی ہونے والے کے سر پر اپنی کھڑا کی چوٹ لگانے والا کون تھا؟“

منصوبے میں کسی شریک کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم یہاں سے نکلے تو وہ ازخود ہمارے ساتھ چل پڑی اور چٹ کر رہ گئی۔

”تم کہتے ہو کہ وہ منصوبے کے بغیر تمہارے ساتھ تھی مگر اس کے پاس سے اس کا سامان برآمد ہوا ہے۔ کپڑے ہیں، اس کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ یہ انتظام کس نے کیا تھا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ رستم نے کہا۔

رواٹ نے کئی انگلیوں سے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ جیسے اس حوالے سے وہ اسے بھی مشکوک سمجھتا ہو۔

اگلے دن پندرہ منٹ میں رواٹ خان نے رستم سے کرید کرید کر سوالات کئے۔ رستم مناسب جواب دیتا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ شاید ناصر سے بھی سوال جواب ہو سکے ہوں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ناصر نے کئی سوالوں کے کیا جواب دیے ہیں۔ بہر حال مشکوک کے دوران میں ہی اس نے ہوشیاری سے رستم کی نقلی کردی۔ رواٹ کے ایک سوال کے دوران میں اس نے اپنی طرف سے بھی چند الفاظ فقارے میں جوڑ دیے۔ اس نے رستم کو بتایا کہ ابھی ناصر سے پوچھ کچھ نہیں ہوئی۔ امید ہے کہ وہ اس پوچھ گچھ سے پہلے ہی ناصر سے مل لے گا اور اسے جوابات کے لئے تیار کر لے گا۔

رواٹ خان اور اس کے جانے کے بعد رستم کو امید پیدا ہوگئی کہ شاید ایک دو دن میں اسے کوٹھڑی سے نکال لیا جائے گا۔ تاہم رستم کی رہائی اس کی توقع سے کہیں پہلے عمل میں آگئی۔ یہ سب کچھ بڑے ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ رستم کے انداز سے کے مطابق رات کے آٹھ نو بجے ہوں گے۔ ایک آہنی دروازے سے باہر جھگٹے قدموں کی آواز آئی پھر بڑی جگت میں دروازہ کھولا گیا۔ اس کی گھمرائی ہوئی صورت دکھائی دی۔ اس کے عتب میں دو مسلح افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں روغن سے چلنے والی مشعل تھی۔

اس نے کہا۔ ”رستم! تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”ابھی سب کچھ بتاتے ہیں۔“ اس نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر ایک راتفل بردار سے مخاطب ہو کر ہدایت جاری کی۔ راتفل بردار تیزی سے رستم کے قریب آیا اور عجیب وضع کی لمبوتری چابی کی مدد سے رستم کی بیڑی کھول دی۔

رستم کو باہر لایا گیا۔ طویل گھاس سے نکلنے کے بعد وہ باہر کھلے آسمان کے نیچے آئے۔ آج

کئی بیٹے کے بعد رستم نے تاروں اور چاند کی روشنی دیکھی تھی اور اپنے ارد گرد آزاد فضا کا بھاء محسوس کیا تھا۔ یہ یکہ اس کی جانی بچائی تھی مگر ہرے انوکھی اور نئی لگ رہی تھی۔ موسم بہت سرد نہیں تھا اور ہوا بھی تھمی ہوئی تھی تاہم ہستی کے طول و عرض میں ایک طرح کی ہائیل صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ تین گارڈز سوار پاؤندے بھاگتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر گئے۔ رستم نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے بچے اٹھائے افراتفری میں ایک جھوپڑے سے دوسرے میں منتقل ہو رہی تھیں۔ ”کیوں پھر تو لڑائی شروع نہیں ہو رہی؟“ رستم نے اس نے پوچھا۔

”اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ نہیں، یہ اور طرح کی گز رہے۔ تہوار کے موقع پر کچھ کا کھیل بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک بڑا کچھ بنگلہ آباد کیا تھا۔ یہ کچھ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خیر خواہ کر بھاگ گیا ہے۔“

”کہاں گیا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”یہی سوال زیادہ اہم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ بد بخت سیدھا اس گودام میں گھسا ہے جہاں ہمارا انکوشن پڑا ہے۔ ڈاکٹریٹ، گولیاں، دوائی، ہم اور راکٹ لاچر بہت کچھ ہے۔ اب وہاں گولی بھی نہیں چلائی جاسکتی۔ کسی نے کسی کو گودام کے اندر گھس کر ہی اسے پکڑا یا مارا ہوگا۔“

”اور اس“ عزیزار“ کام کے لئے تم لوگوں کو میں نظر آیا ہوں۔“ رستم نے طنز کیا۔

”تم یہ کام کر سکتے ہو رستم! اگر ایک پندرہ گھنٹے میں منت میں یہ کام نہ ہو سکا تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ رچیخ اندر دھننا پھر رہا ہے۔ اس نے انکوشن والی کوئی جلیبی الا دی یا ڈاکٹریٹ کی اسٹاک کو چنایا تو پورا گودام دھماکے سے اڑ جائے گا اور ساتھ ہی آدھی سے زیادہ ہستی بھی اڑ جائے گی۔“ رستم تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہیں اس کا خاص تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر یہ سمجھتے تم نے نال دی تو تین گھنٹے کے اندر ہی جہاں جہاں کے تعلقات بہت بہتر ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی سزا بھی معاف ہو جائے۔ یہ ایک سنہری موقع ملا ہے تمہیں۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ رستم۔“

”فائدہ تو اب اٹھاؤں گا جب وہاں سے زندہ بچنے کا کوئی امکان ہوگا۔“ رستم نے خشک لبے میں کہا۔

وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ چلنے بھی جاری رہے تھے۔ ہستی میں تہوار کی آمد کے آج واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے تھے۔ جھوپڑوں اور گھر بندوں پر رنگوں سے نقش و نگار بنائے

گئے تھے۔ جا بجا رنگ برنگے جھنڈے اور جھنڈا لہرا رہی تھیں۔ کہیں کہیں مقدس درخت آجوک کے خشک تنوں کو برف میں گاڑا گیا تھا اور درخت کی شاخوں پر لائٹینیں آویزاں کی گئی تھیں۔ ان لائٹینوں کی چنیوں کو رنگ برنگ کاغذوں سے ڈھانپ کر روشنیوں کو دیدہ زیب بنایا گیا تھا۔ ایک جگہ رستم کو الپاٹن کے پھول نظر آئے اور اس کے ساتھ ہی اسے واس کی یہ بات بھی یاد آئی کہ تہوار کے موقع پر دس خوبصورت سہائیں، گرم پانی کے چھٹے میں نہاں گی اور مقدس آبِ یک پر الپاٹن کے پھول نچھاور کریں گی۔ یہ خوشی کے مناظر تھے مگر ان میں ایک منظر رستم کو بالکل چھپا کر آیا۔ اسے ایک گلی کے عین درمیان چند یاد نہ ہو مگر تین تین کرنی اور اپنا سیدہ کوئی نظر آئیں۔ برف پر پڑی ہوئی ایک نوجوان کی لاش کو چار پانی پر ڈالا جا رہا تھا۔ اور گرد کی برف لیورنگ ہو رہی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”مم۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اسے بھی رچھنے نے۔“ ڈمی کیا ہے۔“ واس نے کہا۔

”ڈمی کیا ہے؟“ وہ تو سر ہکا بے اختیار رنگ رہی ہیں۔“ رستم نے وضاحت کی۔

”شاید۔“ واس گڑبڑا کر وہ گیا۔

وہ لوگ گودام کے سامنے بیٹھے۔ تین چار بڑے بڑے سروں پر مشتمل ایک ٹھکانی عمارت تھی۔ چترلی دیواروں پر آہنی سلاخوں والی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ گودام کا مین گیٹ بڑی بھاری بھر کم لکڑی کا تھا۔ گودام کے ارد گرد وہت سے افراد جمع تھے۔ اکثر کے ہاتھوں میں لائٹینیں یا شعلیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک بات ظاہر تھی۔ یہ لوگ۔ گودام کے قریب جانے کا رسک نہیں لے رہے تھے۔ برف جان کے مسئلے کا خوف بھی۔ چنی مارکٹوں اور کھانڈیوں کے ساتھ گودام کے گرد چکراتے پھر رہے تھے۔۔۔ ان کے چکراتے میں سے بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔ گودام کے اندر بجلی روشن موجود تھی۔ یقیناً یہ لائٹینوں کی روشنی ہوگی۔ یہ بھی ایک خدشہ ناک علامت تھی۔ اگر واس کے بتول جانور واقعی بھرا ہوا تھا تو وہ کسی لائٹین کو نوچ کر بارود کے ڈھیر پر پھینک سکتا تھا اور تہوار سے پہلے ہی آتش بازی کے شاندار مظاہرے کا اہتمام کر سکتا تھا۔

اچانک ایک ہاتھ رستم کے کندھے پر آیا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ یہ برف جان تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور کچھ کہا۔ واس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”ملک کہہ رہے ہیں کہ تم جیسے مجبور نہیں کر سکتے لیکن اگر تم چاہو تو ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ہم ہستی کے گھروں کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس گولہ بارود کو بھی۔ یہ اٹالی ہمیں اس

ایمپوشن کی سخت ضرورت ہے۔ یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو شتم خان ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں یہ کام کروں گا۔“ رستم نے کہا۔ ”مجھے ہتھیار دے دیئے جائیں۔“

”آتشیں ہتھیار کا استعمال تو گودام کے اندر ہو ہی نہیں سکتا۔ تمہیں کھڑی وغیرہ دے دیتے ہیں۔“ واس نے کہا۔ ”تمہیں اس جانور سے ٹھنسنے کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ تم تو خالی ہاتھ بھی اسے زیر کرتے رہو۔“

”کھڑی۔۔۔ اور ایک چھرا۔۔۔ ذرا لمبے بھل والا۔“ رستم نے واس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

دو منٹ کے اندر اسے یہ دونوں چیزیں فراہم کر دی گئیں۔ برف جان نے ایک موٹی چمی جیکٹ بھی رستم کو پہنا دی۔ ”جانور سے کس جگہ؟“ رستم نے پوچھا۔

”میرے اندازے کے مطابق وہ پچھلے ہال نما کمرے میں چلا گیا ہے۔ دراصل محافضوں نے اسے ڈرانے کے لئے ہوائی فائرنگ کی۔ وہ باہر آنے کے بجائے حریف اندر گھس گیا۔ وہ خاصا بھرا ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اندر سے ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔“

رستم نے چھوٹے دسٹے کی کھڑی ہاتھ میں لی۔ نچھرا چمی جیکٹ اُس کے نیچے لگا ہوا گودام میں کھیننے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے احتیاطاً ٹیک پہنچلے مگر فراہم کر دیا جاتا مگر برف جان وغیرہ اس کے لئے رضامند نہیں تھے۔

رستم ذرا انتظار کر چٹا ہوا گودام کے عین دروازے کی طرف بڑھا۔ فاصلے پر موجود لوگ دم بخود ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رستم نے ایک بج زندگی میں بہت سے خطرات کا مقابلہ کیا تھا مگر ان خطرات کا تعلق عموماً انسانوں سے ہوتا تھا۔ لاہور اور پنڈی کے دایو گیار، کراچی کے گھنٹکسٹر، پنجاب اور سرحد کے مختلف علاقوں کے خوفناک پولیس آفیسر۔ لیکن اب صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے انسانوں اور جانوروں سے واسطہ پڑے گا۔ گودام کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد رستم کو صورت حال کی اصل سچائی کا احساس ہوا۔ دلہیز پر ہی ایک محافظ کی خون آلود لاش نظر آئی۔ اس کے قریب ہی اس کی کھڑی اور نوئی ہوئی ٹارنٹ موجود تھی۔ خوئی جانور نے محافظ کی شہرگ پر پنجہ مارا تھا اور گردن اوجھڑ کر رکھ دی تھی۔

رستم گودام کے اندر دہی حصہ میں پہنچا تو ہر طرف اسلحہ نظر آیا۔ یہاں لکڑی کی بے شمار

چھوٹی بڑی بیٹیاں تھیں۔ گولیوں والی پٹلیں تھیں اور بھرے ہوئے راتل میگزین، بگنوز کی ٹیلیوں پر ترتیب سے رکھے تھے۔ رستم قحط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ یہاں جانور کے چھینے کے لئے بہت سی بگنوزیں ہو سکتی تھیں اور یہ پالتو جانور نہیں تھا۔ جنگلی تھا اور بہت خوشوار بھی۔ رستم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مکمل مٹاشوں میں استمال ہونے والے جانوروں کو یہاں نازی کی طرح کا ایک نشہ چلایا جاتا ہے جس سے وہ بہت چرس اور جارج ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ جانور بھی کسی ایسے نشے کی ترنگ میں تھا۔

رستم قحط قدموں سے تینوں کمروں میں گھوم گیا۔ مگر جانور دکھائی نہ دیا نہ کہیں اس کی آہٹ سنائی دی۔ تیسرا کمرہ بالکل تاریک تھا۔ یہاں رستم نے بجٹ میں ہاتھ ڈال کر نارٹ نکال لی۔ وہ نارٹ کا روشن دائرہ دایم بائیں گھمانے لگا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو اسے بے محسوس ہوا کہ شاید اس کو دام میں آئے جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے اور جانوروں سے نکل گیا ہے مگر پھر اچانک اسے اپنی ریز جڈ کی ہڈی میں سردی کی تیز لر محسوس ہوئی۔ کوئی عقبہ میں تھا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ رستم تڑپ کر مڑا۔ خدا کی پناہ۔ وہ ایک نہایت جسم اور بھر پورا جانور تھا۔ وہ کسی انسان کی طرح اپنے پیچھے پاؤں پر کھڑا ہو کر رستم پر جیٹا۔ رستم نے بائیں طرف حرکت کر کے خود کو نکھیلے بچوں سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی گھبڑی کا وار کیا۔

گھبڑی جیسے ریچھ کے کندھے پر لگی اور بالکل بے لڑ رہی۔ یقیناً وہ موٹی کھال کا حیوان تھا۔ اس وار کے جواب میں ریچھ نے آتی تیزی سے پوٹھ کھایا کہ رستم ابھی گھبڑی نے بچا سکا۔ پٹنے میں اتنی طاقت تھی کہ چھوٹے دسنے کی گھبڑی رستم کے ہاتھ سے نکلے اور بلی جھلکی شے کی طرح اڑتی ہوئی ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ ریچھ کے کھیل میں رستم کو اب تک جو تجربہ ہوا تھا اس کا نچوڑ یہی تھا کہ جانوری خصوصیت سے اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اس کے اگلے دو بچوں سے ہوتا ہے۔ درحقیقت یہی بچے ریچھ کا سب سے کارگر ہتھیار ہوتے ہیں۔ رستم نے بڑی مہارت سے خود کو نصف منٹ تک ان بچوں کی زد سے بچایا۔ اسی دوران میں وہ جینٹ کے نیچے سے نوڈس انچ کے پھل والا پھرا نکال چکا تھا۔ جانور اس "موڈی تبدیلی" سے کسر بے خبر رہا تھا۔ وہ پھل کا درخت اور رستم کو اپنے ہلکے ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے پاؤں پیچھے ہٹتے رستم نے اچانک خود کو روکا اور ایک سینکڑا زمین پر ایک کرچھر کے کاٹوفانی وار کیا۔ پھرا دسنے تک ریچھ کے نرم پیٹ میں گھس گیا۔ پیٹ میں سے نکلنے والے گرم خون کی پہلی پچا پوری رستم کو اپنے بازو اور کھائی پر محسوس ہوئی۔ ریچھ آگے کو جھکا اور اس کے جسم کی بے پناہ دیوانی

رستم کے نتھنوں میں گھسی۔ یوں لگا کہ وہ اپنے بے شمار وزن کے ساتھ اس کے اوپر ہی آن گرے گا۔ رستم نے خود کو اس کی زد سے بچاتے ہوئے اپنے چھریوں کے پٹ کے اندر ہی اٹھتی حرکت دی اور اس کا قلم بھاڑ کر رکھ دیا۔ جانور متھے کے بل گرا اور ہولناک انداز میں ترپے پھرنے لگا۔ رستم نے پٹ کر پے در پے لگی وارس کے پہلو اور پیٹے پر کئے اور اس کے لہراتے بچوں سے بچنے کے لئے تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ خوشوار جانور کے جسم سے خون کی کی ڈھارس نکل پڑے تھے اور لکڑی کی پٹیوں کو رنگین کر رہے تھے۔

رستم پانچ چھ قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی سانسیں در سسے کرنے لگا۔ اس کے دل میں یہ ڈر بھی موجود تھا کہ کہیں جان بلب ریچھ کے ترپے پھرنے سے پارو دی بیٹیاں فرش پر نہ آن گریں۔ خون آلود پھرا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ کاروائی نے زیادہ طول نہیں کھینچا تھا۔ اس کے باوجود رستم نے خود کو تھکا ہوا محسوس کیا۔ شاید کئی گھنٹوں تک جاری رہنے والی قید تنہائی کی صعوبتوں نے اسے جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا۔

گودام کے باہر سے آنے والی آواز میں رستم کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ کچھ سلاخ دار کھڑکیوں کے پاس بھی آگئے ہوں اور اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جسم سفید ریچھ غصہ ہو گیا تھا۔ اچانک..... رستم کو محسوس ہوا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ باقی ہے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ارد گرد کوئی اور جانور بھی موجود ہے۔ اسی دوران میں دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی اندر آ رہا تھا۔ پھر رستم حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے زری کی آواز سنی۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آ رہی تھی۔ "تم کہاں ہو؟"

رستم نے نارٹ کی ردائی اس کی طرف بھیجی۔ وہ اپنے دو ٹیلے ڈھالے ادنی لہارے میں تھی۔ اس کے لمبے بال دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ جیسے یہ کسی ریشمی جسم والے جانور کے بال ہوں۔ وہ بھاگتی ہوئی رستم کی طرف آئی اور اس سے پٹ گئی۔

"تم نے کتنا ریچھ مارا؟" اس نے تنہائی لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟ یہاں ایک ہی ریچھ تھا۔"

"نہیں نہیں۔ میں تم کو بتانے کے لئے آیا۔ یہاں ایک ریچھ نہیں..... یہاں دو تھیں

ریچھ ہیں۔ یہ لوگ مجھ کو بتاتے۔"

یہ ایک رستم کو اندازہ ہو گیا کہ زری ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں صرف ایک ریچھ نہیں تھا۔ رستم کو اپنے بالکل سامنے تاریکی میں دو چھوٹی چھوٹی جھلکی دکھائیں نظر آئیں۔ یہ بڑی قاتل آنکھیں تھیں۔ یہاں رستم کو آنکھیں ہتھیار کی ضرورت تھی مگر انھیں ہتھیار اس کے پاس

تھے۔ اس نے عظیم کا بھروسہ اور کیا۔ عظیم جانور کے داغوں سے ٹکراتی ہوئی اس کے جالوس میں لگی اور کھوپڑی کے اندر تک گھس گئی۔ وہ بے پناہ کرب سے چٹخا اور پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے پیچھے قریب ایک درجن بیز حیران تھے۔ وہ ہلکا ہوازمین میں یوں ہو گیا۔

رستم بیز حیران پھلاکتا ہوا نیچے آیا اور ترپے ہوئے ریچھ کے اوپر سے جست کر کے زری کی مدد کے لئے پکا۔ لیکن اس وقت تک..... زری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مقابل ریچھ کو بھاگنے پر مجبور کر چکی تھی۔ رستم نے اس چھوٹے ریچھ کی صرف پشت دیکھی۔ وہ گودام کے گردنی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ زری چند قدم اس کے پیچھے لگی اور پھر رگڑ گئی۔

چند سینکڑے بعد باہر سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔ یقیناً انہوں نے لہو لہاں تھوٹنی والے ریچھ کو باہر نکلنے ہونے دیکھ لیا تھا۔ زرا در بعد اومر نے تھکنے فائز سنائی دیئے۔ یعنی بات تھی کہ یہ فائز ریچھ کو مارنے کے لئے ہی گئے تھے۔

زری بھاگ کر آئی اور رستم سے لپٹ گئی۔ وہ عجیب انداز سے بار بار اس کا سینہ چومنے لگی۔ اس انداز میں معصومیت نمایاں تھی۔ چند لمحوں بعد وہ پیچھے ہٹتی..... اور یہی وقت تھا جب اسے اپنی برقی کاکاساس ہوا۔ اس کے سپید کالوں پر شفق کا رنگ چھیل گیا۔ ایک لمبے کے لئے جیسے اس کی کچھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ کیا کرے۔ پھر اس نے آسمان ترین راستہ اختیار کیا۔ وہ دوبارہ رستم سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی رستم کی پسلی کی ایکٹ میں گھسا لیا تھا۔

”کیا کر رہی ہو زری پیچھے ہٹو۔“

وہ خاموش رہی۔ رستم نے پھر اسے ٹھوکا۔ ”زری پیچھے ہٹو۔“

اس نے اپنا سرنگی میں ڈالیا۔ ”نہیں۔ میرے اوپر کپڑے نہیں۔“

”تو اس طرح تم کو کپڑے مل جائیں گے؟“ رستم کے لہجے میں شبہاٹ تھی۔

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ اور بھی رستم کے اندر گھس گئی۔ اس کی سانس دھنکی کی طرح چل رہی تھی لیکن ایسا کسی رومانوی کیفیت کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ ریچھ سے پنڈہ آزمائی کا نتیجہ تھا۔ رستم خود بھی باہر جا رہا تھا۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر سب سے پہلے جلاک ہونے والے ریچھ کی لاش پڑی ہوئی۔

”زری! چلو چھوڑو بیٹھے۔ میں تمہیں کوئی کپڑا دیتا ہوں۔“ رستم نے اسے پکارا۔

ایک لمبے کے لئے اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی لیکن پھر سخت ہوئی۔ جیسے وہ رستم کے جسم کا رگوں کا نہ جانتی ہو۔

رستم سمجھ گیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ وہ اسے اسی طرح اپنے ساتھ لیتا ہوا دائیں طرف

بڑھا۔ یہاں فرش پر زری کا پھٹا ہوا اونٹ لہا رہا تھا۔ رستم نے اپنے پاؤں سے یہ لہا ہوا اٹھایا اور زری کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ رستم سے ٹکڑھ ہوئی۔ اس کے گال اب بھی سب کی طرح سرخ تھے اور چہرہ چھٹایا ہوا تھا۔

”مذکر نے کابست شکر یہ زری۔“ رستم نے کہا۔

”تم بہت آچھا۔“ اس نے اپنا پینڈہ وہ خنجر دھرایا۔

”تم اندر کیسے آئیں؟“

”بس میں آ گیا۔ مجھ کو کھڑکی نظر آیا۔“

اسی دوران باہر سے لوگوں کا شور سنائی دینے لگا۔ لوگ گودام کے مین گیٹ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پھر وہ اس کی چٹائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رستم اتم ٹھیک ہو جس؟“

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا اور زری کے سر اوپر آ گیا۔ اس کی جیکٹ اس کے جسم پر چھینٹوں کی شکل میں بھول رہی تھی۔ پشت پر کھر و فوٹوں کے نشان تھے۔ ریچھوں سے نبرد آزما کی دوران میں اس کی پیشانی اور رخسار سے کھال چھل گئی تھی۔ پتا نہیں یہاں کیا لگا تھا۔ شاید اس کا چہرہ کھروری دوار سے جا کھرا تھا۔ وہ باہر نکلا تو بہت سے لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں برق جان بھی پیش پیش تھا۔ اس نے رستم نے پوچھا۔

”کیا اندر کوئی اور ریچھ بھی تھا؟“

”انجان مت بنو اس اتم سب جانتے ہو۔ اندر تین جانور تھے اور تم لوگوں نے مجھے صرف ایک کا بتایا۔ مجھے اندر بھیج کر تم لوگ تماشا دیکھتے رہے۔ اگر یہ لڑکی اندر گھس کر مدد کرتی تو شاید میں زندہ باہر نہیں آتا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو رستم؟“ اندر صرف ایک جانور تھا جسے ابھی لوگوں نے مار دیا ہے۔“

وہ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اور اندر جو وہ بڑے ریچھوں کی لاشیں پڑی ہیں، وہ شاید جن بھوت ہوں گے۔“ رستم کے لہجے میں شدید طنز تھا۔

وہ اس نے قہج سے برق جان کی طرف دیکھا اور مقامی زبان میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ برق جان کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔ برق جان نے گودام کی طرف قدم بڑھاے۔ کچھ اور لوگ بھی برق جان کے ہم قدم ہو گئے۔ یہ سب مسخ تھے۔ وہ اس اور رستم کی ہوا تھے۔ اندر پہنچ کر سب کی آنکھیں کل گئیں۔ گودام سے باہر جا رہے والا ریچھ چھوٹا تھا۔ اندر دو سیم ریچھوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس جگہ کا نقشہ کوئی دے رہا تھا کہ

یہاں رستم نے شدید جدوجہد کی ہے۔ اس نے نہ صرف بدست جانوروں سے خونی لڑائی لڑی تھی بلکہ انہیں ایسی جگہوں سے بھی دور رکھا تھا جہاں بارود کے پھٹنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔

برق جان کے حکم پر ایک بڑے چرے والے نیم شخص کو موقع پر لایا گیا۔ اس کا ایک بازو تازہ تازہ زخمی ہوا تھا اور اس پر پٹی بندی ہوئی تھی۔ برق جان کے سامنے پہنچ کر یہ شخص کچھ گھبرا ہوا نظر آنے لگا۔ رستم اس شخص کو جانتا تھا۔ اس کا نام بیٹی خان تھا۔ بیٹی خان کو جو بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ان جانوروں کا رکھوالا تھا جنہیں یہاں مکمل قتل خانہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے سفید بچکوں کی نگہبانی اس کے ذمے تھی۔ برق جان اور جو کے درمیان مکالمہ ہوا۔

اس مکالمے کے بعد برق جان کا کافی تپا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے جو کو کڑی طرح جھڑکا اور وہاں سے دفع ہو جانے کا کہا۔ اس کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور رستم کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے اگھوٹے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپکا اور چند الفاظ کہے۔

”وہاں سے توجہ کرتے ہوئے بتایا۔“ ملک تمہارا شکر یہ ادا کر رہے ہیں۔ تمہاری دلیری اور مہارت سے متاثر ہیں۔“ رستم اب خود بھی مقامی زبان کے کافی الفاظ سمجھنے لگا تھا۔ اس کی یہ صلاحیت تاہم۔ یہ بھی بہتر تھی۔

برق جان اپنے چار پانچ مسلح جانوروں کے ساتھ گودام کے مختلف حصوں میں پکڑانے لگا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی جانور راگ تھلک جیسے میں تو موجود نہیں۔ رستم نے اس سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا قتل خانہ ہے۔ جانور یہاں کیسے آئے اور جھوٹ کیوں بولا گیا؟“

”وہاں نے کہا۔“ پہلی غلطی تو جو کی ہے۔ کل کے ایک کھیل کے لئے پانچ رچھیلے بندے سے بندے کئے گئے تھے۔ انہیں مسلسل بھوکا رکھا گیا تھا۔ ان کی کارکردگی دیکھنے کے لئے جو نے شام سے ذرا پہلے انہیں زندہ بھی لایا تھا۔ ایسی حالت میں اسے جانوروں کا زیادہ دھیان رکھنا چاہیے تھا مگر وہ سو گیا۔ بدست جانوروں نے ہاؤس کا دروازہ ہلکا کر اس کا آہنی کھٹکے نیچے سنا کر دواڑہ دروازہ کھول دیا۔ آہٹیں سن کر جو جاگ گیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ اس کے دروازہ بند کر کے رستم تین جانور باہر نکلے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں روکنے کی کوشش میں جو خان کا بازو بھی زخمی ہوا ہے۔ جانور بھاگ کر سیدھے اس گودام میں گھس گئے۔ یہاں گودام کا نگران بھی مارا گیا ہے۔“

”لیکن جو خان نے جھوٹ کیوں بولا؟“

”جھوٹ جھوٹ نہیں کسی اور نے بولا۔“

”کس نے؟“

”تمہارے رقیب نے“ نے مان“ نے۔“ وہاں نے ذرا ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ”رچھ جب ہاؤس سے نکل کر پچاس ساٹھ گز دور گودام میں گھس گئے تو جو خان بھاگا ہوا۔“ نے مان“ کے پاس پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ ”نے مان“ خالی ہاتھ بدست رچھوں سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس نے ”نے مان“ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو ”نے مان“ کی دلیری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے وہی کیا جیسا جیسے دشمن کو کڑا نچا ہے تھا۔ اس نے اپنی جگہ نہیں ہٹایا اور اس کے لئے اپنے دوست جو کو استعمال کیا۔ وہ خود تو موقع سے ٹھک گیا اور جو کو برق جان کی طرف بھیج دیا۔ جو نے برق جان کو باقی تو سب کچھ بتا دیا لیکن بیٹیں بتایا کہ گودام میں رچھوں کی تعداد کتنی ہے۔ جو ابھی مان تو نہیں رہا لیکن جتنی بات ہے کہ ایسا اس نے ”نے مان“ کے کہنے پر ہی کیا ہے۔“

”جو کیا کہہ رہا ہے؟ کیا اسے پتہ نہیں چلا کہ ہاؤس سے کتنے جانور بھاگے تھے؟“ ”وہ کہتا ہے کہ بھاگے تو میں ہی تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ گودام میں صرف ایک گھسا ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے ”نے مان“ کے کہنے پر ایسا کیا ہے۔ ملک برق جان نے اسے آٹھ پہر کی مہلت دی ہے کہ اس دوران وہ ج بول دے ورنہ اس سے بچ اگھوٹا جائے گا۔“

اسی دوران میں برق جان کے مسلح محافظ آہنی بیڑی کے ساتھ آن موجود ہوئے۔ اس معاملے میں یہ لوگ بہت سخت تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے برق جان نے رستم کو شاہاش دی تھی اور اس نے کام بھی یقیناً ایسا ہی کیا تھا جو تعریف و تحسین کے لائق تھا لیکن آہنی بیڑی ایک اٹل حقیقت کی طرح اپنی جگہ موجود رہتی تھی۔

رستم کی پینشنی ہوئی جیکٹ اتار کر اسے دوسری صدری پہنا دی گئی۔ گودام کے دروازے پر ہلاک ہونے والے چوکیدار کی لاش موقع سے ہٹائی گئی تھی تاہم وہاں ابھی تک خون کے نمایاں دھبے موجود تھے۔ دو پاؤں سے پانی سے لگائے اور ان دھبوں کو دھوئے میں مصروف ہو گئے۔ قتل خانہ رستم کو دیکھنے کے لئے اٹھ پڑ رہے تھے۔ درحقیقت رستم اور کسی حد تک زری کی دلیری نے سستی کو ایک بڑی جانی سے بچا لیا تھا۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ دیکھنے والے اسے احسان مندی کی نگاہ سے دیکھتے مگر ان کی نگاہوں میں فقط قتل خانہ والی دلچسپی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ ان کا یہ انداز رستم کو سخت ناگوار محسوس ہوتا تھا۔

”زری کہاں ہے؟“ رستم نے اس سے پوچھا۔

”اسے ہماروں کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔ اب شاید۔“

”رک کیوں گئے؟“ رستم نے استفسار کیا۔

”اب شاید تم اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے۔ اسے سخت غمرانی میں رکھا جائے گا۔ ویسے بھی

اب تہوار میں تین چاروں ہی رو گئے ہیں۔“ اس کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔

”تمہارا مطلب ہے۔“

”ہاں۔ یہاں کے طور طریقوں کے مطابق زری نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اور یہ

دوسری مرتبہ ہوا ہے۔ پہلے وہ تم کو لوں کے ساتھ اس وقت پکڑی گئی تھی کہ تم فرار کی کوشش میں

تھے۔ دوسری مرتبہ وہ اب تمہارے پیچھے گودام میں داخل ہوئی اور اپنے لئے سخت خطرہ مول

لیا۔ مجھے یقین ہے، اب وہ غاص غمرانی میں رہے گی اور بحیثیت چڑھنے تک اسے بند رکھا

جائے گا۔“

☆=====☆

کچھ دیر بعد رستم کو دوبارہ اس کے پہلے والے ٹھکانے پر پہنچایا گیا۔ رستم کے دل میں

انہویش تھا کہ شاید اسے پھر سے سرنگ والے بندی خانے میں پہنچایا جائے گا جہاں وہ اس

سے پہلے دس پندرہ دیگر مردوں (قیدیوں) کے ساتھ رہتا تھا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ رستم کو

واپس اس کے گھر ہی پہنچایا گیا۔ اس سے پہلے رستم، ناصر اور شریف وغیرہ اس کے گھر سے

فرار ہوئے تھے تاہم اس حوالے سے اس پر کسی طرح کا الزام نہیں آیا تھا۔ اس وقت جنگ

کی حالت تھی، کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے مؤقف اختیار کیا تھا کہ اسے علم ہی نہیں، وہ

لوگ کب لڑائی کے میدان سے ٹھکے اور ناپ کے کنارے پر پہنچے تھے۔ جب جنگ کی وجہ سے

ان تینوں کی بیڑیاں خود برق جان کے خاص کارندوں نے کھنٹی میں اور انہیں ہتھیار بھی فراہم

کئے تھے۔

اس کے گھر میں اس کی بیوی رستم سے ملی اور اس کا شانہ چمکا۔ اس کی آنکھوں میں

حزن و ملال کی کیفیت تھی۔ نہ جانے اس نے کتنی دیریں مانگی تھیں کہ رستم اور اس کے ساتھی

اس پر نیلے جنم سے نکلنے میں کامیاب رہیں مگر ابھی شاید دعاؤں کی قبولیت کا وقت نہیں تھا۔

رستم پھر اس چار دیواری میں تھا۔ ناصر قید و بندی، مصوہتیں جھیل رہا تھا اور شریف تا حال

صاحبِ فراش تھا۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس کی بیوی خانم نے رستم کے سر پر ہاتھ پھیلتے ہوئے

تاسف سے کہا۔ ”مجھے اس انگریز لڑکی کی موت کا بھی بہت دکھ ہے۔“ انگریز لڑکی سے خانم کی

مراوا مالینا تھی۔

واس کی بیوی نے رستم سے ان واقعات کی تفصیل پوچھی۔ رستم نے مختصر الفاظ میں اسے

سب کچھ بتا دیا۔ یہ واقعات بیان کرتے ہوئے وہ خود بھی آزاد ہو گیا۔ اب تو کبھی بھی رستم کو

لگتا تھا کہ شاید وہ یہاں سے کبھی نکل نہیں پائیں گے۔ ان بے رحم برہمنوں میں ہی پکرا پکرا کر

ختم ہو جائیں گے۔

اگلی شام کو کھانے کے بعد رستم اور اس نے افغانی قبوے کی بنائیاں سامنے رکھیں اور

باتوں میں مصروف ہو گئے۔ رستم کے چہرے کی رستی ہوئی خراشوں پر خانم نے اپنے ہاتھ سے

پٹی باندھ دی تھی۔ اس کے باوجود خون کا رسا ز پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ کمرے کی اگلوٹی

کھڑکی سے باہر تہار کی آمد کو صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ کھیلوں میں بچوں کی جیکاریں تھیں۔

رنگ برنگ لاشیں پکرائی پھرتی تھیں۔ گاہے بے گاہے مقامی موسیقی کی آواز بھی سنائی دیتی

تھی۔

رستم کا سارا دھیان زری کی طرف تھا۔ اس کو وہ دوسری گاریٹوں کے ساتھ صرف چار

روز بعد بحیثیت چار دیواری جانا تھا۔ کیا وہ کسی طرح اسے پہنچا سکتا ہے؟ رستم نے بڑے کرب کے

ساتھ سوچا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے کھلی کھلی آواز میں پوچھا۔

”تمہاری بیٹی زری کے بارے میں۔ کیا اس کے لئے کچھ کیا نہیں جاسکتا؟“

”جو کچھ کر سکتے تھے وہ تو کیا ہے۔ تم اہم۔“ نے اسے اپنے ساتھ یہاں سے نکالنے

کی کوشش کی مگر قدرت کو منظور نہیں تھا۔“

رستم نے ہر سوچے انداز میں کہا۔ ”میں نے ایک دن تم سے پوچھا تھا کہ وہاں گورے

کے بچے ہیں جہاں درجن بھر دوسرے افراد کو آج کے نام پر ذبح کر دیا گیا، وہاں مالینا کو

زمین پر گرانے اور اس کی گردن پر لکھڑی رکھنے کے باوجود اسے معاف کیوں کر دیا گیا۔ تم

نے بتایا تھا کہ وہ کھینچا تانی میں ڈھی ہوئی تھی اور ڈھی کو بحیثیت نہیں چڑھایا جاتا۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ زری کسی وجہ سے ڈھی ہو جائے اور وہ بحیثیت چڑھنے سے بچ

جائے۔“

اس اداسی سے مسکرایا۔ ”کل گودام میں تمہاری مدد کرتے ہوئے دو تھوڑی بہت ڈھی تو

ہوئی تھی لیکن اس کی جان بخشی کا کوئی سوال پیدا نہیں۔“ دراصل یہ معاملہ اتنا آسان نہیں

جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ایک گناہ گار کو بحیثیت چڑھائے جانے کا اور طریقہ ہے۔ ایک گارنی کو قربان کرنے کا اور قانون کا قاعدہ ہے۔

”اس میں کیا نئی سائنس رکھی گئی ہے؟“ رستم کا لہجہ سخت طنزیہ تھا۔

”گارنی کو تہوار کے موقع پر ملے شدہ وقت کے مطابق ہر صورت بحیثیت چڑھنا ہوتا ہے۔ ڈبھی ہو کر، بیمار ہو کر یا قریب المرگ ہو کر بھی وہ اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صرف اور صرف ایک صورت میں گارنی بحیثیت چڑھنے سے بچ سکتی ہے۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ وہ باکرہ نہ ہو۔ گارنی کا کنوارہ ہونا اس کے بحیثیت چڑھائے جانے کی لازمی ترین شرط سمجھا جاتا ہے۔ اس باؤندہ قبیلے میں میں بھییں صدیوں سے یہ اصول چلا آ رہا ہے۔ بحیثیت کے کئی اصولوں میں تھوڑا بہت رد و بدل ہوا ہے مگر یہ اصول اٹل رہا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس گارنی لڑکیوں کو سر عام بحیثیت نہیں چڑھایا جاتا۔ قدیم دور کی طرح انہیں قتل کرنے سے پہلے بے لباس بھی نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ انہیں قتل کرنے سے پہلے نشہ آور مشروب پلا دیا جاتا ہے۔ یہ مشروب ابوک کی جڑوں سے تیار ہوتا ہے۔ بحیثیت چڑھنے والی لڑکیاں اس مشروب کے زیر اثر نیم بے ہوشی کے عالم میں ذبح ہو جاتی ہیں۔“

رستم کے چہرے پر سوچ کی ہر چھائیاں تھیں۔ لائینن کی روشنی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”تم کہتے ہو اس کا اگر گارنی کی زندگی میں کوئی مرد داخل ہو جائے تو وہ بحیثیت چڑھنے سے بچ جاتی ہے۔ اس بات کا پتا کیونکر چلتا ہے کہ اس کی زندگی میں واقعی کوئی مرد آیا ہے۔۔۔۔۔ اور اب وہ دھڑکتی ہوئی ہے۔“

”اول تو یہاں ایسا ہوتا ہی نہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ گارنی لڑکیاں یہاں مکملے بندوں پھرتی ہیں اور لوگوں کے گھروں تک میں آزادانہ گھس جاتی ہیں۔ قبیلے کے مردوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کچھ مذہبی عقیدت کی وجہ سے بھی ان لڑکیوں سے دور رہتے ہوں گے مگر زیادہ تر لوگوں کو ان نہایت کڑی سزاؤں کا خوف رہتا ہے جو اس جرم کی پاداش میں رکھی گئی ہیں۔۔۔۔۔ بہر حال گزرتے برسوں میں ایسے اکاؤکا واقعات ہوئے بھی ہیں۔ ایسی صورت میں عموماً گارنی خود ہی مجاریوں کو تباہ دیتی ہے کہ اس کے ساتھ ایسا واقعہ ہو گیا ہے اور وہ نہ بھی بتائے تو مجاریوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے بڑی عمر کی مجاریوں کی سرداری کہا جاتا ہے، بہت خاص نگاہ رکھتی ہے۔ مقامی لوگوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ بڑی ماں یعنی بڑی عمر کی مجاری صرف لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر بتا سکتی ہے کہ وہ کونسا بیٹا

ہے، حاملہ ہے، یا کنواری ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان معاملات میں یہ مجاری عورتیں حیران کن صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کئی معاملوں میں ان عورتوں کا تجربہ اعلیٰ درجے کی گانا کا لوہجٹ سے نہیں زیادہ ہوتا ہے۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ یہ عورتیں زچگی کے ایسے ایسے کیسوں سے بخوبی نشت لیتی ہیں جن کے بارے میں سوچ کر دل کا ٹپ جاتا ہے۔ یہ سینکڑوں سال سے نسل در نسل پہلے والی مہارت ہے جو جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ ہم خود سوچو، صرف چہرہ دیکھ کر کسی عورت کے کیا بیٹا یا بیٹیا ہونے کا اندازہ لگا لینا کوئی معمولی بات ہے؟“

رستم کی متاثرہ ٹانگ میں درد کی ہلکی ٹیمیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ٹانگ کو سردی سے بچانے کے لئے اسے ایک لٹاف میں لپیٹا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جو گارنی بحیثیت چڑھنے سے پہلے چاڑھا، شیر کا کھ، چن، ہرا، اس کا کیا فائدہ ہے؟“

”عام طور پر اسے یہ قصور ہی سمجھا جاتا ہے۔ سارا زلزلہ اس مرد پر گرتا ہے جو اس کے ساتھ ملوث پایا جاتا ہے۔ اس شخص یا اشخاص کی کم از کم سزا زندہ جلایا جاتا ہے۔“

”یعنی گارنی زندہ رہتی ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ زندہ رہتی ہے مگر اس کے ساتھ ایک طرح کی نحوست ضرور وابستہ کر دی جاتی ہے۔ اس کے سر کے بال اور منوں سو ڈھل جاتی ہیں۔ اس کے گلے میں لوہے کا ایک کڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ تنہا زندگی بسر کرتی ہے، روکھا سوکھا کھاتی ہے۔ عام طور پر اس سے کوئی بچہ کام لیا جا۔ ہے۔ مثلاً کتوں کی رکھوالی، اُٹھیل کی صفائی وغیرہ۔ ایک ایسی عمر رسیدہ گارنی اب بھی بہت سی موجود ہے۔ وہ قبرستان میں رہتی ہے اور قبروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔“

ایک دو روز سے پر دستک ہوئی۔ واس کی بیوی نے جا کر روزہ رکھ لیا۔ رستم چونک گیا۔ برقی جان کے دو ذاتی محافظ اور داخل ہوئے۔ دو سو کی صدر یوں میں تھے۔ رواج کے مطابق کمرے چھوٹے دستے کی کلباڑیاں لگ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک محافظ کے ہاتھ میں تانبے کا ایک مستطیل تھا۔ اس کو ایک شہری خان پوش سے ڈھانپا گیا تھا۔

محافظ نے اپنی زبان میں درکی کلمات اور کھائے اور پشت رستم کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ واس سے چند فقرہ کا تبادلہ کر کے محافظ واپس چلے گئے۔ واس نے خان پوش ہٹایا۔ پشت میں کسی دھات کا بنا ہوا ایک نہایت خوبصورت جام تھا اور اس میں پیکلے سرخ رنگ کا ایک مشروب بھرا ہوا تھا۔ جام کی بیرونی سطح پر چڑے ہوئے قیمتی پتھر لائینن کی روشنی میں جگمگاتے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ رستم نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہاری صحت کا جامِ ابرق جانِ تمہارے لئے بیجا ہے۔“

”کس خوشی میں؟“

”تہوار کی خوشی میں۔ شاید تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا، اس قلعے میں جہاں بہت سی برائیاں اور خرافات ہیں، وہاں کچھ اچھی باتیں بھی ہیں۔ اس ہستی میں ہر قسم کا نشہ منورغ ہے۔۔۔ اور نشہ کرنے والے کے لئے باقاعدہ سزا بھی ہے لیکن سال میں صرف ایک بار ”روشنیوں کے تہوار“ کے موقع پر یہ نشہ آور مشروب محدود مقدار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی رسم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مشروب تہوار سے دو دن پہلے بس آدھ آدھ پیا جائے گا۔“

”کیوں یہ وہی مشروب تو نہیں جو آبِ حیات کی جڑوں سے بنتا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ درخت کی جڑوں کو پانی میں بھگو کر اور اس میں شکر ڈال کر خیر اٹھا جاتا ہے۔ اس کا نشہ بہت تیز تو نہیں ہوتا۔ مگر ہوتا ہے۔“

”یہ وہی مشروب تو نہیں ہوگا جو گارڈینوں کو ہیمنٹ چڑھانے سے پہلے پایا جاتا ہے؟“
 ”ہاں، یہ وہی ہے۔“

”کیوں مجھے بھی اگلے جہان میں پہنچانے کا ارادہ تو نہیں کیا گیا؟“ رستم نے جکے جکے انداز میں کہا۔

”نہیں، نہیں۔ کیسی بات کر رہے ہو۔“ واس مسکرایا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ برقی جان جنہیں کسی بھی موقع پر اور کسی بھی وجہ سے قتل کرنا چاہے گا۔ میری تجربہ کار آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ میرا اندازہ ہے۔۔۔ اور پلٹ اندازہ ہے کہ برقی جان اور اس کے قریبی ساتھی جنہیں ہر قیت پر زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ۔۔۔“ واس کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”کیا لگتا ہے؟“

”لگتا ہے کہ برقی جان تم سے کوئی بہت خاص کام لینا چاہتا ہے۔ میں اس کام کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر یہ بات طے ہے رستم اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہاری زندگی کے لئے کسی بھی صورت میں خطرہ نہیں بنے گا۔“

”مجھے تمہارے یقین پر جراتی ہو رہی ہے۔“ رستم نے کہا۔
 ”لیکن مجھے کوئی جراتی نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں برقی جان کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ واس نے چند لمحوں وقف کر کے اپنی گڑبگڑی سے سٹل کھینچا اور جھجکا جاتے جام کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میری بات کا ایک ثبوت یہ جام بھی ہے جس میں جنہیں مشروب بھیجا گیا ہے۔ قلعے کا ملک اس جام میں اپنے خاص الخاص مہمان یا دوست کو ہی مشروب یا دودھ وغیرہ بھیجتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے فراہم کی ناکام کوشش کر کے برقی جان کی نظروں میں جو مقام کھو لیا، وہ بھر حاصل کر لیا ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نقصان کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ میں جی کہتا ہوں۔ میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔“

رستم نے جام کو سونگھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ ”کیا بات ہے۔ تم اسے بچے سمجھتے؟“
 واس نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ یہ شراب ہے۔“

”تم شراب نہیں پیچے؟“ واس کے لیے میں ہلکی سی حیرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رستم اور ناصر ایک بہت بڑے ”ذویت گرد“ میں شامل تھے اور ہر قسم کے جرائم کی دلدل میں دھنسے رہے ہیں۔

رستم نے ایک طویل سانس لے کر اپنے لیے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینکا۔ ”بہت چیتا تھا بلکہ رات دن اس میں فرق رہتا تھا۔ شراب اور عورت کا میری زندگی میں بہت عمل دخل تھا مگر اب کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ کسی نے مجھے سر سے پاؤں تک بدل دیا ہے۔“

”وہ کون ہے رستم؟“ واس نے عجیب سے لیے میں پوچھا۔ ”میں ہر وقت تمہارے ارد گرد اس کی چھانیاں محسوس کرتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے لگتا ہے کہ بہت زور آور ہے۔ جنہیں بے پناہ کشش سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تم جس طرح بار بار یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہو، یہ حیران کن ہے۔“

”کسی وقت بتاؤں گا جنہیں۔ اب سو جاؤ۔“ رستم نے کہا اور سنہری جام کا سرخی مائل مخلول اٹھائیں کی راکھ میں اندر مل دیا۔

کمرنگی سے باہر نکلی جانے والی قصبی۔ خوش باشوں کی ٹولیاں کھیلوں میں محو رہی تھیں۔ کچھ لوگ مستی۔۔۔ عالم میں تھے اور کورس کی شکل میں کوئی قدیم گیت گارہے تھے۔ گاہے بگاہے ہوائی فائر بھی سنائی دے جاتا تھا۔ رستم کے سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔۔۔ آنکھوں میں بے چینی تھی۔ جبر اور نا انصافی کے خلاف لڑتے لڑتے وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اب جبر ہوتے دیکھنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسی لہر مٹنے لگی تھی جو کسی مصلحت کو خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی۔ اب یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔

موسم اب کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ ہوا میں سردی کی وہ بے پناہ کاٹ پائی نہیں رہی تھی۔ رات کو دیر تک رستم روشتیوں کے تہوار اور زردی کی اندھ دھنک موت کے بارے میں سوچتا رہا پھر سو گیا۔

صبح ایک اچھی خراس کی منتھر تھی۔ ناصر بھی رہا ہو کر وہ اس کے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے اور دیر تک بغل گیر رہے۔ ناصر کے پاؤں میں بھی ننھیں بیڑی کی کڑھ کڑھاری تھی۔ وہی بیڑی جو قیدی کے عضو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔ "یہ آپ کے چہرے کو کیا ہوا؟" ناصر نے میلی کپلی پٹی دیکھتے ہوئے کہا۔

رستم نے اسے گروہ مار دالے واقعے کی تفصیل بھائی۔ رنجیوں کی تعداد کے حوالے سے "نہ مان" کے خیافت بھرے جھوٹ نے ناصر کو بہت مشتعل کیا۔ وہ بولا۔ "رستم بھائی! عتقرب یہ شخص میرے ہاتھ قفل ہونے جا رہا ہے۔ میں آج کبہر ہاؤں، میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ بس میرے اور اس کے آمنے سامنے آنے کی دیر ہے۔ اب وہ حرام زادہ ہے کہاں؟" "برق جان نے اس سے ہتھیار و غیرہ وٹے لئے ہیں کیونکہ رنجیوں کے رکھوالے چو خان نے اس کے خلاف بیان دیا ہے۔ اب وہ اپنے گھر میں ہی نظر بند ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے خلاف کوئی مناسب کارروائی ہوگی۔" وہ اس نے کہا۔

"برق جان نے کارروائی کرنی ہوتی تو اسی وقت کرتا جب اس گھٹے نے رستم بھائی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔" ناصر کے لہجے میں آگ تھی۔

"تم بھول رہے ہو۔ اس وقت یہاں کا ملک شوق خان تھا اور سزا دینے کا اختیار بھی اس کے پاس تھا۔" وہ اس نے وضاحت کی۔

رستم کے چہرے پر ہندی ہوئی پٹی بار بار ناصر کی نگاہوں میں ٹھک رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے یہ پٹی کھنٹی اور رستم کی خراشوں کا معائنہ کیا۔ جلد کی جگہ سے جھلکتی تھی اور رستم خراب ہونے کا انداز نظر آ رہا تھا۔ ایک ڈاکڑ کی مشیت سے ناصر اس معائنہ کو بہتر طریقے سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت آنجنالے مالینا کا شولڈر بیگ منگوایا۔ اس میں چند ضروری دواؤں ابھی تک موجود تھیں۔ ناصر نے ان دواؤں کی مدد سے رستم کے چہرے کی مرہم پٹی کی۔ ایک اچھی اسٹین بائیسک بھی موجود تھی جو انٹیکشن کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ رنجیوں والے واقعے کی وجہ سے ہستی میں دو افراد کی موت ہوئی تھی۔ ان اموات کے سبب ہستی میں اسردی تو موجود تھی لیکن ساتھ ساتھ جہاد کی گہما گہما بھی نظر آرہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بازار بھی لگا گیا تھا۔ اس نے عمارتوں کی کچھ جھلک میں سے لائینوں کے ذریعہ

جھلی پکڑنے کا مقابلہ بھی ہو رہا تھا۔

وہ اس نے بتایا۔ "یہ بڑا دلچسپ مقابلہ ہوتا ہے۔ جھلی کی جی ہوئی سٹپر سوراش کے جاتے ہیں۔ نیچے پانی میں جھلی ہوتی ہے۔ سوراش کے قریب روشن لائینیں رکھی جاتی ہیں۔ جھلی ان لائینوں کی روشنی دیکھ کر سوراش کے پاس آتی ہے۔ اسے دروچ لیا جاتا ہے۔ ایک مقررہ وقت میں زیادہ پھیلیاں پکڑنے والے کو دو گھوڑوں یا اس کے مساوی قیمت کی بھیڑوں کا انعام دیا جاتا ہے۔"

رستم اور ناصر اپنے ساتھی شریف کا حال احوال دریافت کرنے کے لئے اس کے پاس جانا چاہتے تھے مگر وہ اس نے بتایا کہ اس کے لئے برق جان سے باقاعدہ اجازت لینا پڑے گی۔ رستم کو برق جان کے داماد یا سانی خان کی طرف سے بھی امداد پیش تھا۔ سانی خان ڈاکٹر مالینا کی وجہ سے اپنے بازو سے محروم ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر مالینا کا تعلق رستم اور ناصر وغیرہ کے ساتھ ثابت ہوا تھا۔ اب رستم اور ناصر ایک طرح سے برق جان اور سانی خان کی تحویل میں تھے۔ سانی ان سے باز پرس کر سکتا تھا۔ تاہم اس حوالے سے اطمینان کی بات یہ تھی کہ سانی خان ابھی تک زخمی اور بیمار تھا۔ اس کی سرگرمیاں بالکل محدود تھیں۔ رات کو موسم امراؤد ہو گیا۔ بجلی ہوا بھی چلنے لگی۔ وہ اس کو ہلکا بخار تھا۔ مسٹر کھائی بھی ہو رہی تھی۔ وہ دوا کھا کر جلدی سو گیا۔ وہ اس کی بیوی بھی عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد سو جاتی تھی۔ رستم اور ناصر چائے کر رہے۔ اپنے حالات پر غور کرتے رہے اور سوچتے رہے کہ انہیں آئندہ کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ تیسری مرتبہ فرار ہوتے پکڑے گئے تھے، برق جان ان پر ہریانہ نظر آتا تھا۔ ہریانہ نہ ہوتا تو وہ اس وقت اٹھنے والے گھر میں موجود نہ ہوتے۔ درحقیقت ابھی برق جان کے لئے شوق خان والے فخر و پوری طرح ٹکا نہیں تھا۔ شوق اپنے تقریباً تین سو جاں نثار خاندانوں کے ساتھ ہستی کے مشرقی کنارے پر موجود تھا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت فیصلہ کن لڑائی ہو سکتی تھی۔ اس لڑائی کے لئے برق جان کو زیادہ سے زیادہ لڑاکوں کی ضرورت تھی اور ممکن تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہو۔

رات کے دس بجے کا مکمل ہو گا جب وہ دونوں ہاتھیں کرتے کرتے مٹھے۔ ساتھ والے کمرے سے وہ اس کے خزانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ابھی رستم کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک وہ جاگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم بھی ہوا کہ وہ بستر میں اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اس کے ساتھ موجود تھا۔ وہی رستم کی لمبی کے کس جیسا احساس اس نے ایک دم لحاف اپنے اوپر سے ہٹایا اور نیم بائیں کی مٹی غور سے دیکھا۔ وہ سنانے میں رہ گیا۔ اس کے

ساتھ زری لیتی ہوئی تھی۔ اس نے کمال بے تکلفی سے اپنا سر رستم کے کندھے سے نکالیا ہوا تھا اور اپنا ایک بازو رستم کے سینے پر دھر ہوا تھا۔

”یا خدا! یہ جانا کہاں سے فیک پڑی؟“ رستم نے دل میں سوچا۔

ابھی صبح ہی واس نے بتایا تھا کہ زری کی صورت اب نیم شاید دو بارہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ اور باقی دونوں گارنیاں سخت پہرے میں ہیں اور اب انہیں سمیٹ کے وقت ہی ان کی چار دیواری سے نکالا جائے گا۔ زری کا فحش ہی تھا جس نے واس کو ہنسا کر رکھا تھا اور وہ پورے دن میں دو چار ٹولے سے زیادہ کما نہیں کھاتا تھا اور اب بھی زری نہ جانے کس طرح ساری دیواریں بھانڈ کر انگرٹوں کو چمکھ دے کر یہاں اس کے پاس موجود تھی۔ یہ ناقابل فہم لڑکی تھی اور آج اس نے جو کیا تھا وہ بالکل ہی ناقابل فہم تھا۔

رستم نے اسے زور کے ساتھ دونوں شانوں سے پکڑا اور اس کے گوشت میں انگلیاں گاڑتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”کیسے آئی ہو تم یہاں؟ کوئی تمہارے پیچھے تو نہیں آ جائے گا؟“

وہ بے پروائی سے مسکرائی۔ ”کسی کو کچھ نہیں پتا۔ میں بڑی چالاکی سے آیا۔“

”تیری چالاکي سب کا بیڑا غرق کر دے گی.....“ رستم نے دانت پیسے۔ ”اور تُو یہاں میرے بستر میں کیوں تھسی ہے؟“

وہ اس نے حسبِ عادت بے تکلفی سے دستم کا کان کھینچا اور سرگوشی کی۔ ”تم بہت آجھا.....“

”تیرے اندر کوئی شرم حیا ہے یا نہیں؟ تیرے چچا کو ہتا چل گیا تو پھر؟“

”یہ شرم کی بات تھی۔ میری کچھ میں بالکل نہیں آتا۔“ دورِ ستم کے ساتھ کچھ اور چپکلی ہو۔
واقعی ایک معرکھی۔ کبھی پہاڑی ندی کی طرح صاف شفاف۔ لیکن اپنی فطرت میں بڑے جوش
اور اپنے ہی بہاؤ سے بے پناہ انسان! اس کا دل آئینے کی طرح تھا مگر اس کے معصوم جہانِ خدا سے
اسے کبھی الجھن کے گھبرے میں رکھتے تھے۔

ایک ایک دستہ کے ذہن میں ایک خیال نکلی کی طرح کوئٹہ اور وہاں پہنچے جگہ سہکتے رہ گیا۔ یہ رات تھی۔ یہ رات کی کسی کھوت تھی۔ یہ کیا خیال تھا؟ اس نے کسی بچی کی طرح اپنے پہلو سے چپٹی ہوئی اس اونٹنی لڑکی کو دیکھا۔ اور سوچا۔ اس کا زندگی کی حرارت سے بھر پور جسم فقط دو دن بعد موت کی سرد چادر ڈھانے والا ہے۔ اس تڑپتی چلتی لڑکی کو کسی بھیجڑ بکری کی طرح قربان گاہ کے فرش پر چٹا جانے لگا۔ اسے گھنٹوں کے نیچے دبا دیا جانے لگا اور پھر اس کی صراچی جیسی خوبصورت گردن پر اہل کی چھری چلا دی جانے لگی۔ یہ ایک ہولناک ظلم

تھا اور اس ظلم سے اس اول جہول لڑکی کو بس ایک ہی طریقے سے بچایا جاسکتا تھا۔ اور اس ظلم کی طرح ہی طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ عام حالات میں شاید رستم کو کسی ایسی بات کے بارے میں سوچنا بھی ناگوار محسوس ہوگا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے دل میں کراہت سی جاگ رہی تھی، اس کے باوجود وہ سوچ رہا تھا۔ کیا ایک بہت بڑی برائی سے بچنے کے لئے ایک چھوٹی برائی کے لئے کچھ کچھ نکل سکتی ہے؟ کیا اس لڑکی کے لئے ایسا کچھ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک بے انصافی قربان گاہ پر لپٹنے کے قابل نہ رہے؟

”تم کیا سوچتا؟“ زری نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”کچھ نہیں۔“ رستم کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”میں جانتا ہوں، تم مجھ سے ناراض..... بہت سارا ناراض۔“

رستم خاموش رہا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کراہیں کئے۔ دایم ہاتھ سے بائیں کان کو اور بائیں سے دایم کان کو پٹختا اور بولی۔ ”مجھ سے غلطی ہوتا اور بار بار ہوتا۔ پر اب نہیں ہوگا۔ بڑی ماں (بڑی بھجوری) نے کہا کہ میں دو دن بعد سفر پر جاؤں گا۔ بہت دور۔ وہاں میرا خاندان زندگی شروع ہوگا۔ میرا شادی ہوگا۔ اسی شہزادے کے ساتھ جس کے سر پر کرون کا تاج ہوگا۔ لیکن۔ لیکن۔ میں وہاں جا کر بھی تم کو بہت یاد کروں گا۔ تم بہت چہلے۔“

دستم کے دل میں میس سی اٹھی۔ ”جہیں پتا ہے زری! تمہیں اس سفر پر کیسے بھیجا جائے“

”ہاں“ میرا گھاناٹ کر۔ لیکن بڑی ماں کہتی ہے۔ سب کہتے ہیں۔ گھانا کاٹنے سے درد نہیں ہوتا۔ بالکل نہیں ہوتا۔ پتا بھی نہیں چلتا۔ ”وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے رستم کے جواب کا انتظار کر رہی ہو۔ پھر اس نے خودی پوچھا۔ ”کیا جیج گھانا کاٹنے سے درد نہیں ہوتا۔ کیا وہ مجھوت تو نہیں بولے؟“ زری کے لہجے میں اندیشوں کی چوچھائیاں لرز رہی تھیں۔ موت کا خوف جو انسان کی فطرت میں شامل ہے، سادہ لوح زری کی رگوں میں بھی موجود تھا۔ اسے ڈر اور ہتھکا۔ اندر سے دھکی کر رہا تھا۔

ان لمحوں میں رستم کو اس کی سادگی و نادرانی پر بہت ترس آیا۔ وہ مری قحی اور اس کے لئے کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور جو کیا جاسکتا تھا، وہ رستم کے بس کی نہیں تھا۔ وہ دست زدہ لیٹا رہا۔ وہ اس کے پہلو سے چمپی رہی۔ اپنی تمام حشر سامانیوں سے بے خبر اس کا جسم رستم کے جسم سے ہم کلام رہا۔ نصف شب کی سردی لکڑی کی دیواروں میں سرایت کرنے کے بعد

دوسرے دوسرے میں اتر رہی تھی اور سونے لحاف کی بیرونی سطح کو کھٹکا کر رہی تھی اور وہ پوچھ رہی تھی۔ ”کیا یہ ساچا (سچا) باب ہے کہ بیعت چڑھنے والے کو درود نہیں ہوتا؟ مجھ کو بتاؤ ناں۔ تم بہت اچھا۔ تم ساچا ہو ناں۔“

رستم کی کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ رات بہت خاموش، سرد اور زہر بھری تھی۔ ساتھ والے کمرے میں وہاں اور اس کی بیوی دنیا و فیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔ دس بارہ گھنٹہ دور تا دیر بھی چار پانی پر سو رہا تھا۔ اس کی چار پانی کے نیچے لائین رکھی تھی جس کی نو اتنی دم کر دی تھی کہ اس ایک تاریکی لکیر کی طرح سی نظر آتی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی اور اس تاریکی میں زری کی گرم سانسیں رستم کے کانوں کے بالکل قریب گونج رہی تھیں۔ عورت رستم کے لئے کوئی اونچی شے نہیں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کی زندگی میں شافی بی بی کے آنے سے پہلے ہی عورتیں آئی تھیں۔ لیکن شافی بی بی کے آنے کے بعد کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ورق اس کی زندگی کی کتاب سے ہمیشہ کے لئے پھٹ گیا تھا۔ وہ شافی بی بی سے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا تعلق اسے ایسے مقام پر لے آیا تھا جہاں اس کی ساری کائنات کا محور بس بی بی کی ذات ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دڑے دڑے پر بھی ایک امتحان سے گزرا تھا۔ پری بیک فلمی اداکارہ نہادیہ نے اپنے بے پناہ حسن کے ٹھنڈ میں رستم کو اپنی راہ پر لانا چاہا تھا۔ آرائش کی دو رات رستم کو ابھی بولی نہیں تھی۔ نہادیہ نے اپنی تمام تر مشرمانہاؤں کے ساتھ رستم کے پندار پر شب خون مارا تھا لیکن وہ رستم کی گرد کو بھی بچھو نہیں سکتی تھی۔ اسے بھگانا تو دور کی بات ہے، وہاں کے پایہ استقلال میں بلکی ہی لڑش بھی پیدا نہیں کر پائی تھی۔ بی بی کے خیال میں جو طاقت تھی، اس کے بارے میں رستم ہی جانتا تھا۔ یہ طاقت اسے بڑے بڑے خوفان کے سامنے ایک پھاڑی طرح کھڑا کر سکتی تھی۔

لیکن یہاں صورت حال کچھ مختلف تھی۔ یہاں کوئی اور بات تھی۔ حالات کے پھیرنے یہاں کچھ اور سی لکھتہ تزیین دے رکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکی کے لئے رستم کے دل میں کسی طرح کی کوئی گرفت نہیں تھی۔ بے شک اس کی موجودگی ایک خوفناک لہری طرح اس کے پہلو میں بائیں چار رہی تھی، لیکن اس پہلے کا رستم کے دل و دماغ سے کوئی ناتانہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو بس ایک سوچ تھی۔ کہ وہ کسی طرح اس لڑکی کو بیعت چڑھنے کی ہمتی سے بے بسا کتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے؟ اپنے دل و دماغ اور اپنے جسم پر جبر کرے۔ وہ اس لڑکی سے جسبانی تعلق بنائے اور اسے ظالمانہ دم کے ذائقہ بنائے۔ کیا

ایسا ہو سکتا ہے؟

یہ بے حد سنگین سوال تھا اور اس زہر بھری رات میں رستم اس جان لیوا سوال کے دورا پر پُران کھڑا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک کارانی سے تعلق جوڑنے والے کے لئے یہاں بڑی ہسیا تک۔ کتنی کتنی ہے۔ یہ زندہ جلائے جانے کی نذر تھی۔ اور اس کی ایک کڑی سزا خود رستم کی اپنی سوچ بھی اسے دے سکتی تھی۔ یہ سزا تھی، شافی بی بی سے بے وفائی کا احساس۔ وہ سوچنے کا کیا وہ اس احساس کو کھیل سکے گا؟ وہ زندہ رہے گا۔ بے شک جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، اس میں اس کی اپنی جاہت کا دور دور تک دخل نہیں تھا۔ پھر بھی ایک تعلق تو تھا۔ اُن چاہا کہ لیکن ایک ملاپ تو تھا۔

وہ جو بڑے بڑے حوادث کے سامنے بھی اپنے دل کی رفتار کو معمول کے مطابق پاتا تھا، آج اس دورا پر اپنے سینے میں دھڑکنوں کو زیر و بر محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی نمی محسوس ہوئی۔

زری کی سرگوشی نے اسے چونکا دیا۔ ”تمہارے چہرے پر پٹی کیوں ہے؟ تم کو گودام میں چھوٹ لگا؟“ وہ اس کے چہرے پر ہاتھ بھرتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔“ رستم نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے بے ساختہ رستم کی پٹی کو دو تھامیں بار چومایا۔ وہ اس طرح رستم کی تکلیف کو سکون دینا چاہ رہی ہو۔ اس سے پہلے وہ رستم کے ڈنکی کھدے کو بھی اسی طرح چوتی تھی۔ ادنیٰ لمبا دے کے اندر اس کے پار و رفت بدن کے خدو خال بڑی بے باکی کے ساتھ رستم کے پہلو سے ہم کلام تھے۔ ایک حیوانی سی خود بہرہ گیری تھی اس کے اعجاز میں۔ وہ کچھ بھوکھ جانتی تھی لیکن خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا جانتی ہے۔ اس کی جبلت، بے ساختہ انداز میں اسے رستم سے پیوست ہونے پر مائل کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے یہ قربت اسے ابھی لگ رہی ہے اور وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جانتی کہ کیوں ابھی لگ رہی ہے۔

وہ بڑے کٹھن لہے لہے۔ کچھ دیر میں رستم صدیوں کے جاں غسل متذبذب سے مگر گیا۔ یہ سب غلطی تھیں کہ پانچیں کیوں اس کا دل گھمای دے رہا تھا یہ لفظ نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی مرنے والے شخص کو اس کے جڑوں میں سے کھینچا جائے۔ اس نے دل کو پھڑکیا۔ اپنی آنکھیں بند کیں اور زری پر جھپک گیا۔ اس کے ہونٹ زری کے دہشتی چہرے سے ٹکرائے۔ وہ تو جیسے جسم شعلہ تھی اور ڈراما ہوا کی منتظر تھی۔ وہ چند ہی لمحوں میں رستم سے قریب تر ہو گئی۔ گہری تاریکی میں اس کے بازو رستم کے گرد دھماں ہو گئے۔ اس

کے ہونٹ بے تابانہ رستم کے چہرے کو ٹٹولنے لگے۔ رستم نے خود پر بے پناہ جبر کرتے ہوئے اسے اپنی طرف بڑھنے دیا۔ اور وہ بندی سے گرنے والے طوقانی رینگے کی طرح بڑھتی آئی۔ لیکن پھر اچانک کچھ بھی رستم کے بس میں نہیں رہا۔ وہ یکا یک لا چار ہو گیا۔ وہ جیسے ہٹ گیا۔

نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ حالات کا بڑے سے بڑا اجاز۔ وقت کی سخت سے سخت مجبوری۔ زندگی کی سنگین سے سنگین ضرورت۔ کچھ بھی اسے یہ حق نہیں دیتا کہ وہ بی بی سے بے وفائی کرے۔ یہ اس کی موت ہوگی۔ یہ اس کی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہوگا۔ اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی اسے بی بی سے ملنا تھا۔ کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا تھا۔ اسے اپنی پائوں میں لے کر اپنے سینے میں سونا تھا اور اس کے کان میں دل کی گھبراہٹوں سے اٹنے والی لافانی سرگوشی کر رہی تھی۔ "میں آپ سے عشق کرتا ہوں۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ذری کی گرفت ختم ہوگئی۔ بس اس کا ایک ہاتھ رستم کے شانے پر تکا رہا۔

"تم کو کیا ہوا؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"کچھ نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" رستم نے کہا۔ "تم یہاں لیٹو۔"

وہ اطاعت مندی سے لیٹ گئی۔ رستم نے آنکھیں سے چار پائی چھوڑ دی۔ وہ بہت احتیاط کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں کی آہنی بیڑی آواز پیدا نہ کرے۔ گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وسیع کمرے کے دوسرے گوشے میں ناصر سو رہا تھا۔

"تم کتنی دیر میں آئے گا؟" تاریکی میں سے ذری کی سرگوشی ابھری۔

"ابھی کچھ دیر میں۔ تم لیٹ رہو۔" رستم کے لیے میں ہلکی سی جھنجھٹا ہوتی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا دروازے تک آیا۔ اسے کھولا اور باہر برآمدے میں نکل آیا۔ یہ برآمدہ ایک طرح سے گھن کا حصہ ہی تھا۔ بس سامنے کے لئے نکڑی کی دھولان چھت۔ نادانی تھی۔ رستم کا جسم آگ کی طرح چپ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائ نے اسے کچھ سکون دیا۔ ایک طرف چٹری چھوٹی سی منڈ بڑھی۔ وہ اس منڈ پر بیٹھ گیا۔ اپنی کھپیاں اپنے گھنٹوں پر دکائیں اور اپنے لیے بالوں کو انگلیوں میں پکڑ لیا۔ اس کا دماغ بڑی کی طرح ابل رہا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹے سے ڈر ہا نما کمرے میں داس کی تین جاگیر کرباں خاموش بیٹھی تھیں اور اس تاریک سردرات کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ پھر بھی میں کوئی نوخیز کتا کسی شہم گرم کونے میں دبا ہوا چوں چوں کی باریک آواز نکال رہا تھا۔ رستم اپنے بالوں کو انگلیوں میں پکڑے بیٹھا رہا۔

اور سوچتا رہا۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ وہ اس لڑکی کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ رستم کو وہ لئے اچھی طرح یاد تھے جب ذری اپنے نامعلوم احساسات سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار رستم کی مدد کے لئے آئی تھی اس اور ایسا دوسرے ہوا تھا۔ پہلی بار جب بستی سے باہر دھولان پر "نہ مان" نے عقب سے اچانک رستم پر حملہ کیا تھا اور ذری اس کے آڑے آئی تھی۔ دوسری مرتبہ دو دن پہلے جب وہ گودام میں پہلے رنجھو کا خاتمہ کر کے مطمئن بیٹھا تھا اور ذری باہر جاتی ہوئی اس کی مدد کو پہنچی تھی۔ رستم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے خاص قسم کا ہنڈ پر رکھی ہے۔ ایک ایسا ہنڈ جو بہت ہی سادہ اور فطری تھا۔ ایک نو جوان لڑکی کا اپنے من پسند مرد کی طرف جھکاؤ۔ یہ کوئی عشق قسم کی چیز نہیں تھی، نہ ہی اسے اپنی درجے کی محبت کہا جاسکتا تھا۔ یہ بس ایک سادہ لوح لڑکی کی خود زحمت تھی جس میں جتنی کشش کو بھی مل چلا تھا۔ رستم کو ان چیزوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو بس چاہتا تھا کہ کسی طرح اس لڑکی کی جان بچ جائے۔ وہ بالکل صحت کے دہانے پر تھی۔ اور آج رات ایک عجیب اتفاق اسے مشکل سے نکال کر رستم کے پہلو میں لے آیا تھا۔

اچانک وہ چونک گیا۔ اسے اپنے پہلو میں بیڑی کی ہلکی سی کھڑکڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ناصر تھا۔ وہ مخصوص اعزاز میں چلا ہوا اس کے قریب آن بیٹھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" ناصر نے پوچھا۔

"تم جاگ رہے تھے؟" رستم نے اس سے انسا سوال کیا۔

"نہیں، جب آپ نے دروازہ کھولا تو میری آنکھ کھل گئی۔ خیر تو ہے؟ آپ اس وقت یہاں بیٹھ چلے؟" ناصر کے کچے میں ٹھوڑی حیرت تھی۔

"تم نے میرے بستر کو دھیان سے نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی موجود ہے یا؟"

"کیا؟" ناصر اچھل پڑا۔

"ہاں۔ وہاں لفافے کے نیچے ذری ہے۔"

ناصر نے پہلے تو غیر یقینی نظروں سے رستم کو دیکھا پھر اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں اٹھ گئے۔ "اوکاڈ۔" یہ کیسے ہوا؟

"میں خود حیران ہوں۔" رستم نے سرگوشی کی۔ "پتا نہیں یہ مجاریوں کے پاس سے کیسے نکلے۔ اور یہاں کیسے پہنچی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے دیوار اور غیرہ پھاڑی ہے۔ ایسے کام یہ آسانی سے کر لیتی ہے۔ وہ ایسے ہی داس مجھے بتا رہا تھا کہ یہ مقدس مشروب کی رات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آج مجاری خانے کے بہرے دار بھی نہ بنے ہوں گے اس لئے شاید اسے بھاگنے

کا موقع ملا ہے۔

”کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تو نہیں پہنچ جائے گا؟“ ناصر کے لیے میں تشریض تھی۔

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس وقت تو ہماریاں سواریاں ہوں گی لیکن جب بھی کوئی جاے گی اور زری کو غائب پائے گی، اس کا دھیان سیدھا اس کے گھر کی طرف ہی جائے گا۔ وہ لوگ سریت بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”پھر اب کیا کرتا ہے؟“ ناصر نے پوچھا۔

”میری سوال میں تم سے کہنا چاہتا ہوں ناصر! کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ روڈن بعد زری کی جان بچ سکے؟“

”کیا ایک بار پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے؟“ ناصر ہونے سے مسکرایا۔

”ان شخصوں بیڑیوں کے ہوتے ہوئے یہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔“

”یہاں رہتے ہوئے کیا ہو سکتا ہے؟“ ناصر نے کہا۔ پھر اچانک وہ چونک گیا اور فرما

”میرا رستم کی طرف دیکھنے لگا۔ رستم نے رستم کو اس کا چہرہ دکھایا تھا۔ اس کا چہرہ چاقوں کے پیا لے میں تھا اور لیے بال بھول رہے تھے۔ ناصر کبھی نہ خاموش بیٹھا رستم کو دیکھتا رہا پھر بات آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔

رستم نے کھوئے انداز میں سر گھومی کی۔ ”کہتے ہیں کہ جان بچانے کے لئے

”مردار“ تک کھانا جائز ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کی بہت قیمت ہوتی ہے۔“

”آ۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن۔۔۔“

”مناہ اور روٹا اب کی بات ذہن میں آتی ہے۔ ہم دونوں کا علم اس معاملے میں بہت کم

ہے اور میرا تو تم سے بھی کم ہے لیکن میرے دل سے ایک آواز ضرور آتی ہے ناصر! انسان کی

”نیت“ بہت اہم ہوتی ہے اور ہماری نیت بد نہیں ہے۔“

ناصر نے ایک گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہم جس قسم کے لوگوں اور ان

کے جس طرح کے عقیدوں میں بھٹے ہوئے ہیں، ہم عام انداز سے نہیں سوچ سکتے اور نہ ہی

کسی مسئلے کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔“

”زری کی جان بچانے کا راستہ وہی ہے ناصر جو اس نے بتایا تھا۔ زری کی دوشیزگی کی

اس کی موت ہے۔ اس کو موت سے دور کرنے کے لئے اسے دوشیزگی سے دور کرنا ہوگا۔“

”مرد کو اس کی زندگی میں آنا ہوگا۔“

”لیکن اس کی زندگی میں آنے والے کے ساتھ یہاں کا قانون کیا سلوک کرے گا؟“

”ظاہر ہے کہ یہ بدترین سلوک ہوگا، لیکن یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا اور میں یہ اندازہ

مول لینا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے یقین ہے ناصر۔ برق جان مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کل یہی بات مجھے

واس نے بھی بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برق جان کو کسی وجہ سے میری ضرورت ہے اور میں ہر

حال میں اسے زندہ درکار ہوں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو شاید اب تک فرار ہونے کے جرم

میں ہمارے گھنے توڑ دیئے گئے ہوتے اور محاذ کی موت کے بدلے، ہم میں سے کم از کم ایک

شخص کو سزا موت بھی دی جا چکی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ برق جان نے ہمارے لئے

رعایتیں ڈھونڈ لی ہیں، خاص طور پر میرے لئے اور لیکن یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی ڈھونڈے

گا۔“

”لیکن کچھ بھی ہے رستم بھائی! برق جان سیاہ و سفید کا مالک تو نہیں۔ ان لوگوں کا پورا

ایک جرم ہے اور پھر یہ جو بھاریاں ہیں ان کی اپنی طاقت بھی ہے۔ اگر اتنا بڑا جرم ہوا تو یہ

بھاریاں چپ نہیں رہیں گی۔ وہ جرم کو سزا لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔“

”پھر بھی ہوگا وہی جو برق جان چاہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رستم خان کی شکست کے

بعد وہ بہت زیادہ اختیار اپنے پاس سمیٹ چکا ہے۔“

”تو آپ چاہتے ہیں کہ۔۔۔“ ناصر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد رستم نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”ہاں ناصر! میں یہ چاہتا

ہوں۔ لیکن میں کر نہیں سکتا۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔“

”میں سمجھا نہیں رستم بھائی۔“

”میں شاید تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔“ رستم کے لیے سے عجیب لاچارائی نکل رہی تھی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ ناصر بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ فریٹی ہوا مختصر صحن میں پکرا

رہی تھی اور ان کے چہروں کو بچھو رہی تھی۔ چاند آج گہرے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ یہ بڑے

گھمبیر لمبے تھے۔ آخر رستم نے مدھم سر گھومی کی۔ ”بی بی میرے سامنے آ جاتی ہے ناصر۔ میں

خود ہر تو ہر جبر کر سکتا ہوں مگر بی بی کے خیال پر نہیں۔“

”تو پھر؟“

”میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے ناصر۔“

”وہ کیا؟“

”یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے، بس ایک کام ہو سکتا ہے۔“ رستم نے کہا

”آپ کی بات اب بھی ادھوری ہے۔“

”جو میں کہوں گا وہ کرو گے؟“ اس بار رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

”آپ کے کہنے پر اپنی جان اسی وقت آپ کے حوالے کر سکا ہوں۔“ ناصر کے لہجے میں غیر مشروط وفا تھی۔

رستم کی آنکھوں میں مدھم چمک ابھری۔ وہ بولا۔ ”میں نے انہیں ایک دن ڈھوک
شاہاں والا واقعہ بتایا تھا ناں۔ ہیڈ کا فیصل جبر والا۔“

”جس کے منہ پر آپ کے پھینکے ہوئے دسی بم کے ذرے گئے تھے اور اس نے منہ پر پٹیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔“

”ہاں۔ جبر کو مارنے کے بعد وہ پٹیاں میں نے اپنے چہرے پر لپیٹ لی تھیں اور جبر کے کپڑے پہن کر آسانی سے پولیس کیمپ میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی نے پچا نہیں تھا مجھے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”میں ایک بار پھر دوسری طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت جبر دلی پٹیاں میں سے اپنے چہرے پر چلتی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تم میری آنکھوں سے اپنا چہرہ چھپاؤ۔“ رستم کی آواز میں ڈرامائی کیفیت تھی اور وہ بالکی اس لرز بھی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ غصہ سے ہوئے مفتی خیر انداز میں بولا۔

”مجھے یقین ہے ناصر! اس اندھیری رات میں..... فری نہیں بچان نہیں سکے گی۔“

ناصر پھر کراہتا ہوا بیٹھا رہا۔ اب پوری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اور اس بات کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ رستم مسلسل ناصر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان تہلکہ خیز خاموشی سنسٹا رہی تھی۔ پھر ناصر کا چہرہ آپوں آپ غیر محسوس طور پر جھک گیا۔ رستم اپنی چیٹائی اور اپنے بائیں رخسار کو ڈھانپنے والی طویل ہٹی کونے میں مصروف ہو گیا۔ وہ کچھ ہٹی کھول چکا تھا جب ناصر نے اسے ہاتھ سے اشارے سے روک دیا۔

”نہیں۔۔۔ آج رستے دیں۔ میں دوسری ہٹی لے کر آ رہا ہوں۔“

اگلے قریب ایک گھنٹے میں جو کچھ ہوا اور ستم کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ یہ سادہ صورت حال بڑی ذرا مایوسی ناکہ ناصر..... ستم کے سبب * اندر کی گئی تھی۔ اس کے جسم پر تقریباً وہی لباس تھا جو ستم کے جسم پر تھا۔ اپنے سر، پیشانی اور چہرے کے کچھ حصے کو جاسمین سفید

میں نے پلٹ لیا تھا۔ درحتمن سے اسی امکان کا خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی۔ درحتمن ہمارے
 تھا۔ وہ ہر آدے کے ایک گوشے میں کھیل لے خاموش بیٹھارہا اور اس تارک یک سردرات کے
 انوکھے چن پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ صحیح ہے یا غلط..... لیکن
 اسے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک انسانی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس جان کے بچنے کی
 کوئی اور صورت موجود نہیں تھی۔

کئی اندیشہ بھی اس کے ذہن میں ہلدا رہے تھے۔ ان میں اہم ترین اندیشہ یہی تھا کہ کہیں زری، ناصر کو کچا پکانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسرا اندیشہ وہاں پانچ خانہ میں سے کسی کے جاگ جانے کا تھا۔ تیسرا اندیشہ کسی بیرونی مداخلت کا تھا اور یہ اندیشہ بھی خاصا اہم تھا۔ ان اندیشوں سے نیرو وازانو نے کے ساتھ ساتھ رحمت آرمے والے گھوڑوں کی پانچنگ بھی کر رہا تھا۔ دو فیصلہ کر چکا تھا کہ ناصر کے باہر آج ہی دو اندر جاگے گا اور زری سے گھمے گھمے کا وہاب واپس بھاریوں کے پاس پہنچ جائے۔

آخر اسے اپنی بیڑی کی مدد سے اٹھ سٹائی دی۔ تاریکی میں ناصرو کا پہلا نظارہ آ۔ اندر جانے سے پہلے صبر کی ادنیٰ صدیقی رستم نے یاکن کی قسمی اور اپنی صدیقی ناصرو کو پہنا دی تھی۔ اب انہوں نے ایک بار پھر اپنی صدیاں تبدیل کر لیں۔ گہری تاریکی میں دونوں ایک دوسرے کے چہرے ٹھیک سے دیکھ لیں سکے تھے اور ایک طرح سے یہ ان کے لئے اچھا ہی تھا۔ اب کوئی بات کہنے بغیر رستم کمرے کی گہری تاریکی کی طرف بڑھا اور ناصرو آدے میں موجود رہا۔

یہ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ ذری پچھلے ایک مہینے میں ایک ایسے شخص کے ساتھ یہاں موجود رہی تھی جو اس کمرے میں قہا می نہیں اور جو اس کمرے میں قہا، اس کے بارے میں وہ سچ بھی نہیں کہتی تھی۔ اس ہستی کے جنونیوں کے ساتھ تو حو کا ہوا می قہا، خود ذری کے ساتھ بھی دھوکا ہوا تھا۔ لیکن اس دھوکے میں خیر کا پھلو یہ تھا کہ ذری کی جان بچنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

رستم بہت آہستہ آہستہ چلتا ہوا چارپائی تک پہنچا اور اندھیرے میں چارپائی کا ہارو ٹٹولنے کے بعد زری کے پہلو میں لیٹ گیا۔ کئی منٹ تک وہ خاموش لیٹا رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ دوسری چارپائی کے نیچے لائین کی جتنی میں تاریکی کچھ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس دم کو کوٹا سمر نے بھگدا تھا۔ یا پھر تو نے خود ہی اس شب کے حیرت کہہ میں گل ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔ خاموشی طویل ہوئی تھی۔

تاریکی میں زری کی سرگوشی ابھری۔ ”تم کہاں گیا تھا؟“
”مجھے شک ہوا تھا کہ باہر کے دروازے پر کوئی ہے۔ شاید ہوا کی وجہ سے آواز آئی۔“
”تھی۔“

”تمہارا دوست سویا ہوا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ بالکل بے خبر پڑا ہے۔“

وہ بڑی نرمی کے ساتھ اس کے بازو سے لگ گئی اور خاموش بڑی رہی۔ اس کے ہونٹ
رستم کے کندھے پر تھے۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے پھر رستم نے کہا۔ ”زری ارات آؤ گی
بے زیادہ گزر گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب تم وہاں جاؤ۔“
”میں نہیں جاؤں گی۔ تم بہت آچھا۔“ وہ اپنی ناک رستم کے بازو میں گھسیڑتے ہوئے
بولی۔ اس کے جسم سے سینے کی مہک اٹھ رہی تھی۔

رستم نے بڑی سختی سے اس کا کندھا پکڑا اور سر راتی سرگوشی میں کہا۔ ”دیکھو زری! اب
میں جو کہوں گا تمہیں وہی کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم سب کا نقصان ہوگا اور تمہارا بھی۔ میری بات
پورے دھیان سے سنو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔“

رستم کے کچے نے اسے جیسے لرزادیا۔ رستم کے بازو پر اس کے ہاتھوں کی گرفت و شبلی
پڑ گئی۔ رستم نے کہا۔ ”تم اب واپس اپنے کھانا پر جاؤ گی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاریاں جاگ گئی
ہوں اور تمہیں ہی ڈھونڈنی پھر رہی ہوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو تم بڑی مایاں (بڑی بھاری) کو
دیکھاؤ گی اور اسے بے خوف سب کچھ بتاؤ۔“

”تک۔ کیا بتاؤ۔“

”وہی۔۔۔ جو سب کچھ ہوا ہے۔ اسے کہنا کہ تمہارا دل اپنے چاچا اور چائی کو دیکھنے کو
چاہ رہا تھا یا کوئی بھی اور بات کہہ دو۔ یہ کہہ دو کہ تم مجھ سے ملنے یہاں آئی تھیں لیکن جب تم
یہاں آئیں تو میں نے تمہیں اپنے ساتھ لائالیا۔ اور وہ سب کچھ ہو گیا جو تم نے سوچا بھی نہ
تھا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ میں یہ نہیں کہوں گا۔ وہ تم کو بہت ماریں گے۔ وہ تم کو مار دیں گے۔
میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”زری!“ رستم نے دانت پیسے۔ ”بکواس کرو گی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“ اس نے
اتنی زور سے اس کا کندھا پھینچا کہ وہ سسک اٹھی۔ یقیناً کسی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے
تھے۔

رستم کو اپنے رویے کی خبر معمولی سختی کا احساس ہوا۔ اس نے زری کا کندھا چھوڑا اور خود
کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گری سانس لینے کے بعد اس نے نہایت نرم آواز میں
سرگوشی کی۔ ”زری! تم میری فکر بالکل نہ کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں بہت سوچ کچھ کر کر رہا
ہوں۔ برقی جان اور اس کے ساتھی مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں یہ بات بڑی اچھی طرح جانتا
ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہاری جان بچنے کی بھی اب پوری امید پیدا ہوگئی ہے لیکن شرط
یہی ہے کہ تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ تمہاریاں کے پاس جاؤ اور سب کچھ بے خوف ہو کر
بتاؤ۔“

وہ سسکی لے کر بولی۔ ”تم جو کہو گے۔ میں وہی کروں گا۔ لیکن مجھ کو یہ سب
کچھ بہت خراب لگتا۔ بڑی مایاں کو سخت فصرہ آئے گا۔ سب کو بہت زیادہ فصرہ آئے گا۔ بڑی
مایاں مجھ کو بہت سارے تپڑ مارے گی۔“

”یہ خوف ہے ٹو۔ تمہارے کھانا مشکل ہے کہ کھا کھانا؟ اب تمہارا نہیں کئے گا۔“ رستم نے
کہا پھر زرا توقف سے بولا۔ ”اور یہ سارے ضبیت تھے سے جھوٹ بولتے ہیں۔ لگا کتنے کی
بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی زیادہ کہ ٹو سوچ بھی نہیں سکتی اور نہ ہی اگلی دنیا میں کسی آلو
کے چنے سے تیری شادی ہونے والی ہے۔ یہ سب بکواس ہے۔ یہ ساری باتیں گارنیوں کو
جھوٹی تسلیاں دینے کے لئے کھڑی جاتی ہیں۔“

وہ سہم گئی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر زوردار آواز میں بولی۔ ”تم سنا چکے؟“
”بالکل سچ۔ چلو اب نکلنے کی تیاری کرو۔ جیسے خاموشی سے آئی ہو، ایسے ہی بالکل
خاموشی سے نکل جاؤ۔“

”لیکن اب مجھ کو بہت ڈر لگا۔ بڑی مایاں مجھ کو بہت زور زور سے بہت زیادہ تپڑ مارے
گی۔“

رستم کو اس اول جلول لڑائی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہ یہاں
سے تو چلی جائے لیکن بدک کر کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا اسے یہیں
رہنے دیا جائے اور پھر انتظار کیا جائے کہ صبح ہو جائے اور لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں
پہنچ جائیں۔ اچھی وہ اسی اوپر میں اس تھا کہ باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ زری کا پورا
جسم لرز گیا۔ وہ جلدی جلدی اپنے بالوں کو نوٹے کی شکل میں سینے لگی۔ دروازے پر زوردار
دنگ ہوئی۔ دنگ کا انداز ہی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ دوسری دنگ پہلی سے بھی
شدید تھی۔ یوں لگا کہ بیرونی دروازہ اکھڑا کر اس کے صحن میں آگرے گا۔ دوسرے کمرے

میں واس اور اس کی بیوی بڑا کراٹھ بیٹھے۔

”یہ کیوں ہے اس وقت؟“ خانم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”دیکھنا ہوں۔“ واس نے کہا۔ پھر لائینن کی کو اوچی ہوئی اور واس لڑکھڑاتا ہوا بیرونی

دروازے کی طرف بڑھا۔

”شاید بڑی ماں آگئی۔ وہ بالکل آگئی نہیں۔“ زری کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

دروازے کی جانب سے مختلف آوازیں ابھرئیں۔ یہ مردانہ آوازیں تھیں۔ محافظ مقامی

زبان میں واس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ان کے لیے حتمی تھے۔ واس حیرت کا اظہار کر رہا

تھا۔ پھر بھاری قدموں کی چاپ گھر کے اندر سنائی دینے لگی۔ چند لمبے بعد کمرے کے

دروازے پر تین بٹے کے مسلسل محافظ نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لائینن تھی۔ ان

کے عقب میں رستم کو چالیس پچاس سال کی ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے سر پر موٹی

اودھنی تھی اور گلے میں بہت سی کالا مینا کھڑکھڑا رہی تھیں۔ رستم گھبرا گیا کہ یہی بڑی بھاری

ہے۔ اسے دیکھتے ہی زری کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔

زری کو کمرے کے گوشے میں دیکھتے ہی بڑی بھاری محافظوں کے درمیان سے راستہ

بناتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے چہرے پر دڑلے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بھاری کے

ساتھ پر نیلے رنگ سے چند ستارے سے بٹے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ جھریوں بھرا تھا۔ اس

نے محافظ کے ہاتھ سے لائینن کو اٹھا کر زری کے چہرے کے عین سامنے کیا اور وہ بیان سے

اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کمرے میں موجود محافظ بالکل اربٹ لٹھارتے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ٹرلٹھ اور رائفلیں

تھیں اور آنکھوں کی سرخی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خمار آور شراب کے زیر اثر ہیں۔ تیسرا محافظ

برآمدے کی طرف نکل گیا تھا۔

زری کو کمرے میں دیکھ کر بوڑھا واس بھی حیران دکھائی دینے لگا۔ وہ کبھی زری اور کبھی

رستم کو دیکھ رہا تھا۔ بھاری کے ہاتھ میں لائینن تھی اور اس کے چہرے کی بیگانگی کیفیت بڑھتی

جاری تھی۔ رستم نے ہاتھ کا بڑی بھاری کی تجربہ کیا لیکن صرف عورت کا چہرہ دیکھ کر اور اس

کی آواز سن کر اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیتی ہے۔ بڑی بھاری کے علاوہ بھی دو تین

تجربہ کار بھاریاں ایسی ہی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر یہاں تو ”محاملات“ دیے ہی واضح نظر

آ رہے تھے۔ زری کی یہاں موجودگی اور اس کا طہیہ ہی چلا کر ساری صورت حال کی

وضاحت کر رہا تھا۔

ایک بھاری قبر تک انداز میں چلائی۔ اس نے لائینن نیچے رکھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑنے لگی۔ وہ مقامی زبان میں خوفناک دادیلا بھی کر رہی تھی۔ اس کے ہارے جسم پر عجیب لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ دونوں محافظ طاہلوں کی طرح رستم پر بیٹھے اور انہوں نے رستم کو نیچے گرایا۔ رستم نے حتی المقدور مزاحمت کی مگر اس کے دونوں پاؤں بیڑی کی کنوٹس گرفت میں تھے۔ اس نے ایک حملہ آور کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ مگر دوسرے محافظ کی رائفل کا وزنی دست اس کی کٹھنی پر لگا اور اس کی آنکھوں میں تارے تاج گئے۔ اسی دوران میں بڑی بھاری خود بھی وحشیانہ انداز میں رستم پر بھٹ پڑی۔ اس نے رستم کے چہرے پر دو جھڑ مارے پھر تانفوس سے اس کی آنکھیں اونچے کی کوشش کی۔ رستم نے کٹھنی سے اس کی گردن پر ضرب لگائی اور وہ کسی ڈنڈی جانور کی طرح چلائی ہوئی کمرے کے وسط میں جا گری۔

پیلے محافظ کی رائفل پر ایک فٹ لمبی سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی رائفل کو بھالے کی طرح کپڑا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ دو سنگین گولہ رستم کے سینے سے پار کر دینا چاہتا ہے۔ زمین پر گرنا اور رستم اس کے لئے ایک بہترین بوف ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک ایک واس اس کے سامنے آ گیا اور محافظ کی اوپر بھی ہوئی رائفل قیام لی۔ محافظ نے بہت کوشش کی مگر واس نے رائفل نہیں چھوڑی۔ کمرے میں کچھ آدم سا بچا ہوا تھا۔ رستم نے دیکھا، زری صدمے سے بے ہوش ہو کر ایک کونے میں گر بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی لہا وہ سٹ کر اس کی پنڈلیوں اور گھٹنوں کو خراں کر رہا تھا۔ کمرے کی دہلیز پر تیسرے محافظ نے رائفل ناصر کے سر سے لگا رکھی تھی اور اسے گھٹنوں کے بل بیٹھے پر مجبور کر رہا تھا۔ بڑی کی وجہ سے ناصر بھی بے بس تھا۔

واس بلند آواز میں سنگین بردار محافظ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جو چند الفاظ رستم کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ محافظ رستم پر ایسا دار کرنے سے روک رہا ہے جس سے رستم کی موت واقع ہو جائے۔ کیونکہ رستم کی سزا صرف موت نہیں تھی۔ اگر وہ واقعی گارنٹی کے ساتھ جوسانی تعلیق بنا چکا تھا تو پھر وہ عہدت ناک موت کا حق دار تھا۔ شاید یہ بات مشتعل محافظ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ قہر سے ڈھیل پڑ گیا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار خور کر رستم کی پٹلیوں میں لگائی اور گایاں بکتے ہوئے رائفل کی نال رستم کے سینے پر رکھ دی تاکہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ رستم کے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا اور کندھے کا زخم بھی تازہ جھروس ہوئے لگا تھا۔ بڑی بھاری مسلسل خوفناک دادیلا جاری تھی۔ کبھی وہ اپنے گال تپتی، کبھی دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتی اور نہ کرتی۔ واس نے ایک محافظ کے ساتھ مل

"میں تم کو اتنا کم ہست نہیں سمجھتا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ زری کی جان بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا؟"

"اگر ہوتا تو تمہاری سمجھ میں شاید مجھ سے پہلے آ جاتا۔ مگر تم مجھے یہ سب کچھ نہ کرنے دیتے۔" رستم نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ کی یہ تو جین مجھے زری کی موت سے بدتر لگ رہی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی تو جین شو جین نہیں۔ بندہ اندر سے مطمئن ہو تو باہر کے حالات اس کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ بس دعا کرو کہ برقی جان بھاریوں کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے۔ بڑی غصیٹ عورتیں ہیں یہ۔ ہستی میں ان کا اپنا طیلندہ اثر دروغ ہے۔"

صبح ہونے سے پہلے پہلے رستم اور ناصر کو اس کے گھر سے ایک دوسری چار دیواری میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ گھر چنگی پھٹ والے دو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ ذرا بلندی پر واقع تھا۔ برقی جان کی نیلے جینڈے والی رہائش گاہوں کے ساتھ یہ واقعہ تھی۔ یہاں تین مسلح محافظ موجود تھے۔ دو دروازے پر اور تیسرا گھر کے اندر۔ یہ تینوں کرخت صورتوں اور بھاری آوازوں والے پاؤں کے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے ایک اور تبدیلی آئی۔ شریف کو بھی اس چار دیواری میں منتقل کر دیا گیا۔ پچھلے چند ہفتوں میں شریف کا کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ پتلے بن گئے تھے۔ رستم اور ناصر نے ایک اور بات محسوس کی۔ وہ ذرا سی آہٹ پر ہلک جاتا تھا۔

"یار کیا بات ہے۔۔۔ مرد ہو۔ ویسے بھی اب تم بالکل ٹھیک ہو۔" رستم نے کہا۔

شریف نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنسو اس کی چٹکوں کے پیچھے سے نکل کر زردی لالک رخساروں پر پھیل گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آہٹ میں سر ہلکا کر رستم کی بات کی تائید کی۔

ناصر نے اشارے سے رستم کو باہر بلا لیا۔ دروازہ بند کر کے ہولے سے بولا۔ "اس میں شریف کا کوئی قصور نہیں۔ اسے بڑی کمزوری لگ رہی ہے، اس کی بیماری ہے۔ شریف بلندی سے خوف کھاتا ہے۔ اسے ڈاکٹری زبان میں بلندی کا فوبیا کہہ سکتے ہیں۔ ایسا نقص بعض اوقات تین چار منزلہ مکان سے پیچھے دیکھ کر خوف سے چلتا ہو جاتا ہے۔ شریف کو ہزاروں فٹ گہری کھائی میں رہنے سے لگ کر آرتھرائٹس۔"

"لیکن پہلے تو یہ آرتھرائٹس تھا۔"

"پہلے اندھ رہا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر جب صبح کی روشنی پھیلی شروع ہوئی تو اس کے لئے یہ سب کچھ کرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ جین پر بے پناہ دباؤ ڈرنے کے سبب اس کی حالت غیر ہوئی اور اسے دل کا دورہ پڑا۔"

"مگر اب تو ان باتوں کو کئی مہینے گزر چکے ہیں۔" رستم نے کہا۔

"جو شہید کا دھماکا لگا ہے، اس کا اثر دور ہوتے ہوئے کچھ وقت لگے گا۔" ناصر نے کہا۔ "بہتر ہے کہ ہم اس کے سامنے اس واقعے کا ذکر بھی نہ کریں۔"

شریف کو دوبارہ اپنے درمیان پا کر وہ دونوں خوش تھے۔ تاہم زری کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہے۔ ناصر اس کی طرف سے خاص طور پر پریشان تھا۔ وہ رستم سے پوچھنے لگا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اسے واپس بھاریوں کے پاس بھیج دیا جائے گا؟"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہوگا۔ برقی جان اس سارے واقعے کو چھپانا چاہتا ہے۔ تین مہینوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اس واقعے کو راز میں رکھنے کے لئے برقی جان انہیں کہیں بند بھی کر سکتا ہے مگر بڑی بھاری کو اپنے بس میں رکھنے کے لئے اسے محنت کرنا پڑے گی۔ بڑی محنت پر ضرورت ہے چاہے ہی کی گھارٹی کو خراب کرنے والے کو ہر بات ناک سرائے۔"

"کہیں ان لوگوں کے درمیان کوئی پھوٹ نہ پڑ جائے۔ ایسا ہوا تو شوخم خان کو وار کرنے کا موقع مل جائے گا۔" ناصر نے خیال ظاہر کیا۔

"برقی جان میں ہوشیاری تو نظر آتی ہے۔ وہ یقیناً کوئی حل ڈھونڈ لے گا۔"

"میں زری کی طرف سے پریشان ہوں۔" ناصر نے بے ساختہ کہا تو رستم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پرسوں رات جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد ناصر کا زری کے بارے میں فکرمند ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ زری جو کل تک ناصر کے لئے کچھ بھی نہیں تھی، آج بہت کچھ ہو گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والا پہلا مرد بن گیا تھا اور یہ سب کچھ اتنے عجیب انداز میں ہوا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھا۔

رستم نے کہا۔ "اس کے بارے میں اطمینان رکھو۔ وہ زندہ رہے گی، کوئی خفیہ بھی نہیں ہوگی اس پر۔"

"لیکن میں اس بارے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔" ناصر کا لہجہ گھمبیر تھا۔

ناصر کی آنکھوں میں دیکھ کر چاک ایک رستم کو اندازہ ہوا کہ ناصر ذری کے ساتھ کسی اُن دیکھی دُور سے بندھ چکا ہے۔ ایک رستمی تاریکی میں یکا یک پروان چڑھنے والا ناتاجو ناصر کے اندر گہرائی تک سرایت کر گیا تھا۔

رستم نے ناصر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ناصر! ہر سو رات جو چمکے ہوا ہے زیادہ بچیگی سے نہ لینا۔ وہ ایک ضرورت تھی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں تم سے بھی شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم اس معاملے میں سمجھ گئے۔"

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کی آنکھوں میں غم کی گہرائی پر چمنائیاں بدستور مودہ رہیں۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ بھی تو اس کی بچیگی، مرنے سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے بچانے کے لئے ہمیں اس کے ساتھ ایسا کچھ کرنا پڑے گا۔ وہ بہت سیدھی سادی ہے رستم بھائی! بہت معصوم۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے مگر اس کی موت ہمیں کہیں زیادہ دکھی کرتی۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کیا ہم واقعی اسے بچا سکتے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رستم نے کہا۔

"لیکن یہ کچھ نہیں آتی کہ وہ کل رات اس کے گھر میں بیٹھی کیسے۔ کیا وہ دیوار پھاند کر آئی تھی؟"

"ایک نہیں دو دیواریں۔" رستم نے جواب دیا۔ "پہلے اس نے چار خانے کی دیوار پھاندی جو کافی اونچی ہے۔ اس کے بعد اس کے گھر کی دیوار پھاندنا اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہے، وہ خطرناک دھولوں پر بھاتی پھرتی ہے اور لمبی کی طرف درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ چار خانے کے چوکیدار بھی نشے کے خمار میں تھے۔ اس وجہ سے بھی اسے آسانی ہوئی۔"

مکان چونکہ اونچائی پر تھا اس لئے سلاخ دار کھڑکی سے ارد گرد کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ جہوار کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ برق جان کی رہائش گاہ کے سینے سامنے ایک کھلے میدان میں بھاری بھر کم لہادوں اور موٹی اوڈھلیوں والی پاؤندہ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ انہوں نے وزنی گینے پہن رکھے تھے اور نظریوں کی دلکش آواز میں ان کے قدم ایک ترتیب سے اٹھ رہے تھے۔ دوسری طرف نیزے کے ڈریبلے برف میں سے چوب آکھاڑنے کا مقابلہ ہونے والا تھا۔ چوہیں گاڑی جاری تھیں اور گھڑاؤ جیتنے یزوں کے ساتھ خود کو "وار" آپ" کر رہے تھے۔ میدان کے پس منظر میں پر فیلٹی دھولوں میں تھیں اور دور شمال شرق کی

طرف کے ٹو کی عظیم الشان سفید چوٹی نیگیوں آسمان کو بھونکی نظر آتی تھی۔ یہ بڑے دلکش مناظر تھے اور دیکھنے والی کی آنکھ کو مہموت کر دیتے تھے۔

رستم وہاں سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے ملے بغیر اسے ارد گرد کے حالات کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ برق جان نے اس کو جان بوجھ کر اس سے دور رکھا ہوا ہے۔ سارا دن کھلے میدان میں کھیل مارتے ہوئے رہے اور رستم، ناصر اور شریف بند کمرے سے یہ مناظر دیکھتے رہے۔ سر پہرے کے فوراً بعد کارنیوں کے خون آلود کپڑوں کی فٹاش کی گئی۔ یہ خاکستری رنگ کے دو ادا لہا دے تھے جو لمبے ہاتھوں پر لہرائے جا رہے تھے۔ سینکڑوں لوگ رکوع کے اعزاز میں جھک گئے اور مناجات پڑھیں۔ دو بے گناہ جوان لڑکیاں ایک قہقہے رسم کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ بہر طور رستم اور ناصر کے لئے یہ اطمینان کی بات تھی کہ یہ دو تھیں۔ ذری ان میں شامل نہیں تھی۔ رات کو شملوں کی روشنی میں بھی جہوار کی گہما گہمی موجود رہی۔ رستم اور ناصر کا خیال تھا کہ اس گہما گہمی میں برق جان بھی نہیں نظر آئے گا مگر وہ نہیں آیا۔ نہ ہی وہ ان تینوں سے ملنے اس چار دیواری میں داخل ہوا۔ بعد ازاں ناصر کو ایک محافظ سے پتہ چلا کہ برق جان کو بخار ہے۔ اس گھر میں موجود تینوں محافظ وہی تھے جو کل رات وہاں کے گھر میں بھی موجود رہے تھے۔ وہ رات کی ساری صورت حال جاننے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے بڑی نفرت انگیز نظروں سے رستم کو دیکھ لیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک گھارتی کو داغ دار کرنے والا قابل نفرت شخص تھا۔ اس کی ساری دلیہ ان شہرت بھی اس عمل کی وجہ سے گہما گہمی تھی۔

اگلے روز جہوار کی تقریبات جوش و خروش سے جاری رہیں۔ رستی میں موجود دھاتی تین ہزار پاؤندہ ان رسوم میں حصہ لے رہے تھے۔ لوہے کے بڑے ہنجرے میں ریچھوں کے ساتھ باہر کھڑکیوں کی کشیتیاں بھی ہوئیں۔ تاہم یہ مقابلے اس لحاظ سے پھیکے رہے کہ ان میں دو چوٹی کے کھڑکی شامل نہیں تھے۔ رستم اس چار دیواری میں بند تھا۔ اور "نئے مان" اپنی عورتوں کی وجہ سے اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بہترین ریچھ بھی گودام والے دھاتے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ بہر حال اس کی کسر کھڑکی بازی اور نشانہ بازی کے مقابلوں میں پوری کی گئی تھی۔ سر پہرے کے وقت نشانہ بازی کا مقبول مقابلہ شروع ہوا۔ کھڑکی کے تین پہلوں پر لگے ہوئے تین سیڑیوں کو کم سے کم گولیوں سے اڑانا تھا۔ آخری یعنی فاصل مقابلہ دو پاؤندہ لڑکیوں میں تھا۔ سینکڑوں تماشا کشی سانس روک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رستم اور ناصر بھی اپنے کمرے کے اندر سے یہ نشانہ بازی دیکھ سکتے تھے۔ دونوں نشانہ بازوں کے قریب کھڑکی

تھیں اور اب ہر کس و ناکس پر موت برسا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ برقی جان کے ساتھی سنبھلے اور پوزیشن سنبھالنے، بیسیوں افراد گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں کورٹس، پیپے، مرد سب ہی شامل تھے۔ رستم اور ناصر کو ہر طرف زخمی تڑپتے نظر آئے۔ یہ دلدہز مناظر تھے۔ یوں لگتا تھا کہ گولیاں چاروں طرف سے آ رہی ہیں۔ درجنوں افراد اپنے ہی ساتھیوں کے پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ ناصر نے کانپتی آواز میں کہا۔

”بس دو کچھ سکتے ہیں۔“ رستم کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

بستر پر لیٹے لیٹے شریف کا رنگ ہلکی سی طرح زرد ہو گیا تھا۔ قریباً تین چار منٹ بعد دونوں اطراف سے باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ دونوں طرف کے جنگجوؤں نے باقاعدہ پوزیشنیں لیں لیں اور گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ اس گھر میں موجود تینوں محافظ بھی شائع تھے۔ وہ صاف طور پر تذبذب میں نظر آتے تھے کہ لڑائی میں شریک ہوں یا نہیں۔ جین کی طرح برتی ہوئی گولیوں کے سبب رستم اور ناصر کھڑکی کے سامنے سے بہت گھسے اور چلی پٹ بند کر دیئے۔ اب وہ دو چھوٹے چھوٹے مشعل روزنوں سے ہی میدان جنگ کا نقشہ دیکھ سکتے تھے اور یہ نقشہ بہت تھکدہ نظر تھا۔ تراشا گاہ میں ہر طرف تراشائیوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ زخمی محفوظ مقامات کی طرف رینگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر دہائی ہوں کے دھماکے شروع ہو گئے۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی بو پھیلنے لگی۔

آدھ گھنٹے کے اندر صورت حال واضح ہو گئی۔ تیار کاری کہاں کہی کا فائدہ اٹھا کر شوقم خان نے جو اچانک حملہ کیا تھا، اس میں اسے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف برقی جان کے سو کے قریب حقائق کو ہلاک کرنے میں کامیاب رہا تھا بلکہ ہستی کے شرعی حصے پر انہوں نے دوبارہ قبضہ بھی کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر کنٹرول حاصل نہیں کر سکتے تھے پھر بھی کچھ نہ کچھ حوصلہ افزائی تو ان کی ہوئی تھی۔ لڑائی مسلسل جاری تھی۔ چھوٹے چھوٹے دقتوں کے بعد تاہم تو زائرنگ ہونے لگی تھی۔ فائرنگ کے درمیان دقتوں میں دونوں طرف کے جنگجو بھاگ بھاگ کر پوزیشنیں بدلنے نظر آتے تھے۔ سامنے کچھ قاصدے سے گاڑ حاسیاء دھواں اٹھ رہا تھا۔

اچانک اس بھاگ بھاگ اور اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ خون آلود تھے۔ اس نے آتے ہی ”با۔“ ملک برقی جان آ رہے ہیں۔ ان کے گھر میں فائرنگ سے آگ لگ گئی ہے۔“ ”یہ دھواں برقی جان کے گھر سے اٹھ رہا ہے؟“ ناصر نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اس نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ”برقی جان کا داماد سائی خان بھی زخمی ہوا ہے۔ وہ ابھی اپنے ساتھ سائی خان لار رہے ہیں۔“

اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ برقی جان اور اس کے پانچ چھ مسلح محافظ اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک محافظ کے سر کے بال جھپٹے ہوئے تھے اور صدری بھی جلی ہوئی نظر آتی تھی۔ دو تونمٹھا فٹوں نے اپنے ہاتھوں کی کرسی ہٹا کر اس میں سائی خان کو بٹھایا ہوا تھا۔ گول پیرے والے سائی خان کو رستم نے آخری مرتبہ جب دیکھا تھا جب اسے سرعام بازو کاٹنے کی سزا دی گئی تھی۔ تب وہ خاموشی سے منہ تھا مگر اب کھڑو دکھائی دیا۔ گولی اس کے گھٹنے میں لگی تھی اور پورا پاؤں لہلہا ہوا ہو رہا تھا۔ شریف کو اس کے لئے چار پائی خالی کرنا پڑی۔ شریف واپسی چار پائی پر گاڑ کئے۔ لگا کر سائی خان کو لٹا دیا گیا۔ سائی خان کی صدری (جیکٹ) کی بائیں آستین بازو سے نکالی گئی اور بیکواری قسم کا بصورت حال سائی کے سر برقی جان کی بھی تھی۔ جینی داماد اور سرداروں نے اپنے بائیں بازو سے خود مرے اور یہ سب کچھ اس شوقم خان کے گھر پر ہوا تھا جو خود بھی اسی نوعیت کے جرم میں ملوث پایا گیا تھا۔ وہ پارسانی کا علم بردار بننا تھا مگر ایک ساتھ دو دھوکوں کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ثابت ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ پاؤندہ ہستی بظاہر جتنی پارسا اور راست بنا نظر آتی ہے، حقیقت میں اتنی نہیں ہے۔ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یہاں انصاف کا معیار وہ نہیں تھا جو سمجھا جا رہا تھا۔ اگر معیار وہی ہوتا تو پھر آج شوقم خان کا ایک بازو بھی اس کے جسم کے ساتھ موجود نہ ہوتا۔

برقی جان کے ساتھ ایک بوڑھا مقامی معالج بھی تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی سائی خان کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ گولی سائی کے پاؤں کے اندر تھی اور خون مسلسل بہتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں لڑائی کچھ دیر کے لئے ختم ہو گئی۔ دونوں طرف سے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائی جانے لگیں۔ لاشیں ابھی تک برف کے میدان میں پڑی تھیں۔ برقی جان کے ساتھیوں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ انہیں آگے بڑھ کر اغوا یا ہستی میں لکی جکیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور شعلہ بھی دکھائی دیتے تھے۔ اچانک رستم نے دیکھا کہ شوقم خان کی سائین سے ایک پرچم بردار شخص آگے بڑھا۔ اس نے ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر زور زور سے کچھ کہا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ رستم نے اس سے پوچھا۔

”مقابلے کی دعوت دے رہا ہے، شوقم خان کی طرف سے۔“

”کیا کہنا چاہ رہا ہے؟“

”شوقم خان اپنے ہم منصب برقی جان کو مقابلے کی دعوت دے رہا ہے۔ شوقم خان نے

برق جان سے کہا ہے کہ اگر وہ دوبارہ مقابلہ کر کے اس لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو میدان میں آ جائے۔

رستم نے برق جان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یہ چیلنج سن چکا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ابھرنے لگی تھی۔

”کیا خیال ہے، برق جان مقابلے کے لئے نکلے گا؟“ ناصر نے اس سے پوچھا۔
 ”بہت مشکل ہے۔۔۔ یہ بات شوقم بھی انہی طرح جانتا ہے۔ برق جان کا صرف ایک ہاتھ ہے اور شوقم باہر ترین کلبازی باز ہے۔ اس صحر میں بھی وہ پہ آسانی دو تین ہندوں کو گرا سکتا ہے۔ ویسے شوقم نے یہ بھی کہا ہے کہ برق جان کے علاوہ کوئی کلبازی باز اس کے سامنے میدان میں آ سکتا ہے۔“

رستم نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہم میں سے کوئی جا سکتا ہے؟“
 ”اس کی اجازت تو برق جان ہی دے سکتے ہیں۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ اجازت دیں گے۔ خاص طور پر وہ تمہارے لئے کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور ویسے بھی تم پوری طرح لڑائی کے قابل نہیں ہو۔ تمہارے کندھے کا ڈم بھر سے تازہ ہو گیا ہے۔“

ناصر نے بھی اس بات کی پُر زور تائید کی۔ دوسری طرف برق جان اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کر رہا تھا۔ سب کے چہروں پر تشویش دکھائی دیتی تھی۔ رستم کو اس سے معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑائی کے دوران برق جان کے گھر کے سامنے تین دقتی بم پھٹے ہیں۔ اس واقعے میں برق جان کے کم از کم دس قریبی ساتھی ہلاک اور کئی درجن زخمی ہوئے ہیں۔ یہی لوگ برق کے دست بازو تھے۔

چند منٹ کے مشورے کے بعد برق جان نے تین افراد کو باقیوں سے علیحدہ کیا۔ ان میں سے دو برق کے قریبی رشتے دار تھے۔ اب ان میں سے ایک کا انتخاب ہونا تھا اور اس شخص کو شوقم سے مقابلے کے لئے جانا تھا۔ برق جان ان افراد کو لے کر علیحدہ کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بعد اچانک رستم کو اندازہ ہوا کہ ناصر اور دوسرے جو نہیں۔ اس کو بھی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے برق جان کے محافظوں سے پوچھا۔ ان میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ وہ تو تین افراد کے ساتھ ہی کمرے میں چلا گیا ہے اور اب برق جان کے ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس نے بھی خود کو متاثر کرنے کے پیش کر دیا تھا۔ رستم کے لئے یہ اطلاع تکلیف دہ تھی۔

اندھ بونے والا مشورہ غویں ہوتا گیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ شخص تیزی سے باہر نکلا اور کہ

سے باہر چلا گیا۔ ”کیا جان گیا ہے؟“ رستم نے اس سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ بڑی بھاری کی طرف۔ ایسے معاملوں میں اس سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ وہی کرے کہ تین چار منتخب افراد میں سے شوقم کے مقابلے پر کون جائے گا۔“

”یہ ایک سے ایک کے مقابلے والی بات میری کچھ نہیں آ رہی۔“

”مگر یہ یہاں کی روایت ہے۔ قبائلی جھگڑوں میں ایسا ہو کر رہا ہے۔“

باہر جانے والے عمر رسیدہ شخص کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگوں کی ڈوریوں کے چار ٹکڑے تھے۔ کچھ دیر بعد برق جان نے اس کو کچھ دانا، پالانا، دوا، جال، تانے، آگیا۔ ”یہ سب کیا ہے، ہاں؟“ رستم نے رہم لہجے میں دریافت کیا۔

”بڑی بھاری نے کہا ہے کہ گھٹوں اتھکے نہیں۔ یہ مقابلہ بندی ہو تو بہتر ہے۔ گارنی کے بیج نہ چڑھنے سے پوری ہمتی پر ہو جائے گی۔“

”تو پھر مقابلہ نہیں ہوگا؟“

”بھاری تو یہی کہتی ہے۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ اگر مقابلہ ضروری ہے تو پھر سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہو۔“

”ڈوریوں کا کیا پیکر ہے؟“

”یہ ایک طرح کی قرعہ اندازی ہے۔ برق جان اپنے ہاتھوں سے چار ”لڑاکوں“ کو چار ڈوریوں سے لگا۔ ڈوری کا رنگ فیصلہ کرے گا کہ کون کون سا شوقم سے مقابلے پر جائے گا۔“

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور سب افراد باہر آ گئے۔ رستم پر دیکھ کر چونکا کہ ان میں ناصر موجود نہیں۔ ”ناصر کہاں ہے؟“ رستم نے بلند آواز میں اس سے دریافت کیا۔

”اس کے چہرے پر ٹھیکل تھی۔ وہ صبر سے بونے لہجے میں بولا۔ ”ناصر کا چناؤ ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آیا ہے۔ وہ شوقم سے مقابلہ کرے گا۔“

”اودھ میرے خدا۔“ رستم نے سر ہکا لیا۔ پھر وہ جھپٹ کر برق جان کی طرف گیا۔ ”مجھ سے مشورے کے بغیر تم نے کیوں بھیجا ہے۔۔۔ کیوں ایسا کیا؟“

وہ اس نے رستم کے الفاظ کا ترجمہ کیا۔ برق جان نے جواب دیا۔ ”یہ میرا نہیں۔ تمہارا

اور اس کا معاملہ ہے۔ اس نے تم سے مشورہ ضروری نہیں سمجھا ہوگا یا اسے ڈر ہوگا کہ تم اسے جانے نہیں دو گے۔ بہر حال اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس نے خود کو جیش کیا اور اس کا نام قہر میں نکالا۔

رستم شینا کر رہ گیا۔ اس کے پاؤں میں جیڑی تھی ورنہ وہ ناصر کے پیچھے جانے کی کوشش کرتا۔ یہ بات درست تھی۔ ناصر کو بجا طور پر اندیشہ تھا کہ رستم اسے ہم جوئی سے روکنے کی کوشش کرے گا۔

کچھ ہی دیر بعد رستم اور اس نے ناصر کو تھیب میں برق جان کے گھر کے پہلو میں دیکھا۔ اس کے ارد گرد برق جان کے کئی ساتھی موجود تھے۔ ایک شخص لمبی چابی کے ذریعے ناصر کے پاؤں کی جیڑی کھولنے میں مصروف تھا۔ دوسرا اس کے سر پر وہ آگنی نوپ چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا جہاڑی لڑائی کے موقع پر استعمال کیا جاتا تھا۔ تین چار نوپ بدلنے کے بعد ایک ناصر کے سر پر پورا آگیا۔ دست بہ دست لڑائی میں یہ لوگ عام طور سے پائین بازو پر ہاتھ اور کھنٹی کے درمیان ایک آگنی خول بھی چڑھا جاتے تھے۔ یہ خول دھمال کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ ناصر کو بھی یہ خول لگا دیا گیا۔

رستم جب کہ برق جان کی طرف متوجہ ہوا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ "تم نے درجنوں کے حساب سے ڈنگرے پال رکھے ہیں۔ کیا اس مشکل وقت میں تمہیں میرے ساتھی کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا؟"

وہ اس نے رستم کے ان سخت الفاظ کو کافی حد تک نرم کر کے برق جان تک پہنچایا۔ برق جان نے جواب میں کہا۔ "وہ خود اصرار کر کے قہر انداز میں شامل ہوا تھا۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ کامیاب رہے گا۔"

"تمہارا دل اتنی ہی چچی جیش گونیاں کرتا ہے تو بہوار کی مستی میں تم ہستی کی حفاظت سے کیوں غافل ہو گئے؟"

وہ اس نے رستم کے اس سخت جملے کا ترجمہ کر کے برق جان تک نہیں پہنچایا۔ وہ رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسی لڑائیوں میں سب سے اہم چیز لانے والے کا اہتمام ہوتی ہے اور مجھے تمہارے ساتھی میں بے حد اہتمام نظر آیا ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ تم دیکھتے رہنا۔"

"دیکھنے کے سوا اب ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔"

وہوں طرف سفید جھنڈے اُبلے ہوئے گئے۔ مطلب یہ تھا کہ لڑائی فوری طور پر رکی ہوئی

ہے۔ سفید رقبے میدان میں لاشیں ابھی تک بکھری ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کو اٹھانے کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ ریچکے کے کھیل والے آہنی بجرے کے اندر ایک ریچکی مردہ ہڈی تھی۔ اس کے سینے پر رستم کی آنکھوں کے سامنے رائل کا پورا برست لگا تھا۔ اسی طرح دھول پینے والے دو دھوپ بھی اپنے دھولوں کے قریب مردہ پڑے تھے۔ رقبے کرنے والی دو خوش رنگ پاؤندہ لڑائیاں جھگڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے سر جڑ سے یوں برف پر لپٹی تھیں جیسے جڑائی کی کوئی رنگین سرگوشی کر رہی ہوں۔ لیکن اس جڑائی میں بھی نہ ہی سرگوشی تھی۔ سب کچھ اس کو خچن کا قبائلی لڑائی کی حیثیت چڑھ گیا تھا۔

"ناصر نے ایسا کیوں کیا؟" رستم نے بوڑھے والے انداز میں کہا۔

وہ اس نے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "اس نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہارا سچا دوست ہے۔ اب تک تم ہی ہر جگہ قربانی دیتے رہے ہو۔ اس نے ضرور یہ سمجھا ہوگا کہ کہیں وہ بھی اپنے آپ کو آزار بخش میں ڈالے۔"

"لیکن اسے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔"

"مشورہ کرتا تو تم اسے سمجھ نہ جاتے دیتے۔ اسے تو یہ ڈر تھا کہ تم مشورے کے بغیر بھی اسے جانے نہیں دو گے۔ اسی لئے وہ چپکے سے کمرے میں چلا گیا۔"

"یہ لڑائی کس قسم کی ہوگی؟ کیا ان میں سے ایک قتل ہو جائے گا؟"

وہ اس چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "عام طور پر ایسی لڑائیاں ایک شخص کے شدید ذہنی یا قتل ہونے کے بعد ہی ختم ہوتی ہیں۔ لڑائی کے اصول کے مطابق پار ماسنے والے کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارا ماننا کیسے نہیں کرتا۔"

فارنگ رک جانے کے بعد سلاخ دار کھڑکی کھول دی تھی۔ اس کھڑکی کی بلندی سے ارگرد کے مناظر ایک واضح نظر آتے تھے۔ دووں طرف کی مورچہ بندی کے درمیان ایک "نومین لینڈ" کے میدان پر کسی کا تسلط تھا۔ یہیں ہر دووں حربوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ ایک طرف سے ناصر برآمدہ اور دوسری طرف سے شوق خان۔ ان کے ساتھ تین تین افراد مزہ بھی تھے۔ میدان کے وسط میں ان تمام افراد کے درمیان چار پانچ منٹ تک کھسک پھسرتی رہی۔ پھر بیماری جرم شوق خان کھڑکی لہراتا اور بھناتا ہوا واپس چلا گیا۔ ناصر وہیں موقع پر موجود رہا۔

برق جان کا ایک ساتھی گھوڑا دوڑاتا ہوا برق جان تک پہنچا اور سلاخ دار کھڑکی کے نیچے سے نکلا کہ بولا۔ "ملک برق جان! شوق خان چپے دکھا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس

و اس کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں رستم کی طرف دیکھتا رہا۔ اُدھر میدان میں ڈنگے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقابلہ شروع ہو گیا۔ سینکڑوں لوگ بد بخود ہو کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ وہاں سے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ ناصر کا مقابلہ بہت گراؤ میں ہونے کے علاوہ از حد فضیلا بھی تھا۔ اس نے بڑے گھیر کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور دھوپ میں تانبے کی طرح دک رہا تھا۔ وہ اپنی کلبازی بار بار خود ہی اپنے سینے پر مارتا تھا اور غضب ناک انداز میں چنگھاڑنے لگتا تھا۔ اس کے سر پر بھی آگنی نوپ موجود تھا۔ کلبازی، کلبازی سے نکرانے لگی۔ مقابلے کے پہلے دو منٹ میں ہی ناصر کی کلبازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ مخالفین نے ٹھٹھک نعرے بلند کئے۔ اس کے بعد ناصر اپنے دو مقابل کے خونخاک لٹکاروں، چنگھاڑوں اور فضیلے نعروں کے سامنے بے دست و پا رہ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور صرف اپنی پھرتی اور اعتماد کے سہارے خود کو کھپانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ شروع میں رستم کا خیال تھا کہ شاید اس کا مقابلہ جرات کا ثبوت دے گا اور اسے وہ بارہ کلبازی اٹھانے کا موقع دے گا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ وہ کوئی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

کچھ بھی تھا، رستم ابھی تک پُر امید تھا۔ برق جان اور وہاں وغیرہ بھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ناصر صرف جلدی باز نہیں مانے گا مگر جب کافی کوشش کے باوجود ناصر دوبارہ اپنی کلبازی تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا اور دو مقابل کے حملوں میں مسلسل تیزی آتی گئی۔ تو ایک بار پھر نہ جانے کیوں برسوں رات کے مناظر آجوں آپ رستم کے پردہ تصور پر نمودار ہونے لگے۔ تاریک برآمدے میں بیچہ کر رستم نے ناصر کو گرائی زری کے پاس جانے پر آمادہ کیا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔ وہی زری جس کی طرف غلغلہ سے دیکھنا بھی مقامی عقیدے کے مطابق تباہ کن تھا۔ ناصر نے اس سے دسمانی تعلق قائم کیا تھا۔ کیا واقعی اس کا ردائی کی پاداش میں ناصر کے ساتھ کچھ ہونے والا تھا؟ کہتے ہیں کہ کچھ گرم ایسے برتے ہیں جن کا وبال ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسا گرم تھا جس کے ساتھ وہاں شلک تھا۔ ایک بار پھر رستم کا دل ٹھنی میں جکڑا جانے لگا۔

انگلی تین چار منٹ کی لڑائی میں ناصر نے دو مقابل کی ٹانگوں کے درمیان ایک زوردار ٹھوک لگائی جس کے سبب وہ جھجکی کی طرح ٹھٹھلا یا۔ دو مقابل کی طرف سے بھی ناصر کو تین چار شدید چوہیں لگیں۔ وہ چوہوں کو تو سرے آگنی نوپ نے جھجا۔ ایک چوٹ اس کی بائیں کونڈھی کر گئی اور ناصر کی آستین سرخ نظر آتی گئی۔ پھر اچانک لڑائی رک گئی۔ کئی افراد دونوں حریفوں کے درمیان آگئے۔

”یہ کیا ہوا؟“ رستم نے پوچھا۔

”لڑائی کا درمیانی وقفہ۔ تقریباً چھ منٹ بعد یہ وقفہ ہوتا ہے مگر عام طور پر کلبازی کی ایسی لڑائیاں ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں چلتیں۔ یعنی اس بارہ منٹ کے اندر اندر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس وقفے سے ناصر کو ایک خاص فائدہ بھی ہوا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ اپنی کمری ہوئی کلبازی پھر سے اٹھا سکتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ وقفے سے پہلے وہ ناصر پر کس طرح بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ وقفے سے پہلے مقابلہ ختم ہو جائے۔“

”یاد ہے تو ایک ابھی خبر ہے۔“

ناصر کے ساتھ مقابلے میں ناصر ٹپنے والے نہایت مشتعل پاؤں سے کانام فیروز تھا۔ وہ ”کچھ کھیل“ کھیلنے والے نام نہاد نکلتا تھا۔ ”مان“ کا قریبی دوست بتایا جاتا تھا۔ اس کے لئے برف پر سی ایک کالی چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ اس کے تین چار مسلح ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دوسری طرف ناصر کے لئے بھی ایک سیاہ چٹائی بچھا دی گئی۔ برق جان کے ساتھیوں نے بھی اس کے گرد کھیر ڈال لیا۔ اس کی کٹائی کے زخم پر پٹی باندھی جائے گی۔ اس کی گری ہوئی کلبازی برف سے اٹھا کر اسے واپس دے دی گئی تھی۔

برق جان کا چہرہ ہنسنار رہا تھا۔ وہ اب ایک بار پھر ناصر کی طرف سے پوری طرح پُر امید نظر آتا تھا۔ اس نے ایک فنس کو تیز تر لیچے میں کچھ دیا بات جاری کیں۔ ایک دوسرے فنس لئے دیا بات سننے والا۔ ”کوئی ناکہ ہوئی کوئی چیز دی۔ دیا بات سننے والا نیچے آکر کھڑو سے پر سوار ہوا اور ناصر کے پاس میدان کے وسط میں پہنچ گیا۔“

”یہ ناصر کو کیا سمجھا گیا ہے؟ کوئی مہم وغیرہ ہے؟“ رستم نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ آپ عجیب شے ہے۔ تمہیں سن کر حیرانی ہوگی۔ یہ کوئی مہم نہیں ہے۔ اس میں توڑ سامعیاں ملایا جاتا ہے۔ یہ کانوں میں فونسنے کے لئے ہے۔“

”کس کے کانوں میں؟“

”ناصر کے کانوں میں۔ جب یہاں کے لوگ شوز سے یا کسی خاص قسم کی آواز سے بچتا چاہتے ہیں تو ایسی طرح تیار، بجلی ٹی کانوں میں غولس لینے ہیں۔ بعد میں یہ آسانی سے نکل بھی آتی ہے۔ فیروز کی خونخاک چنگھاڑوں سے ناصر کو پچانے کے لئے یہ مٹی بھیجی گئی ہے۔“

”برق جان نے مزہ یہ کیا کہا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”ناصر کو حوصلہ دیا ہے۔۔۔ اور اسے فیروزا کے سب سے خطرناک واؤ سے آگاہ کیا ہے۔ یہ بدبخت دامن ہاتھ سے سر پر اٹھا اور کرتا ہے اور اکثر جب یہ مقابلہ پہنچنے کے لئے نیچے جھکتا ہے تو اس کی گردن اپنے بازو کے نیچے دو لپٹا ہے۔ اس کا یہ جھنجھ بڑا سخت ہے۔ کبھاری سے بھی مہلک۔ بغل کے نیچے وہی گردن ٹوٹ تو سکتی ہے، آڑوں میں ہو سکتی۔“

قریباً دس منٹ بعد مقابلہ دوبارہ شروع ہوا۔ دونوں حریف پھر سے تازہ دم نظر آتے تھے۔ کبھاری اب پھر سے ناصر کے ہاتھ میں تھی۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا اور فضا لغروں اور لٹکاردوں سے گونجنے لگی۔ فٹارے کی دھما دھما دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دی تھی۔ یہ کوئی عام مقابلہ نہیں تھا۔ اس میں زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ دونوں ٹرینوں میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہوگا۔ پھر اس مقابلے کے ساتھ ایک ہماری ہجرم شرط بھی تھی۔ قاتلانہیوں کا جوش و خروش دینے کی تھا۔ فیروزا کی وحشتناک ہتھیاراں سے گاہے بگاہے فضا گونج اٹھتی تھی۔ ناصر بڑی اشتیاق سے دفاع کر رہا تھا۔ کسی وقت موقع، کچھ کر جوالی اور بھی کر سکتا تھا۔ اب ناصر کی کامیابی اس صورت میں تھی کہ کبھاری دوبارہ اس کے ہاتھ سے نہ نکلے پائے۔ مگر اس مرتبہ چونکہ وہ واقعی غیر متوقع تھا۔ یہ مقابلہ کا ایک وارو کتے ہوئے ناصر کی کبھاری کا دست درمیان سے ٹوٹ گیا۔ باقی دست چھل سمیت اچھل کر دور جا کر۔ ٹوٹ خان کے سینکڑوں ساتھیوں نے زبردست شور مچایا اور لٹکیاں اور پٹا پٹا کر رہا۔ قاتلنگ کی۔

رستم کی پیشانی پر پھر بدبختی چھنے لگی۔ چونکہ بھی ہوا تھا بالکل غیر متوقع تھا۔ ناصر ایک بار پھر اپنے مشعل حریف کے سامنے ہتیارہو گیا تھا۔ کیا واقعی سب کچھ کی پیشگوئی کا نتیجہ تھا؟ اس کے ذہن میں ایک بار یہ وہم کی چند پھرنے لگی۔ اس دوران میں ناصر ڈٹ کر ہٹا ہٹا دفاع کرتا رہا۔ ناکام اس کا ایک راؤ چل گیا۔ فیروزا کی کبھاری والی کلائی ناصر کے دونوں ہاتھوں میں آگئی۔ اس نے کلاں پوزی قوت سے دبوچی اور اپنے کھٹنے کی طوفانی ضربیں کلائی پر لگا کر کبھاری فیروزا کے ہاتھ سے چھڑا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے جھینکا ہوا میدان کے آخری کنارے تک لے گیا۔ اس مرتبہ دوسری طرف کے قاتلانہیوں نے جوش میں چلا جا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

متبادل ایک بار پھر برابر نظر آئے لگا۔ لوگ گھروں کی چٹوں پر، چٹانوں پر اور براہِ چٹائی جگہ پر کھڑے تھے۔ جہاں تک لگاؤ تھا قاتلانہیوں کی ٹولیاں نظر آ رہی تھیں۔ برق جان اور اس کے ساتھیوں کے چہرے تھماتے لگے۔ وہ جہاں تھے وہیں پر سے نعرے بلند کر رہے

تھے۔ رستم کا دل پھر جانے لگا کہ وہ آڈر میدان کے وسط میں پہنچ جائے اور ناصر کی حوصلہ افزائی کرے۔ جب وہ افراد لڑتے ہیں تو ان میں کسی ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ اس لڑائی میں دونوں حریف بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے لیکن اچانک۔۔۔ اس لڑائی کی ”ہار“ ناصر کے حصے میں آگئی۔ وہ فیروزا سے ختم گھا تھا جب تک ایک برق جان اور اس کے ساتھیوں نے سر پیٹ لیا۔ واس کے۔۔۔ بے ساختہ ”اوہ“ کی طویل آواز نکلی مگر اور اس نے سخت مایوسی کے عالم میں میدان کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

پہلے تو رستم کی کھچ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اچانک اس پر حقیقت حال کا انکشاف ہوا اور اس کے جسم میں بھی سردی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑائی کے زور میں ناصر سے ایک کلیدی غلطی ہو گئی تھی۔ اس کی گردن فیروزا کے بازو کے کھٹنے میں چلی گئی تھی۔ اب ناصر گردن چھڑانے کی کوشش کے لئے جتنا زور لگا رہا تھا، اتنا ہی بس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی گردن کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی تھی۔ فیروزا کھٹنوں کے بل پیچھا گیا اور اس نے ناصر کا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ ناصر کا زفرہ توڑنے کی بھڑنچ میں آ گیا تھا۔ ناصر اپنا ہاتھ برف پر پڑی اس کبھاری تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے فیروزا کے ہاتھ سے ٹری گئی۔ کبھاری اور ناصر کے ہاتھ میں دو تین فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ مگر حقیقت میں یہ فاصلہ بہت۔ بہت۔ بہت طویل تھا۔ فیروزا اپنے ساتھیوں کی طرف سواہ نظر لوں سے دیکھ رہا تھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ گردن توڑ دوں یا یوں؟ کیا ناصر ہور ہے؟ رستم نے خود سے یہ پوچھا۔

اسی دوران میں برق جان نے گھر کی کڑی میں سے ایک مایوسی بھرا اشارہ کیا۔ بارش جان کے دو تین ساتھی دوڑتے ہوئے ناصر کو فیروزا کے پاس پہنچ گئے۔ دوسری طرف۔۔۔ یہ بھی کئی افراد بھاگتے ہوئے آ گئے۔ فیروزا اور ناصر ان لوگوں میں چھپ کر رو گئے۔ یہ رستم کے لئے بے حد صبر آواز اور آواز پر ناک کھات تھے۔ اتنی دوری۔۔۔ سے بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ ناصر زندہ ہے یا نہیں۔ برق جان اور واس وغیرہ بھی اتنی آواز نہ۔۔۔ سے لگا سکتے تھے۔

”کیا ہور ہے؟“ رستم نے لڑاں آواز میں واس سے پوچھا۔
”ملک برق جان نے ٹھٹکٹکٹ ماننے کو کہا ہے لیکن۔۔۔“
”ناصر کی جان بچی ہے یا نہیں؟“

”ابھی۔۔۔ اس بارے میں۔۔۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ واس نے آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میدان کے وسط میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ ناصر ابھی تک فیروزا کے جان لیوا کھٹنے میں تھا۔ اتنا ہی دوری سے واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم کو اپنے پاؤں کی

بڑی جتنی دوزی ان لمحوں میں محسوس ہوئی، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

آزادوںوں طرف کے مشتعل افراد ایک دو... سے پیچھے بنے۔ فیروز ابھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر مصر نہیں اٹھا۔ وہ انھیں نہیں سکتا تھا۔ وہ سفید برف پر بالکل بے حرکت پڑا تھا۔

”کیا ایک اور سچی چمنٹا گیا؟“

کیا سینے پر ایک اور نمبرنے والا گھماؤ لگ گیا؟

کیا بے جی اور چانچا ابراہیم کی نگاہیں ابھی اپنے بے کوند کیجی کس کی؟

کئی سوال رستم کے سینے میں آتی تھیں کی طرح گڑ گئے۔ وہ دھڑکتا پھر اڑا۔ پیغام رسائی کرنے والا گھڑا سوار گھڑا دوڑنا کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اس نے بلند آواز سے برقی جان کو طلب کر کے کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر اس نے ہولے سے رستم کا ہاتھ دیا۔ اور سرگوشی کی۔

”دو زندہ ہے۔۔۔۔۔ بس بے ہوشی کی حالت میں ہے۔“

رستم کا دل جیسے پھر سے دھڑکنے لگا۔ کچھ افراد ایک تختہ نما اسٹریچر پر ناصر زبیریدان سے باہر لے آئے۔ اس کے سر سے آہنی خود اتر دیا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں کھلاڑی اس کے پہلو میں رکھی تھیں۔ برقی جان اور اس کے سچی سر جھکاے ہوئے باہر نکل گئے۔

اگلے دن بارہ گھنٹوں میں اس کا پانچواں ہستی کے اندر کی تیز رفتار جدید تپا لیں آئیں۔ شرط بارنے کی وجہ سے برقی جان، ساسی خان اور ان کے ساتھیوں کو اپنی پوزیشنوں سے پیچھے ہٹنا پڑا۔۔۔۔۔ اور وہ ساری جگہ شتم اور اس کے حامیوں کو ہٹا دینا چاہتے تھے جو انہوں نے پچھلے معرکے میں حاصل کی تھی۔ یوں وہ ایک بار پھر جی ہوئی تھیں اور اس کے قریب کی آبادی میں آن موجو ہوئے۔ بہر حال پہلے معرکے میں ان کے ہاتھ سے نکل جانے والی سرنگ اور ارد گرد کا علاقہ اب بھی ان کی پہنچ سے باہر تھا۔

ان تہذیبوں کی وجہ سے شتم، ذہن کی گرتی ہوئی ساکھ کو ایک دم سہارا مل گیا۔ اس کے کئی ایک سرگروہ حامی جو اس کا ساتھ چھوڑنے کا سوچ رہے تھے پھر سے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ شتم خان کے اس دلیرانہ فیصلے کو سراہا جا رہا تھا کہ اس نے کھلے میدان میں خود کو دوہرا مقابلے کے لئے چیلنج کیا۔ اس چیلنج کے نتیجے میں ہی بعد ازاں فیروز اور ناصر کا مقابلہ ہوتا ہے پایا جس کا نتیجہ شتم کے لئے کامیابی کی صورت میں نکلا۔

دوسری طرف مایوسی کا دور دورہ تھا۔ ناصر کے دلیرانہ مقابلے اور اس کی مہارت کو تو بے شک سراہا جا رہا تھا مگر آخر میں بالکل اچانک ہارنا پائا گیا تھا۔ عام لوگ چونکہ تو ہم پرست

تھے، اس میں ایک اور طرح کا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ساری خواہش اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہے کہ تہوار کے دوسرے روز تین کے بجائے دو گارنڈوں کو جینٹ چڑھایا گیا اور تیسری گارنڈ کی حفاظت نہیں کی جا سکی۔

رستم اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ وہ اس آئے اور وہ اس سے باہر کے حالات معلوم کر سکے۔ رستم اور شریف ابھی تک اسی مکان میں تھے جس کی بلندی سے وہ کل جنگ کا نقشہ دیکھتے رہے تھے۔ ناصر کو طبی امداد کے لئے نہیں لایا گیا تھا۔ وہ ابھی تک ان کے پاس واپس نہیں آیا تھا۔ یعنی ایک ڈاکٹر خود بیمار تھا اور اس کا علاج ایسے لوگ کر رہے تھے جو اس سے کہیں کم بہتر مند تھے۔ کھل رات کی اطلاع کے مطابق ناصر کی حالت اطمینان بخش تھی۔ درحقیقت اس کی گردن کئی منٹ تک فیروزا کے شکمے میں رہی جس کی وجہ سے اس کا دم گھٹا اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی گردن ورم زدہ تھی اور وہ شدید پھیپھڑی محسوس کر رہا تھا۔ لڑائی کر کے کے بعد ڈیڑھ سا خیال اور برقی جان وغیرہ اپنی اصل رہائش گاہ میں واپس جا چکے تھے۔

شام سے ذرا پہلے اس کو رستم نے اس سے ناصر کا احوال پوچھا۔ ”واں بولا۔“ وہ بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل تک یہاں واپس آ جائے۔“

”وہ زیادہ افسردہ تو نہیں؟“

”افسردہ ہونے والی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ بڑی دلیری اور ہمت سے لڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ لڑائی میں کسی ایک کی تو ہار ہوتی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ ہستی کے عام لوگ بہت مایوس ہیں۔ وہ برقی جان کو الزام دے رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ گارنڈ کی زہری کی حفاظت کیوں نہ کی جا سکی۔ ان کا خیال ہے کہ ایک گارنڈ کی جینٹ نہ چڑھائے جانے کی وجہ سے ہی یہ مصیبت آئی ہے۔ ورنہ شتم خان تو گرتی ہوئی دبوچا جیسا ہوا تھا تھا۔“

”برقی جان نے لوگوں کو زہری کے بارے میں کسنا تھا ہے؟“

”جی نہیں کہ اس کے ساتھ کسی نامعلوم شخص نے ریادی کی ہے۔ وہ ہمارا نام لے دے تو لوگ تہوار سے چھوڑے آؤ کر رکھیں۔ اور وہ فی الحال جہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔“

”مگر تین نامعلوم اور بڑی بیماری کو سب کچھ معلوم ہے۔“

”ملک برقی جان نے انہیں کھل زبان بندی کا حکم دیا ہے۔“

”کیا بڑی بیماری بھی کھل زبان بندی پر عمل کر سکے گی؟“ رستم نے پوچھا۔

”تہوار یہ سوال اہم ہے۔“ اس کا لہجہ شکر تھا۔

رستم نے اپنے کندھے سے ڈھم کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ذری اب کہاں ہے؟“
 ”اس کا سرموٹ دیا گیا ہے۔ چھوٹے بھی موٹے دی گئی ہیں۔ اس کے گلے میں لوہے کا
 منخوس کڑاؤں دیا گیا ہے۔ وہ برقی جان کی سخت تحویل میں ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے، زندہ وہ
 ہے۔“

”کیسے راز کو راز رکھنے کے لئے اس کو مار تو نہیں ڈالا جائے گا؟“
 ”ڈرتو مجھے بھی ہے۔“ واس نے کہا۔ ”لیکن امید نہیں کہ برقی جان اتنی جلدی کوئی ایسا
 قدم اٹھا سکتا ہے۔“

واس نے چند لمحوں کو وقفہ کیا پھر رستم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا
 ہوں تم صورت پرست نہیں ہو۔ مگر یہ بھی تمہارے کردار میں کوئی دلیل نظر آتی ہے۔ اس کے
 باوجود تم ذری کے قریب گئے۔ اکتا بڑا خطرہ مول لیا۔ کیوں؟ کیوں کیا ایسا؟“
 ”تمہارے خیال میں کیوں کیا؟“

واس نے گڑبڑی سے چھوٹے چھوٹے دو تین شعلے لئے اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں رستم!
 تم کسی بھی طرح ذری کو پہچاننا چاہتے تھے۔ ایک اتفاق کے تحت وہ تمہارے پاس چلی آئی اور تم
 نے یہ موقع ضائع نہیں کیا۔ وقتی طور پر تم اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ ذری موت کے
 پشگل میں جاے سے بچا گئی۔ اللہ کرے وہ بچی رہے۔“ واس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی
 نمی چمک گئی۔ اس نے رستم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”میں نے جو کچھ کیا اس کے لئے تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟“ رستم نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تمہاری نیت کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم
 نے ایک بڑا خطرہ مول لیا۔ بے غزنی برداشت کی۔ برقی جان اور محافظوں نے اس رات تم
 سے جو بار پیسہ اس کے لئے مجھے بڑا افسوس ہے۔“

رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”لوگ اب کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”لوگ بہت بدلتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے گیارے میں خصوصی عبادت ہو رہی تھی
 اور گناہوں کی معافی مانگی جا رہی تھی۔ لوگ برقی جان اور بڑی بیماری سے تفصیل جانتا چاہتے
 ہیں کہ تیسری گارنی کے ساتھ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ وہ مجرم کی نشان دہی چاہتے ہیں اور اسے
 عبرت ناک سزا دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سکی سرکردہ افراد نے دھمکی دی ہے کہ اگر گارنی کو
 خراب کرنے والا دہندہ گرفتار نہ ہوا تو وہ برقی جان کو چھوڑ دیں گے۔“
 ”کسی پر شک بھی کیا جا رہا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

واس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ وہ چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد بولا۔ ”ابھی تک تو
 نہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کچھ لوگوں کا دھیان تمہاری اور نامرکی طرف بھی جائے گا۔ ذری
 اکثر میرے گھر میں آتی رہتی تھی۔ پھر جب تم فرار ہوئے، بوسے پکڑتے گئے، جب بھی وہ تم
 لوگوں کے ساتھ تھی۔ خاص طور سے وہ تمہارے ارد گرد رہتی تھی۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ رستم نے تائید کی۔

”بہر حال۔ یہاں برقی جان نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ اس نے کسی کو ہوا تک
 نہیں گئے دی کہ ذری اس رات کہاں پائی گئی تھی۔ عام لوگوں کو یہی بتایا گیا ہے کہ وہ جو کوئی
 بھی تھا، ہمارے خانے کے اندر گھسنا۔ اس نے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر سادہ لوح لڑکی کو بے بس کیا
 اور بے آبرو کر دیا۔ امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ شاید وہ لدائی پہرے داروں میں سے کوئی تھا۔
 مشروب کے نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور وہ گزر دھڑکے کے بارے
 میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔“

”کوئی پکڑ دھکڑ بھی ہوئی ہے؟“ رستم نے دریافت کیا۔

”ہاں۔ تین چار افراد کو پوچھ مجھ کے لئے پکڑا تو گیا ہے مگر عام لوگ اس کا روانی کو
 بالکل ناکافی سمجھ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ برقی جان کو اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔“

بات کرتے کرتے اچانک واس چمک گیا۔ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی تھی۔ رستم
 نے بھی اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور چونکا۔ یہ بڑی عجیبی تھی۔ وہ اپنی موٹی اونٹنی میں لپٹی
 پلٹائی کسی تندہ کو لے کر طرح برقی جان کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے عقب میں دو
 محافظ بھی تھے۔ بڑی بیماری کے قدموں میں ایک طرح کی منتقل تیزی تھی جو صاف طور پر
 محسوس ہوتی تھی۔

”یہ کہاں جا رہی ہے؟“

”میں دیکھتا ہوں۔“ واس نے کہا اور اٹھ کر خود بھی برقی جان کے گھر کی طرف روانہ

ہو گیا۔

رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ حالات ایک خاص رخ اختیار کرتے جا رہے
 تھے۔ خاص طور سے وہ دو مقابلے میں شوق خان کے بندے کی جیت کے بعد عام لوگ
 برقی جان سے غٹھا غٹھا نظر آتے گئے تھے اور اس کی بڑی وجہ ذری والا معاملہ ہی تھا۔ اپنے
 عقیدے کے مطابق وہ اسے بہت برا ٹھکانا قرار دے رہے تھے۔

نیاز شریف دنیا دہانیا سے بے خبر سوچا پڑا تھا۔ رستم کمرے میں بیٹھنے لگا اور اس کی

اور میرا دل چاہتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ حالات میں کوئی ایسی تبدیلی آئے کہ ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں۔ ویسے بھی اب ہم برق جان گروپ کے ساتھ اٹھ چکے ہیں۔ اب اس گروپ کا جیتنا ہمارے لئے فائدہ مند ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔

اب ناصری آنکھوں میں بھی سوچ کی گہری پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ رستم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تو اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح شوقم خان کو مار پڑے اور وہ اس لڑائی میں ہار مان لے۔"

"خیال تو آپ کا ٹیک ہے لیکن اس حوالے سے آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ بھی ہے؟"

"منصوبے کا کیا ہے، وہ بھی بن جائے گا۔ اصل چیز تو ارادہ ہوتی ہے۔"

"اگر آپ نے ارادہ کر لیا ہے تو پھر میں آپ کے ارادے کے ساتھ ہوں۔" ناصری نے پورے غم سے کہا۔

رستم کچھ دیر تک گہری سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ "میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ لڑائی میں اپنے ملک یعنی سرحداری کی جان کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ لڑائی میں برق جان کو پیچھے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح شوقم خان بھی اپنے خاص محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔ میں نے کہیں ساتھ کاروباری قبائلی لڑائیوں میں اگر سردار مار جائے تو اس کو بدتر کین گشت سمجھا جاتا ہے اور لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ براہ راست شوقم خان کو نشانہ بنایا جائے؟"

"شوقم خان اور ارقا خان دونوں کو ممکن ہے کہ شوقم کے سرنے کی صورت میں اس کے بیٹے کو فورا سرحداری کا زور چل جائے۔ اگر یہ دونوں ختم ہو جائیں تو یہ گروہ کچھ عرصے کے لئے اپنے سردار سے محروم ہو جائے گا۔"

"ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑائی کے دوران میں ان دونوں کو خاص طور سے چارگت بنایا جائے۔" ناصری نے کہا۔

"مجھے تو یہ کام مشکل لگتا ہے۔ لڑائی سے پہلے ہی کوئی کارروائی ہو سکے تو زیادہ بہتر ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے رگنا وا نیمیشن جیسی کوئی کارروائی؟"

"بالکل۔ ایسا ہو سکتا ہے مگر اس سلسلے میں پہلے برق جان سے تفصیلی بات کرنی ہوگی۔" دونوں اپنی اپنی سوچ میں غم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ناصری نے ایک طویل سانس لیٹے

ہوئے کہا۔ "رستم بھائی اذری کا کچھ پتہ چلا؟"

"بہت پریشانی ہو رہی ہے اس کے بارے میں؟" رستم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ میں سخت الجھن میں ہوں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ جو کیا، ٹھیک کیا۔ کسی وقت لگتا ہے کہ غلط کیا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس کے جسم کے ساتھ دھوکا کیا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں اسے میرے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں۔ وہ تو بس آپ کو جانتی ہے۔"

"میں نے پرسوں اس سے پوچھا تھا۔ ذری خبریت سے ہے۔" رستم نے کہا۔ "برق جان نے ابھی اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔"

"کیا ہم کسی طرح اس سے مل سکتے ہیں؟" ناصری کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ابھی تو یہ بہت مشکل ہے اور ہمیں اس طرح کا کوئی خطرہ مول بھی نہیں لینا چاہیے۔"

کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ہم مشکوک ہیں۔

برق جان سے رستم کی ملاقات اگلی روز صبح سویرے ہو سکی۔ رستم نے اس سے اصرار کر کے برق جان کو تھوڑی دیر کے لئے یہاں بلایا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ تھا۔

برق جان نے اس کے ذریعے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جو بھی کہنا ہے، جلدی کہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ لڑائی کسی بھی وقت پھر شروع ہو سکتی ہے۔ مجھے بہت سے انتظام کرنے ہیں۔"

رستم نے کہا۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے برق جان کہ تم پچھلے واقعے کو بھول کر ایک بار پھر ہماری جیڑاں کھلو اور دوبارہ ہمیں اس لڑائی میں حصہ لینے کا موقع دو؟ تم سے وعدہ کرتا ہوں اس حربہ ہم دونوں واقعی تمہارے شانہ بشانہ شوقم خان کے ساتھ لڑیں گے۔"

"میرے لئے اب یہ بہت مشکل ہے۔ میں تو شاید ابھی جانوں لیکن میرے ساتھی کسی بھی صورت دوسری حربہ دھوکا کھانا نہیں چاہیں گے اور جی بات یہ ہے رستم کہ تم نے خود کو قابل اعتماد ثابت نہیں کیا۔ اور ایسا ایک بار نہیں زیادہ ہوا ہے۔"

"تم میرے بار بار فرار ہونے کی بات کر رہے ہو۔ یہ دھوکا نہیں تھا۔ یہ میرا حق تھا اور اب بھی ہے لیکن جنہیں یاد ہوگا، میں نے آج تک تم سے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا جواب کر رہا ہوں۔"

"کیا وعدہ؟"

”کیا کہ اس بار کوئی چال نہیں ہے۔ ہم تمہارے شانہ بشاند لڑیں گے۔ نہ صرف لڑیں گے بلکہ تمہاری جیت میں پورا کردار ادا کریں گے۔“

برقی جان چونکہ کرستم کی طرف دیکھنے لگا۔ برقی جان جانتا تھا کہ وہ عام لوگ نہیں ہیں۔ اس کی مردم شناس نگاہ کرستم اور ناصر کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتی تھی۔

کرستم کے لب و لہجے کو محسوس کرنے کے بعد برقی جان گہری سوچ میں غفلت آنے لگا۔ وہ قدورے اطمینان سے بیٹھ گیا اور اس بارے میں کرستم اور ناصر سے بات کرنے لگا۔

کرستم نے برقی جان سے بھی وہی بات کہی جو اس نے کل ناصر سے کہی تھی۔ اس نے اس کے ذریعے برقی جان کو اپنی رائے پیش کی اور کہا کہ اگر شوقم خان اور دارخان کو یکم از کم شوقم خان کو بھی قسم کیا جائے تو لڑائی کا پانسلاپ سکتا ہے۔

برقی جان نے کرستم کی بات کو ذرا نہیں کیا اور کہا۔ ”تمہاری بات میں وزن ہے۔ مگر شوقم تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھی بے حد چوکس ہیں۔“

”لیکن کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“ برقی جان نے پوچھا۔

کرستم نے اثبات میں سر ہلایا اور فرض پر کوئٹے سے لکیر کھینچنے ہوئے کہا۔ ”یہاں تک ہمارا قبضہ ہے۔ اس سے آگے شوقم خان کے لوگ ہیں۔ انکار کے کی فطرت اس حصے میں ہے جو ہمارے پاس ہے لیکن اس میں سے جو زمین دو درازا سے لکھا ہے وہ اس علاقے میں لکھا ہے جو اب شوقم کے پاس ہے۔ شوقم کا لکھنا وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مشکل سے چالیس پچاس قدم کا فاصلہ ہوگا۔“

برقی جان کے چہرے پر ہلکا سا ہوش غفلت آیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ کچھ لوگ وہ راستہ استعمال کر کے شوقم خان کے قریب پہنچ جائیں؟“

”کچھ لوگ نہیں۔۔۔ صرف دو یا تین بندے۔ مجھے یقین ہے کہ اس افراطی میں وہ راستہ جس طرح ہمیں بھولا ہوا ہے، اسی طرح شوقم کے لوگوں کو بھی بھولا ہوا ہوگا۔ فرض محال اگر انہیں بھی بھولا تو وہاں دو تین محافظوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ انہیں شوقم کے شوقم کے لکھانے کی طرف جانا اور اندر گھسنے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“

”یہ کام کہنے اور سننے میں جتنا آسان نظر آرہا ہے، اتنا ہوگا نہیں۔“

”میں جانتا ہوں یہ مشکل ہوگی لیکن اس کے بعد لڑائی جیتنا زیادہ مشکل نہیں رہ جائے گی۔ جب یہ لوگ شوقم کے صدمے سے دو چار ہو گئے، ہم بھر پور حملہ کر کے انہیں بھیڑ

کھریوں کی طرح گھیر لیں گے۔“ کرستم کے لہجے میں آگ تھی اور وہیں ڈوبی ہوئی بھید کی تھی۔ وہی کیفیت جو برسمے لڑنے کے لئے تیار رہنے والوں کی فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔

برقی جان کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

کرستم نے غمخیزی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سب سے پہلے میں اس کام کے لئے خود کو پیش کرتا ہوں۔ اپنے پورے ہوش و حواس اور رضامندی کے ساتھ میں یہ کام اپنے ذمے لینا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اپنے ایک ساتھی کو بھی میں نے جن لیا ہے۔ بس مجھے ایک اور بندے کی ضرورت ہے۔“

”کس ساتھی کو چاہتا ہے؟“ برقی جان نے پوچھا۔ ”اگر تمہاری مراد ناصر سے ہے تو وہ ابھی فیک سے گردن بھی کھٹا نہیں سکتا۔ اس کا بازو بھی ڈھکی ڈھکی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ ناصر میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں کسی اور کی بات کر رہا ہوں۔“

”کس کی؟“

”نہ ان۔“ کی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا چاہتا ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس قسم کے ہوشیار ترین لڑاکوں میں سے ہے۔ اس موقع پر ہمیں اپنے اندر کے معاملوں کو بھول کر باہری فکری کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوقم پر شب خون مارنے کے لئے ”نہ ان“ بہت کارآمد ثابت ہوگا۔“

”لیکن وہ تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ تم اچھی طرح جاننے ہو۔ تمہاری قسمت ابھی تھی کہ تم کو رام میں ریجنوں کے ہاتھوں نکلے ہوئے سے بچ گئے ورنہ ”نہ ان“ نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور اس سے پہلے بھی۔“

”میں سب جانتا ہوں ملک برقی جان۔ اس کے باوجود میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ میں ”نہ ان“ سے خود بات کروں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔“

”اور تیرا غمخس؟“

”تیرا غمخس تم چند۔ لیکن وہ اچھا نہانے باز ہو اور تھوڑا سا نیکیل بھی۔“

اس معاملے پر برقی جان اور کرستم کے درمیان قریباً آدھ گھنٹہ بات ہوئی۔ ہر پہلو کو تفصیل سے دیکھا گیا اور مشورہ کیا گیا۔ اس گفتگو کے اختتام تک صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ برقی جان جو کچھ پہلے بیڑی بیڑی کے ساتھ یہاں وارد ہوا تھا، اب ایک دم پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور کرستم کے لیے ستائش بھی۔ تاہم ابھی تک اس کی آنکھوں سے شک کی دھندلاہٹ پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔

رستم نے اس کے شک کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”برق جان! اب تمہیں کیا پریشانی رہ گئی ہے۔ شریف کے ساتھ اب ہم صبحی تمہارے پاس ہی رہے گا۔ فی الحال تمہیں صرف میری بیڑی کھولنا ہوگی۔ جب تمہیں شتم کی موت کا پتا چل جائے اور عام لڑائی شروع ہو جائے تو ہم صبحی بیڑی کھلوا دیں گے۔ شریف پھر بھی تمہارے پاس ہی رہے گا۔“

برق جان تھوڑا سا سائل نظر آیا۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مان“ سے کہاں بات کرنا چاہو گے؟“

”اگر وہ یہاں آجائے تو بہتر ہے۔ نہیں تو میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔“

کچھ دیر بعد برق جان اپنے ساتھیوں سمیت تیز قدموں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ رستم، ناصر اور شریف کمرے میں رہ گئے۔

ناصر نے کہا۔ ”آپ نے اچھا بدل لیا ہے۔ میں آپ کو یہاں بند کر کے فیروزا سے دودھ ہاتھ کرنے چلا گیا تھا۔ اب آپ مجھے یہاں بند کر کے شتم سے لڑنے جائیں گے۔“

”بدل تو جب ہوتا جب تم اچھے بھلے ہو تے اور میں تمہیں یہاں بند کر کے چلا جاتا۔ اب تو تم اپنی حالت خود ہی دیکھ رہے ہو۔ یہ بیجوری ہے۔ وہی بدلے والی بات تو وہ میں نے ابھی لیتا ہے۔“ رستم زہر لب مسکرایا۔

شریف نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میری جگہ میں یہ کچل نہیں آئی رستم بھائی کہ تم ایسے بندے کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو جو اندر سے کھوتا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور سے رستم بھائی تمہارے بارے میں تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔“

”پر جو کام ہم کرنے جارہے ہیں اس میں وہ بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ مجھے پکا یقین ہے۔ یہ رانی نیت کی بات..... تو ہماری نیت ٹھیک ہے، اللہ کرے اس کی بھی ہو جائے۔“

ناصر نے کہا۔ ”اکیارے کے اندر گراؤ ڈراستے کے ذریعے شتم تک پہنچنے کی تجویز مجھے بھی پہنچ آئی ہے لیکن اس پر جتنی جلدی عمل ہوا اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ تو ہو کر اس سے پہلے ہی شتم بدلہ بول دے۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ مگر دن کی روشنی میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ کم از کم آج رات تک تو انتظار کرنا پڑے گا۔“

وہ تینوں ”نے مان“ کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ معاف کرنے کا ہنر رستم نے بی بی سے سیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی اس معاملے میں بہت آگے ہے۔ وہ معاف کرنے اور اپنا ناسے کی حیثیت انگیز صلاہت رکھتی تھی۔ رستم اس کی اس خوبی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ یوں

لگتا تھا کہ دنیا کے ہر سے ہر شخص کے لئے بھی بی بی کے دل میں مغرت اور غصہ نہیں ہے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ برائی سے نفرت کرنی چاہیے، مرنے سے نہیں۔ رستم کی فطرت بالکل مختلف تھی۔ وہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آتش فشاں بن جاتا تھا۔ لاوے کی طرح برسنے کو بہالے جانے کی خوشی اس کے اندر..... اس کی فطرت بی بی کی فطرت کا عکس نہ تھی۔ اس کے باوجود بی بی کی ذات سے چھوٹنے والی نہایت طاقت ور شعاعوں کی کچھ روشنی غیر محسوس طور پر رستم کی ذات میں بھی منتقل ہوئی تھی۔

اس برف زار کے اس پتھر پلے گھر میں اپنے رقیب ”نے مان“ کا انتظار کرتے کرتے اس کی سوچوں کے سارے دھارے بی بی کی طرف مڑ گئے۔ اس کے کانوں میں کچھ بول گونجنے لگے۔ یہ بول اس نے کہاں سے تھے؟ یہ کئی کئی گھنٹے والے اور ”اک تارا“ بجانے والے کسی فقیر کی آواز تھی۔ وہ کہاں گارہا تھا..... شاید کسی کنوئیں کی منڈیر پر..... شاید سروس کے کسی خوش رنگ کیمت میں..... شاید کسی رنگ رنگیلے پیٹے میں..... یا شاید وہ رنگ والی گاؤں کی کسی حویلی میں ہی اپنے نر تکبیر رہا تھا۔ چہرہ بھول گیا تھا، جگہ بھول گئی تھی مگر آواز ہنوز رستم کے حافضہ میں نقش تھی.....

شیراز عشق بھاری دی ڈھا کے چڑھا، ہمیت عشق حقیقی دا پسیندا
چترنگہ جس موم کر سکدا اے، کپے کچا دا راصل بنا لیندا
جھوٹے لیندا اے لھدی دا رارے ماس اپنا بھن کے کھالیندا
سینے کئی پہاڑوں دے چیر سکدا، پم جنگلاں وج سکالیندا

کسی دم جنہیں کے ہے عشق میں گرفتار ہوئے والا خدا کی محبت کا راز بھی پلٹتا ہے۔ عشق کی طاقت ہے پناہ ہوتی ہے، یہ اپنی نگاہ سے پتھر کو موم کر سکتی ہے اور شمشے کے بے کار بکڑے کو ہیرا بنا سکتی ہے۔ عاشق کے لئے پھانسی کا راسا جھولے کے رے کی طرح دل آویز ہوتا ہے، عاشق بڑی خوشی سے اپنے ہی جسم کا گوشت کاٹ کر بھون سکتا ہے۔ وہ اپنے جذبے کی طاقت سے شکارِ پہاڑوں کے سینے چیرتا ہے۔ عاشق کے لیے یہ چنداں مشکل نہیں کہ وہ دنیاوی آسائشوں کو چھوڑ کر سالہا سال جنگلوں میں گھومتا رہے اور سوکھا کرنا ہو جائے۔

”نے مان“ کی آمد قربان ہو گئے بعد ہوئی۔ مترجم کے طور پر وہ اس بھی اس کے ساتھ تھا۔ ”نے مان“ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غصے اور دروہیت کے آچار تھے۔ برق جان نے گودام والے دانے کے بعد ناراض ہو کر ”نے مان“ کو گھر میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اس کے لئے کوئی مناسب سزا جو بی بی جاری تھی مگر آج رستم نے اسے خصوصاً ہمیت دے کر اپنے

پاس بلا لیا تھا۔

ہامر کی آنکھوں میں بھی "نہ نان" کے لئے کدورت کی جھلک تھی۔ چند دن پہلے ہامر نے برلا ہما تھا کہ اگر اسے موقع ملے تو وہ اس بدست شخص کی جان لے لے گا۔ مگر آج ہامر کی خاطر اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ رستم پہلے "نہ نان" سے خود بچنے کا پلہا ہے ہامر کے لئے لکھا گیا۔ "نہ نان" جیوہر ان بھی نظر آ رہا تھا۔ عائشہ اسے ڈر بھی تھا کہ کیسے کوئی چال نہ ہو۔ اس کے اعصاب تپتے ہوئے تھے۔ رستم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اس کے ذریعے ان میں گفتگو شروع ہوئی۔

☆=====☆=====☆

رات تاریک اور سوختی۔ درسم اور ”نے مان“ اکیارے کے اندر کھڑے تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی ایک مقامی شخص لال خان تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر تھی۔ یہ یہاں اسطرح وغیرہ مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دلیری کی چمک تھی۔ وہ تینوں آفتیش اسٹے سے مسلح تھے۔ ”نے مان“ اور لال خان کے پاس بطل تھے۔ درسم کے پاس چھوٹی نال کی روٹی داخل تھی۔ یہ داخل اس کی بھاری بھر کم جیکٹ کے اندر چھپ کر روٹی تھی۔ صرف اس کی نال کا اٹکا حصہ درسم کی گردن کے پاس، گردن سے جھانک رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان تینوں کے پاس ایک اونٹنی شے بھی تھی۔ یہ سونے کیسوں کا بنا ہوا ایک تھیلا تھا۔ یہ تھیلا ”نے مان“ نے اپنی بٹل میں دب کر رکھا تھا۔ اس تھیلے کے اندر کوئی زندہ شے موجود تھی۔ اس شے کا سائز ایک بڑی بی بی پاموٹے جیسے کے برابر تھا۔

وہ قیول اگیارے کے بڑے کمرے میں موجود تھے۔ تین چار جگہ بھی ان کے ساتھ تھے، تاہم ان جانفکوں کو یہیں پر رہ جانا تھا۔ اس سے آگے صرف رستم، ”نئے مان“ اور لال خان کو جانا تھا۔ اگیارے کے اس کمرے میں پہنچ کر رستم کو سفید قلم ڈاکٹر لالہ کی یاد آگئی۔ لالہ کا شہتم خان سے جکر اسی کمرے میں ہوا تھا۔ لالہ کو اس کمرے سے نکلنے والے چور راستے کا بے جا پل گیا تھا اور شہتم کی جان کے دورے ہو گیا تھا۔

اس کمرے میں غائب ہو گئے تھے۔ آپوک کے درخت کی ہیمپڈ تھی اور چوڑی کھڑکی کے لوازمات نظر آرہے تھے۔ ایک محافظ نے کمرے کے وسط میں پڑا ہوا عالجی اٹھایا۔ نیچے کھڑکی کا چوکھڑا موجود تھا۔ اس مضبوط تختے کو ایک بار قفل لگایا گیا تھا۔ محافظ اس تختے سے کان لگا کر یکے بعد دیگرے گمنام سن لینے کی کوشش کرتے رہے۔ رستم نے بھی تختے سے کان لگایا..... جس طرف وہ لوگ اس راستے کو استعمال کر رہے تھے، خطہ بھی موجود تھا کہ شوق کے ساتھیوں نے بھی

اس راستے کو استعمال کرنے کا سوچا ہو۔ جب کسی طرح کی کوئی آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو رستم نے نقل کھولنے کی ہدایت کی۔

فکل کھول کر تھوڑا اوپر اٹھایا گیا۔ نیچے بھڑکی گھسی ہوئی لٹام بیڑھیاں موجود تھیں۔ یہ بیٹک سارا دستہ دور تک تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ بندر رہنے والی جگہوں پر جو پاؤں ہوتی ہے، وہ یہاں بھی تھی۔ رستم نے جینٹ میں سے چارج نکال کر روشنی کی اور بیڑھوں پر قدم رکھ دیا۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں سے گزر کر وہ دونوں عورتیں شوق میں پہنچتی تھیں اور نہایت راز داری سے اس کی تنہائی کو گرماتی تھیں۔ یہ خاصا طویل راستہ تھا۔ بالآخر وہ دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ انہیں ایک باہر پھر بھڑکی آٹھ دس لٹام بیڑھیاں نظر آئیں۔ بیڑھوں کے بالائی سرے پر بکڑی کا موٹا تھنہ موجود تھا جسے دھکنے کی طرح اوپر اٹھایا جاسکتا تھا۔ جب وہ اس تھنے کے قریب پہنچے، انہیں کچھ فاصلے سے ہمم آواز میں سنائی دینے لگیں۔ یہ شوق خاں کے ساتھیوں کی آوازیں تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایڈ کے گرد بیٹھے ہیں۔ وہ بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کچھ کہانی رہے تھے۔

اب یہاں سے رستم کے تیسرے ساتھی لال خان کا کام شروع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب بڑا جان نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یہ شخص اسلحہ شناس اور جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیکنیکل ذہن بھی رکھتا تھا۔ اس کے پاس چند اوزار تھے جو اس نے جیکٹ کے بیجوں میں ڈال رکھے تھے۔ لال خان نے اس پورے راستے کے دونوں دروازے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے۔ اسے معلوم کروہنٹ دریا فتح کر لئے جنہوں نے فتح کی بیرونی کڑی کو فتح سے جوڑ رکھا تھا۔ اگر وہ نیٹ کھولے گا کامیاب ہو جاتا تو پھر باہر گئے ہوئے وزنی قفل کے باوجود تختہ اوپر اٹھ سکتا تھا۔

ہوئے سازگی چاہی اور اسکو بھیج کے ذریعہ لال خان نے کوشش شروع کی۔ زیادہ
آواز پیدا کئے بغیر وہ بڑے ایشیاہک سے آدھ گھنٹے تک لگا رہا اور آخر کار تمام علیحدہ کرنے
میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ دونوں باتیں مل کر تھکے ہوئے کھینچے کے اوپر اٹھاتے تو وہ اٹھ جاتا۔
خطرناک مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ وہ باہر سے ابھرنے والی آوازوں کے دھم ہونے کا انتظار
کرتے رہے۔ الاؤ ڈیوڈ بھیج گیا تھا۔ آواز میں دھم ہوئیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ انہوں نے
پتے پتھریا تیار کئے اور تھکے کو اوپر اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئے..... دھم سب سے آگے تھا۔
سے خود کو ایک گھر کے مستطیل کمرے میں پایا۔ سامنے محن نظر آ رہا تھا۔ وہاں ادھ بجے

انگروں کی روشنی اور پسے ہوئے گوشت کی خوشبو تھی لیکن الاؤ کے گرد کوئی موجود نہیں تھا۔ رستم باہر نکلتے ہی ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ کھینکے آواز سن کر ایک مسخ فحش تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لائین تھی۔ رستم نے لپک کر اس کی گردن دبوچی۔ دوسرے ہاتھ سے اس کی لائین سنہلی اور اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا۔ گردن پر گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکا۔ دوسری بار دیوار سے سر ٹکراتے ہی دوسرے پچھلی کی طرح رستم کے بازو میں جھول گیا۔ رستم نے اسے ایک تاریک گوشے میں پہنچا دیا۔

یہاں عالمانہ یا ایسا ہی فرد تھا۔ کچھ ریسرچ کن لینے کے بعد رستم نے تختہ اوپر اٹھایا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی باہر نکال لیا۔ صحن کی دوسری طرف تھوڑے فاصلے پر ٹکڑی اور پتھر کا بنا ہوا وہ منزل گھر نظر آ رہا تھا جو یہاں شتم کی عارضی قیام گاہ تھا۔ وہاں ایک بڑا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ ”نے مان“ نے قہقہے میں موجود زندہ ہٹے کو تھپتھپایا اور معنی خیز نظروں سے رستم کی طرف دیکھنے لگا۔ ”نے مان“ بے حد خف جان تھا۔ صرف تین ساڑھے تین مہینے پہلے رستم کی اس سے زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں نہ صرف ”نے مان“ کا جیڑا اٹھنا تھا بلکہ اس کی کلائی کی چھوٹی ہڈی بھی چٹخ چکی تھی مگر بہت تھوڑے عرصے میں وہ پھر سے پوری طرح چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ ”نے مان“ نے جو تھپا پکڑ رکھا تھا اس میں گوہ کی سیاسی مائل نسل کا ایک مضبوط جانور تھا۔ رستم نے کئی بار اس تھا کر پرانے فٹب ڈن اور ڈیکٹ وغیرہ گھروں کی اونچی دیوار پر چھانڈنے یا چھوٹوں پر چڑھنے کے لئے سجدے سجدے ہوئے گوہ استعمال کرتے تھے۔ یہ جانور کسی بھی جگہ پر مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے اور وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی کمر سے رسا باندھ کر کندہ بنائی جاتی تھی اور اوپر چڑھا جاتا تھا۔ رستم کے لئے یہ بات سنی سنائی تھی۔ اس نے بھی سوچا یہی نہ تھا کہ اس پر فیلے ٹاپو پر سو جو دایک پاؤندہ اس نے نا عملی مظاہرہ کر کے گاؤں سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

”نے مان“ اس جانور کے حوالے سے بڑا پائیدار تھا۔ وہ اس کی کمر سے باندھ کر کندہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ جانور اور رسا دونوں قہقہے کے اندر تھے۔ لال خان کو چین اس چار دیواری میں رہنا تھا اور وہاں کے راستے کی حفاظت کر تھی۔ وہ ایک محفوظ جگہ مورچہ ڈن ہو گیا۔ غور سے دیکھنے پر رستم کو اندازہ ہوا کہ کچھ دن پہلے اس چار دیواری میں آتشزدگی ہو چکی ہے۔ ٹکڑی کی اشیاء بھل چکی تھیں اور دیواریں سیاسی مائل ہو رہی تھیں۔ رستم نے سوالیہ نظروں سے ”نے مان“ کی طرف دیکھا۔ ”نے مان“ نے مقامی زبان میں سر ہٹ کر ”جو کچھ رستم کی کچھ میں آیا وہ تھا۔“ لوگ بہت پسے میں تھے۔ انہوں نے آگ لگائی۔“

درحقیقت ”نے مان“ بتا رہا تھا کہ دونوں مورچوں سے شتم خان کا ناجائز تعلق ثابت ہونے کے بعد لوگ بہت پسے میں آگئے تھے، مورچوں تو موقع سے ٹھک کر تھیں مگر لوگوں نے اس گھر کو آگ لگا دی تھی۔

لال خان کو وہیں چھوڑ کر رستم اور ”نے مان“ دبے قدموں شتم کی قیام گاہ کی طرف بڑھے، یہ قیام گاہ کا مقبلی حصہ تھا۔ رستم نے رائل جیکٹ سے نکال کر ہاتھ میں لے لی تھی۔ اب یہ رائل بھی کبھی وقت شعلہ اٹھنے کے لئے تیار تھی۔ ”نے مان“ کا ہتھول بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رستم نے کچھ دیر پہلے ”نے مان“ کی طرف دوڑتی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس ہاتھ کو تھامنے کے بعد نہ صرف ”نے مان“ کا رو بہ حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوا تھا بلکہ وہ اب ایک دم چوک بھی نظر آ رہا تھا۔

مکان کی مقبلی دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے کیٹس کا قہقہا نکالا۔ منہ سے عجیب سی پھکار نکال کر گوہ باہر نکل آیا۔ ”نے مان“ نے اسے کھروری دیوار پر چھوڑا۔ وہ تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کی کمر کے ساتھ خاص طریقے سے بانڈی دی گئی تھی اس کی کندھی طرح جھولنے لگی۔ یہ نائیلون کی مضبوط ری تھی اور اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ ”نے مان“ نے دو تین بار اس کو کھینچ کر گوہ کی ”ثابت قدمی“ کا اندازہ کیا۔ رستم کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ خوند ”نے مان“ اس جانور کے زور سے اوپر چڑھ جائے گا۔ مگر جب وہ ”نے مان“ کا اعتماد دیکھتا تو یقین ہونے لگتا تھا۔ ”نے مان“ نے بڑا بڑا کر کوئی مختصر مناجات پڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے دی کے ذریعے چھت کی منڈ پر پہنچ گیا۔ صرف ایک موقع پر ہی تھوڑا سا ٹھسکی اور جانور کی پھکار سنائی دی لیکن اس کے بعد سب ٹھیک رہا۔ اوپر پہنچ کر ”نے مان“ نے دی جانور کی پشت سے کھول کر نکلیں اور باندھ دی۔ چند ہی لمبے بعد رستم بھی دی کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا۔ ”نے مان“ نے گوہ کو تھپتھپا کر دو بارہ قہقہے میں بند کر دیا۔

وہ دونوں چھت پر بیٹھے ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے۔ سامنے اور بائیں پہلو کی طرف مشعل بردار پیر سے دارموجود تھے۔ گھر کے سامنے کئی گھوڑے بندھے ہوئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ اندر کچھ افراد موجود ہیں۔ باتوں کی مدد آواز سنائی دیتی تھیں۔ گاہے گاہے کوئی بھاری ہجرم قہقہہ گونج جاتا تھا۔ ارد گرد سے پوری طرح ملٹن ہونے کے بعد رستم اور ”نے مان“ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ایک پیر سے دار کی موت اسے جیسے دھکیلے ہوئے چھت پر لے آئی۔ پائینس دو کوئی آہٹ سن کر آیا تھا یا یہ معمول کا کشت تھا۔ رستم نے ایک لمحہ ضائع کے بغیر اس پر حملہ کیا۔ اس کا ایک ہاتھ پیر سے در کے منہ پر مضبوطی

رستم نے دوڑتے دوڑتے مڑ کر پھر دو برست چلائے۔ "نے مان" نے بھی پھتول سے دو تین فائز کئے۔ تاہم زیادہ فائدہ لال خان کی فائزنگ سے ہوا۔ وہ سامنے موجود تھا اور اس کا رخ شتم کے مخالفوں کی طرف تھا۔ اس نے پھتول سے پورے چھ فائز کر کے رستم اور "نے مان" کو نشانہ کر کر دیا۔ رستم اور "نے مان" دوڑتے ہوئے چار دیواری میں پہنچ گئے اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ رستم کے پاس ایمر بخشی میں استعمال کرنے کے لئے ایک دستی بم موجود تھا۔ اس بم کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہونا چاہیے تھا۔ بم رستم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب "نے مان" اور لال خان لکڑی کا تختہ اٹھا کر چور راستے میں داخل ہو گئے تو رستم نے دستی بم کی پٹ پٹھنی اور اسے پوری طاقت سے چار دیواری سے باہر پھینک دیا۔ چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا اور شتم کے پیچھے سے داروں کی کڑاٹی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً اب ان کی پیش قدمی ایک آدھ منٹ کے لئے رک جاتی تھی۔ بھاگنے کے لئے رستم وغیرہ کے لئے یہ وقت کافی تھا۔

چور راستے میں گھستے ہی رستم نے نارنج روشن کر لی اور اگلے قدموں پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اس کی رائفل بالکل ناراحت حالت میں تھی۔ اگر سیزھیوں کی طرف سے کوئی شخص نمودار ہوتا تو رستم اسے چھلنی کر ڈالتا۔ چھلنی ہونے کے لئے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ رستم، لال خان اور "نے مان" دوڑتے ہوئے واپس اگیار سے میں پہنچ گئے۔ اوپر جانے والی سیزھیوں پر کئی مسلح افراد کھڑے تھے۔ وہ اس بھی ان میں موجود تھا۔

رستم کو دیکھتے ہی وہ اس نے پوچھا۔ "شتم کا کیا بنا؟"

"مارا گیا۔" رستم نے کہا۔

سیزھیوں پر کھڑے افراد نے ایک ساتھ زوردار غرور بلند کیا اور چند افراد یہ اطلاع باہر موجود لوگوں تک پہنچانے کے لئے تختہ نما دروازے کی طرف بھاگے۔

"تم سب ٹھیک تو ہو ناں؟" وہ اس نے مقامی زبان میں "نے مان" اور لال خان سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" "نے مان" نے پھتول لہرا کر جواب دیا۔

رستم کی نگاہیں "نے مان" کی پشت پر جمی تھیں۔ اس کے چہرے پر افسردگی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ "میرا خیال ہے، سب ٹھیک نہیں ہے۔ ہم میں سے ایک مارا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ اس نے حیرت سے پوچھا۔

لال خان اور "نے مان" کے چہرے پر تعجب نظر آیا۔ پھر انہوں نے رستم کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ان کے چہرے بھی اتر گئے۔ "نے مان" کی کمر سے بندھا ہوا تھیلانوں سے رنگین ہونے لگا تھا۔ قطرے پٹ پٹ پیچھے گر رہے تھے۔ تھیلے کے اندر مطلق حرکت نہیں تھی۔ "نے مان" نے جلدی سے تھیلہ کمر سے اتار کر پیچھے رکھا۔ اور اسے کھولا۔ فائزنگ کے دوران میں ایک گولی جانور کی گردن میں گئی تھی اور اسے شتم کر گئی تھی۔ یہ پالتو گوا اپنے مالک کے لئے آخری کام انجام دے کر زندگی سے من مو گیا تھا۔

اسی دوران میں اگیارے کے اندر اور درگود قیامت کا شور برپا ہو گیا۔ ایک ساتھ درجنوں دھماکے ہوئے۔ چھوٹے بڑے تھیلانوں سے اندھا دھند فائزنگ ہونے لگی۔ لنگر ہوا، کھانا، غلوں، دروازوں، گچھے، پتھر، گرامر، کمرہ ملاقات، برقی جان کے سینکڑوں سائیکلوں نے خالصین پر فیصلہ کن حملہ کر دیا تھا۔ رستم، لال خان اور "نے مان" وغیرہ بھی دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ یہ قابل لڑائی ایک دم ہی تکتہ مروج پر پہنچ گئی تھی۔ رستم کے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ اس کا چہرہ ہتھار ہوا تھا۔ وہ آج واقعی برقی جان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ لڑائی میں بھر پور حصہ لینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برقی جان کے ساتھ دباؤ کا شکار ہیں اور ان کی دہم پر پختی نے ان کی طاقت نصف کر دی ہے۔ ان سب کا منتقل خیال تھا کہ زری کی جینٹل نے چڑھنے سے ان پر غصہ کے سامنے ہیں اور وہ یہ لڑائی جیت نہیں سکیں گے۔ رستم کی دلی خواہش تھی کہ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہو۔

وہ اگیارے سے باہر آئے تو ہر طرف شعلے رقبہاں نظر آئے۔ وہاں چلا کر بولا۔ "برقی جان نے پھر پورے کمرہ کر دیا ہے۔"

"میرے خیال میں اب اتنی جلدی نہیں کرانی پڑے گی۔" رستم نے بھی پکار کر کہا۔

پھر وہ بھی لڑائی میں شریک ہو گیا۔ وہ دو پیشین بدلا ہوا بالکل اگلی مغلوں میں چلا گیا۔ یہاں گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ دستی بموں کے دھماکے بھی ہو رہے تھے۔ برقی جان کے پاس ٹکار سائیکلوں نے رائفٹوں پر پھینکیں چڑھا کر ایک زوردار ہلہ بولا اور شتم لنگر یوں کو مارنے کا نئے ہوئے کئی سو قدم پیچھے لے گئے۔ اس معرے میں کم و بیش تیس افراد مارے گئے۔ دونوں طرف سے زخمی ہونے والوں کی تعداد دو گنا تھی۔ اس غارت پر بھی دوبارہ قبضہ ہوا کیا گیا جہاں کچھ پر پٹیلے شتم خان اپنے قریبی مصاحبوں کے ساتھ موجود اور بیک وقت دو لہزن کا دوہا بننے والا تھا۔ غارت کے عتب میں ابھی تک ٹائیلوں کی گند لگ رہی تھی۔

اس عمارت کے مستطیل کمرے میں تاحال ان افراد کی لاشیں ٹکھری ہوئی تھیں جو قہوڑی دہم پہلے رستم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ لاشیوں کی روشنی میں ان میں سے کئی کے جسم چھٹی دکھائی دیئے۔ موجودہ معرکے کے دوران میں ان میں چند لاشیں مزید شامل ہوگئی تھیں۔ تاہم شتم کی لاش تکیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لڑائی مسلسل جاری تھی۔ نعرے گونج رہے تھے۔ پلجریں سدا رہے تھے اور گھوڑوں کی ناپوں سے بریلی زمین دہل رہی تھی۔

برق جان عقب سے آیا۔ اس نے رستم کو اپنے اگلوتے بازو میں جکڑا اور زور زور سے جھنجھوڑا۔ یہ اس کا شاپاش دینے کا انداز تھا۔ اس کے کہے ہوئے فقروں میں سے بس دو تین ہی رستم کی سمجھ میں آئے۔ "تم نے حق ادا کر دیا۔ میں خوش ہوں۔ ہم جیتیں گے۔"

رستم نے واس کی وساحت سے کہا۔ "ملک برق جان! مجھے جیت دینی آسان نظر نہیں آ رہی۔ شتم کے ساتھیوں کے پاؤں پھر مجھے ہیں۔ وہ تین اطراف سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ فائرنگ میں تیزی بھی آ رہی ہے۔ ہمیں کافی سخت کرنا پڑے گی۔"

رستم کی بات درست ثابت ہوئی۔ صبح تک مقابلہ جاری رہا۔ برق جان کے ساتھی تعداد میں قدرے زیادہ ہونے کے باوجود شتم کے ساتھیوں کو سزیدہ پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوئے اور نگہ کرنے میں۔ رستم نے برق جان سے کہا۔ "ملک برق جان! تم ایسی لڑائیوں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو مگر میرا خیال ہے کہ تم نے شتم کی موت کے بعد حملہ کرنے میں جلدی کی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" برق جان نے واس کی وساحت سے پوچھا۔
"قہوڑا انتھار کرنا چاہیے تھا تا کہ شتم کی موت کی خبر پھیل جاتی۔ لگتا ہے کہ شتم کے قریبی ساتھیوں نے اس کی موت کی خبر پھیلانی ہے۔"

رستم کی بات میں وزن تھا۔ برق جان تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا پھر بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے اب کیا کرنا چاہیے؟"
"قہوڑی سی سہا کی دکھانا پڑے گی۔" رستم نے کہا۔

وہاں عمارت میں کھڑے تھے جہاں کچھ دیر پہلے رستم اور "مان" نے حملہ کر کے شتم کو قتل کیا تھا۔ شتم کی لاش ایک تاریک دیوڑھی سے برآمد ہو چکی تھی اور چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ رستم نے، "مان" کو سمجھایا اور اسے لے کر لاش کے سر ہاتھ پہنچایا۔ "مان" کے ہاتھ میں ایک بڑے پھل والا دوڑنی لکھا ہوا تھا۔ رستم نے لاش پر سے چادر ہٹائی۔ "مان" نے لکھاڑے کے ایک ہی بھر پور وار سے شتم خان کا سر آڑا دیا۔ یہ خونخیز منظر تھا اور قدیم دور کی کسی وحشی جنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ رستم نے کوشش کر کے شتم کے بھاری

بھگرم سر کو ایک لمبی برچھی کے اوپر چڑھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد برچھی میں ٹنگا ہوا یہ سمر عمارت کی چھت پر تھا اور سورج کی اوٹیں کرنوں میں چمک کر دور در دور دکھائی دے رہا تھا۔ اس سر کے قریب کھڑے ہو کر برق جان کے درجنوں ساتھیوں نے فلک دکھانے کے لئے بلند کئے۔ رستم جاننا تھا اور باقی سب بھی جان گئے تھے کہ یہ مخالف فریق پر فیصلہ کن حملے کا وقت ہے۔

برق جان نے ایک لٹکا ہوا باندیا اور اپنی رائفل لہرا کر حملے کا حکم دیا۔ درجنوں رائفلس ایک ساتھ چلیں اور رتر تر تازہ کی خونخیز آواز سے درود پورا گونج اٹھے۔ رستم ایک اوٹ میں موجود تھا۔ وہ بھی مسلسل فائرنگ کرنے لگا۔ اس نے لڑائی بھڑائی کے بہت سے مناظر دیکھے تھے مگر اسے بڑے پیمانے پر لوگوں کو ایک دوسرے پر گولیاں برساتے، اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اسی دوران میں رستم کو ناصر دکھائی دیا۔ اس کے پاؤں میں تیزی نہیں تھی اور ہاتھوں میں رائفل موجود تھی۔ اسے اپنی طرح تیزی سے آزاد دیکھ کر رستم کو تسلی ہوئی۔ ناصر، رستم کے قریب ہی اوندھا حلیت گیا اور رائفل سونٹ کر لڑائی میں شریک ہو گیا۔ رستم اور ناصر سے قہوڑے سی فاصلے پر شتم خان کا کتا ہوا سر طویل برچھی پر ٹنگا ہوا تھا۔ اور دور دینے بھی صاف پہچانا جاتا تھا۔ یہ بڑا خونخیز منظر تھا لیکن اس منظر کے سبب لڑائی جلد ختم ہونے کا امکان بھی تھا۔ شتم خان کے ساتھیوں کے حوصلے بڑی تیزی سے پست ہوئے تھے۔ ان کی مزاحمت میں پہلے والی شدت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ان جانے کیوں رستم کا دل کھرا تھا کہ اگر اس موقع پر باہر نکل کر شتم کے ساتھیوں پر چھینا جائے تو وہ پوزیشنیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اس نے یہی بات واس کے ذریعے برق جان سے بھی کہی۔ برق جان تذبذب میں نظر آ رہا تھا مگر جب رستم، ناصر ان کے دائیں بائیں لڑنے والے چند افراد ایک ایک اٹھے اور فائرنگ کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے تو بہت سے دیگر افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند سینکڑ میں "چارن" کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ رستم سب سے آگے دوڑنے والے چند افراد میں سے تھا۔ اس کا انداز قابل دیدہ تھا۔ لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ تھمرا رہا تھا۔ رائفل شعلہ اگل رہی تھی۔ یہ ایک فطری تربیت! یہ خود دشمنی تھی۔ یہ سب سائنہ سمجھت تھی۔ اس کی رائفل پر چڑھتی ہوئی تنگین سورج کی رو بہیلی کرنوں میں دمک رہی تھی۔ لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ شتم کے سو ڈھچ سو ساتھیوں کا براہ راست اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک بار قدم اکھڑنے کی دھجھی۔ پھر کچھ ان کے پاؤں نہ چم سکے۔ اس پہپائی کے دوران

میں کئی افراد مارے گئے اور کئی زخمی ہو کر گرے۔ رستم، نے مان، ناصر اور ان کے درجنوں ساتھیوں نے شتم کے بہت سے ساتھیوں کو آبی گزرگاہ کے قریب گھبرے میں لے لیا۔ ان میں سے بہت سوں نے گھبراہٹ میں بچ بچ پانی کے اندر چھلانگیں لگا دیں۔ اس کے بعد فقط پانچ دس منٹ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ شتم کے ساتھیوں نے شکست تسلیم کر لی۔ کچھ نے سفید جھنڈے لہرائے، کچھ نے ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر خود کو برقی جان کے حوالے کر دیا۔ کچھ گھبر کر بکڑ لیا گیا اور ان کی منگھلیں کس دی گئیں۔ مشرقی جانب اب ایک جگہ ایک ٹکڑی نے مزاحمت جاری رکھی پھر وہ بھی دم ہٹا لی۔

وہ پورے کا پورا دن ہنگامہ خیز رہا۔ شتم کے بڑے بیٹے ارفا خان سمیت اس کے بہت سے قریبی ساتھی پکڑے گئے تھے۔

وہ پورے ذرا پہلے واس نے آکر بتایا۔ ”وہ خار بجائی بھی پکڑی گئی ہیں جو شتم کی دلہنیں بن رہی تھیں۔ انہیں مشرقی کنارے کے ایک گھر کے تہ خانے سے پکڑا گیا ہے۔“
 ”وہ کیا کہتی ہیں؟“ ناصر نے پوچھا۔

”اب انہوں نے اپنے سارے بیان بدل لیے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شتم نے انہیں ذرا دھکا کر رکھا ہے اور پھر لگا ہوا تھا۔ انکار پر وہ انہیں تشدد کا نشانہ بناتا تھا اور جھوٹے الزامات لگاتا تھا۔“

رستم نے پوچھا۔ ”بڑی بھاری کے جذبات اب کیا ہیں؟“
 ”لڑائی میں کامیابی پر وہ خوش ہے۔ شکر ہے کہ مہات کے لیے آج بھار خانے اور اگیارے میں بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔“ واس نے بتایا۔

”اب تو وہ کارنی کے ذبح ہونے کی بات نہیں کر رہی؟“ ناصر نے دریافت کیا۔

”جیسے“ واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب وہ اس حوالے سے خاموش ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی زبان بند ہو گئی ہے ورنہ اس نے تو ہر طرف آگ لگا دی ہوتی۔ وہ اور اس کی ساتھی بھاریاں لوگوں کو بری طرح بھڑکا رہی تھیں۔ اور جگمگات تو ہیں ہے کہ لوگوں کو بھڑکانے میں انہیں زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی۔ لوگ ذری کے بچ جانے اور لڑائی میں شکست کو ایک ساتھ دیکھنے لگے تھے۔ انہیں پکارتیں ہوتا جا رہا تھا کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعے کی وجہ بنتا ہے۔“

”ذری اب کہاں ہے؟ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ناصر نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

”وہ اپنی بدلی ہوئی صورت کی وجہ سے بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ اپنے منہ سے وہ سر پر ہر وقت کپڑا لپیٹے رہتی ہے۔ دونوں تو وہاں روتی ہی رہی ہے مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے۔ ملک برقی جان نے اسے خاص حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو اس سے ملنے نہیں دیا جا رہا۔ میں ایک دون میں کوشش کروں گا کہ اس سے ملاقات ہو سکے۔“

واس تو کھربا ہوا تھا مگر اسے خود بھی امید نہیں تھی کہ ذری سے ملاقات ہو سکے گی۔ تاہم جو کچھ وہ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ شام کے کچھ ہی دیر بعد واس تیزی سے اندر آیا۔ اس نے گھر کا قفل بھی خود ہی کھولا تھا۔ ارد گرد کی پہرہ دار موجود نہیں تھا۔

”آؤ میرے ساتھ۔۔۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے۔“ واس نے کہا۔ ”ذری سے مل لو۔“
 ”کیوں، کیا ہوا؟“

”مرنے والوں کو اجتماعی طور پر دفن کیا جا رہا ہے۔ اکثر محافظ اور پیرہ دار وہاں گئے ہیں۔ برقی جان اور اس کے قریبی ساتھی بھی وہیں ہیں۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے۔“ اس نے رستم کا ہاتھ تھام لیا۔

”لیکن۔۔۔ ناصر بھی جانا چاہتا ہے۔“ رستم نے کہا۔

واس ذرا حیران نظر آیا۔ جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ ناصر وہاں جا کر کیا کرے گا؟ معاملہ تو تمہارے اور ذری کے بیچ ہے۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ ”معاذ“ کس کس کے درمیان ہے۔ رستم کے کہنے پر واس نے ہاتھ کو بھی ساتھ لیا۔ تیز یوں کی وجہ سے دونوں تیزی سے قدم نکال اٹھا سکتے تھے، تاہم فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ برقی جان کا گھر چند قدم کی دوری پر ہی تھا۔ اب گھر کی چھت پر ایک کے بجائے تین جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ تین جھنڈے کے ظاہر کرتے تھے کہ برقی جان بستی کا باقاعدہ اٹھان لگا رہا ہے۔ واس ان دونوں کو ایک چھوٹے سے قطبی دروازے کے ذریعے اندر لے گیا۔ ایک طویل اور تاریک راہداری سے گزر کر وہ بالکل ایک نیا گھر میں آئے۔ یہاں ذری موجود تھی۔ لائٹن کی روشنی میں وہ عجیب و غریب نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص ادنی ادنی لباس میں تھی مگر اب اس لباس کے اوپر ایک ادنی ادنی اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ یہ اضافہ اسے اپنا صفحہ چٹ سر پہنانے کے لیے دی گئی تھی۔ اس کی پٹنوں میں بھی موٹری جا چکی تھیں۔ رستم اور واس کو ایک نیا گھر اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے اضافہ ہونے والے لباس پر اڑاؤ چھانپا اور چہرہ بھی ڈھانپ لیا۔ پھر وہ ایک ذری ہوئی بھری کی طرح اپنا سر ایک کونے میں چھپو کر بیٹھ گئی اور سٹ کر گھڑی بن گئی۔

اسے اپنی حیثیت کھڑائی سے شرم آ رہی تھی۔ اس نے اسے بڑھ کر پکارتا۔ "انجھ جاؤ۔۔۔ سب جانتے ہیں۔ یہ کوئی غیر نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ میں نہیں۔" اس نے چادر کے اندر ہی اپنا سر لپی میں بلا دیا۔

رستم کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ خود آگے بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہولے سے زری کے شانے پر رکھا۔ "زری! اب چھپانے سے کیا فائدہ؟ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اور ویسے بھی، تم بری تو نہیں لگ رہی ہو۔ بس شکل ذرا بدل گئی ہے اور کچھ نہیں ہوا۔"

وہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ رستم نے کوشش کر کے اسے اٹھایا اور پھر سمجھا بھنجا کر چادر بھی اس کے چہرے سے ہٹا دی۔ وہ آنکھیں بھٹکانے سے شرمندہ کھڑی تھی۔ رستم نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ "جتنی بات یہ ہے زری کرتی ہے بھی میری نہیں لگ رہی ہو۔"

"آپ نے فحشک کہا رستم بھائی۔" ناصر بولا۔

اس نے بھی سر ہلا کر تائیدی کی۔ وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر بھی وہ اپنی اوجھنی کو سر سے سرکنے نہیں دے رہی تھی۔

اس ارد گرد نگاہ رکھنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زری نے پہلی بار پھر پر نظروں سے رستم کو دیکھا۔ وہ واقعی زیادہ بد صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید یہ اس کے چہرے کی بے پناہ معصومیت کا اعجاز تھا۔

رستم نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ "زری! ایک بات بڑی اچھی طرح دماغ میں رکھنا۔ برق جان کو یہ بالکل نہیں بتانا کہ تم اپنی مرضی سے چل کر میرے پاس آئی تھیں اور بعد میں جو کچھ ہوا وہی تمہاری مرضی سے ہوا تھا۔"

رستم نے یہ بات کسی اور لڑکی سے کہی ہوتی تو وہ شرم سے لال لگاتی ضرور ہوتی مگر یہ زری تھی۔ اس کا ہر انداز نیا رہا تھا۔ جنگل میں پہننے والی ندی کی طرح اس کے اپنے ہی طور طریقے اور اپنا ہی بہاؤ تھا۔

"نہیں۔ میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں وہی بولتا رہا جو تم نے کہا۔"

"آنکدہ بھی وہی کہتا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے دیکھنے کے لیے واس کے گھر آئی تھیں۔ میں نے تمہیں پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لایا۔"

"اور مجھ کو بہت اچھا لگا۔" وہ پہلی بار ذرا سا شرمائی۔

ات۔ "رستم نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔ "جتنی بات تو کسی سے کہنی نہیں ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ میں نے تمہیں پکڑ لیا اور تم ڈر گئیں۔"

"اوہ۔ ہم کو پھر ملطی لگا۔" اس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اس کے گلے میں لوہے کا ایک ملائم کڑا تھا جس پر کچھ کھدوا ہوا تھا۔ یہ اس امر کی نشانی تھا کہ یہاں کے دستور کے مطابق زری محض ہے۔ وہ گارنی کا درجہ پانے کے باوجود آجک پر قربان نہیں ہو سکی۔ وہ اب اپنا اجڑا بچڑا حلیہ بھول گئی تھی اور بڑی گرم نظروں سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ ناصر بالکل انجان بن گیا تھا۔ وہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی آجک درخت کی چتریل شیشہ پر چمکا ہوا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ اسے دیکھنے میں مگن ہے۔

زری بڑی بے باکی سے اپنا چہرہ رستم کے چہرے کے قریب لے آئی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "تم بہت اچھا ہو۔ ہمارا دل پھر تمہارے ساتھ سونے کو کرتا۔"

رستم اس بے باکی پر شیشہ لگا۔ "تمہارا چاچا اس پاس ہی ہے۔" رستم نے اسے ڈرانے کی ناکام کوشش کی۔

وہ ایک دم بچھڑ گئی۔ اس کا دھیان ایک بار پھر اپنے اتر حلیے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اپنی اوجھنی کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھ گیا۔ اب میرا شکل خراب ہوتا۔ میں تم کو اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں زری۔" رستم نے اس کے ملائم کال کو ٹھٹھا اور ذرا چمک گیا۔ اس کا کال غیر معمولی طور پر چم رہا تھا۔ "ناصر اذرا دیکھنا۔ اسے بخار لگ رہا ہے۔" رستم نے کہا۔

ناصر جلدی سے زری کی طرف آیا۔ اس کی پیشانی کو ٹھٹھا اور اس کی کھائی پکڑ کر بغض دیکھی۔

"ہاں، بخار ہے اسے۔" وہ بولا۔

"نہیں لگ نہیں رہا کہ تمہیں بخار ہے؟" رستم نے اس سے پوچھا۔

"مجھ کو بخار نہیں ہے۔" وہ بہت سادگی سے بولی۔

چانک! اس تجزی کی سے انداز آیا۔ "چلو، یہاں سے نکلیں، پہرہ اڑا رہے ہیں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دو گلی والے دروازے سے آئے ہیں۔"

ناصر نے زری پر محبت بھری الوداعی نظروں سے اسے دیکھا اور رستم کے ساتھ ہی واپس کے لیے چلا۔ ان دونوں کے پاؤں میں کھنکھراتا لوہا تھا جس کے سبب وہ زیادہ تیزی نہیں دکھاسکے۔ یکایک انہیں کہیں پاس کی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ پہرہ اڑان میں پہرہ اڑاؤں میں سے ایک تھا جو زری، رستم اور ناصر وغیرہ کی ساری زرداد جانتے تھے۔ ان تین

پہرے داروں کے علاوہ صرف بڑی بھاری ہی اس واقعے کی رازدواں تھی۔ ان کے علاوہ ہستی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زری کی دو شیزگی کیونکر ختم ہوئی ہے۔ اور حقیقت میں تو ان افراد کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے رستم کو قصور وار سمجھتے تھے جبکہ زری کا جسمانی تعلق ناصر سے ہوا تھا۔

پہرے دار رستم اور ناصر کو کچھ کبریٰ طرح چونکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے داخل سیڑھی کر لی۔ اپنی زبان میں اس نے رستم اور ناصر کو جہاں کا تہاں کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا ساتھی بھی اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ یقیناً وہ چاہتا تھا کہ دیگر پہرے دار اس صورت حال سے باخبر نہ ہو سکیں۔ رستم نے دیکھا کہ وہ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد رستم نے برق جان کو بھی اپنے سامنے پایا۔ اس کا چہرہ جھٹکا رہا تھا اور آنکھیں انگارہ تھیں۔ وہ پہلے ہی اس سے مخاطب ہوا۔ ان کے درمیان مقامی زبان میں مکالمہ ہوا۔ اس مکالمے کی جو باتیں رستم کی سمجھ میں آئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

برق جان نے کہا۔ ”واں! مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ان سارے معاملوں میں تمہارا ہاتھ ہے۔ لڑائی کے موقع پر ان لوگوں کے فرار ہونے میں بھی ضرور تمہاری اور تمہاری بیوی کی مدد شامل تھی۔ اب سب کچھ ثابت ہو رہا ہے۔“

واں کا سر جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ برق جان کے سامنے منھائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔

برق جان بولا۔ ”اب تو مجھے ایک اور شک بھی ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے۔۔۔ کہ اپنی جتنی کو ہیئت سے بچانے کے لیے تم نے خود اسے غیر ضروری حوالے کیا ہے۔“

واں نے کئی میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”خدا کے لیے ایسا مت کہیں ملک! کیا آپ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں؟“

”تم نے حرکت تو ایسی ہی کی ہے۔ اپنی جتنی کے سہ بولے خاوند کو اس سے ملانے کے لیے یہاں لے آئے ہو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر میری مکمل کیا تو کتنا بڑا خوفانہ آئے گا۔ لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں۔ اس شخص کا نام چاہتا جا رہے ہیں جس نے گارنی کو خراب کیا۔ میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ تو بیوقوف ہے ہی، تم اس سے بڑے بیوقوف آئے ہو۔ مجھے جرات ہو رہی ہے تم پر۔“

”میں ان دونوں کو زری سے ملانے نہیں لایا تھا۔ آپ کی رہائش گاہ دکھانے لایا

تھا۔“ واں نے بات بتائی۔

”بھوکا بند کرو۔“ برق جان دھاڑا۔ ”مجھے اتنا کاڈوی مت سمجھو۔ جو کچھ میرے ارد گرد ہوتا ہے، میں دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں۔ خاموش رہوں تو اور بات ہے۔ کیا یہ بات غلط ہے کہ تم نے ان تینوں کو فرار کرانے کی کوشش کی اور ساتھ میں یہ شرط رکھی کہ یہ تمہاری جینگی کو بھی اپنے ساتھ ساتھ۔ یہاں سے لے جائیں گے؟ تاؤ۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر تاؤ۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

واں نے لڑاں آواز میں کہا۔ ”م۔۔۔ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں مگر یہ مت بھولیں کہ جب یہاں آپ کی سرادری نہیں تھی۔۔۔ یہاں شوقم خان کا حکم چل رہا تھا۔ اور شوقم خان کے لیے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت تھی وہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”مگر زری کا ہیئت چڑھا شوقم خان کا معاملہ تو نہیں تھا۔ یہ تو مذہبی معاملہ تھا۔“

”مجھے معلوم ہے ملک۔ اور آپ بھی بے خبر نہیں ہیں کہ شوقم مذہب کو کس رخ پر لے جا رہا تھا۔ وہ اپنی من مرضی کو ہی مذہب کا درجہ دینے لگا تھا۔“

واں کی اس بات نے برق جان کے اہل کو قدرے کم کیا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لے کر کمرے کے اندر ہی چند قدم چھل قدمی کی اور واں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مجھے ان دونوں کی ناوائی پر اتنا افسوس نہیں جتنا تمہاری بے پروائی پر ہے۔ جہیں پتا ہے کہ میں ان دونوں کو لوگوں کے فحشے سے بچانے کے لیے کیا کیا پاپڑ پتل رہا ہوں۔ مگر کچھ رقم ملنے ان کو یہاں لانے کی جرات کی ہے۔ بڑی بھاری بارود سے بھرا ہوا بم بنی ہوئی ہے۔ اسے بس چنگاری دکھانے کی ضرورت ہے۔“

”میں اپنی لطفی پر شرمندہ ہوں۔“ واں نے فوراً معذرت کی۔

برق جان کے چہرے پر کتاؤ برقرار رہا۔ وہ رستم اور ناصر کی طرف ایک ساتھ دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میرے خیال میں اب کچھ باتیں مکمل جانی چاہئیں۔ ان دونوں کو بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ میں ان کے لیے کتنا جوہم افکار رہا ہوں اور ان سے کیا چاہتا ہوں۔ میری اس بات کا اثر جبر کے کر نہیں بناؤ۔“

واں نے فوراً تڑجہ کیا۔

رستم نے جواب دیا۔ ”ملک! ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بے شک تم نے ہم پر احسان کیے ہیں لیکن ہم نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تمہارا یہ شکوہ دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے پہلے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔“

”میں اس بات سے انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم نے بار بار مجھے سخت مایوس بھی کیا ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثالی ہے کہ تم اس وقت یہاں موجود ہو۔ مجھے تمہاری کچھ باتیں یاد تھیں۔ آری۔ اگر تمہارے اندر عورت کی اتنی جھوک ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔ میں دو چار لڑکیاں تمہارے لیے پابند کر دیتا ہوں۔“

”نہیک ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا لیکن کیا میں اطمینان رکھوں کہ زری یہاں بالکل محفوظ ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ تم شرطیں پیش کر رہے ہو۔ حالانکہ شرطیں بتانے کا حق میرا ہے۔“

”جلو تم ہی بتاؤ۔ لیکن اچھا بادشاہ اپنی تین درجن شرطوں کے ساتھ ایک آدھ شرط کا رعایا کی بھی مان لیتا ہے۔“

”رستم کے لیے میں بلا ساختہ تھا۔“

برقی جان نے بہرہ یاروں سے کہا کہ رستم اور نامرگوں کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا جائے۔ اس نے اس کو بھی حکم دیا کہ وہ رستم کے فرمائش انجام دینے کے لیے رستم اور نامرگوں کے پاس موجود رہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر میں بیٹلن کیلنگنگ کے لیے رستم کے پاس آ رہا ہے۔ وہ تینوں رہائش گاہ پر واپس آ گئے۔ برقی جان کے آنے سے پہلے ایک بار پھر رستم کے لیے وہی جام یا چندرہ پھلے اس کے گھر میں آیا تھا۔ سونے کے اس بڑاؤ جام میں وہی ٹھول بھگورے لے رہا تھا جو اس کے بھول برقی جان کی طرف سے دوستی اور قربت کا پیغام تھا۔ ایک طرح سے برقی جان نے وہ بارہوہ جام بھیج کر دوستی کی تجدید کی تھی۔ رستم نے اس نشہ آور جام کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پہلے کر چکا تھا۔ اس نے پھر یہ اردوں کی نظر بچا کر جام ایک طرف اٹھل دیا۔

دس پندرہ منٹ بعد برقی جان بھی پہنچ گیا۔ وہ اپنے چہرے کو مائل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاؤں جو اس کی آنکھوں سے گہری تنہید کی نماں تھی۔ قہر سے کی چالیاں بھجری تپائی پر چن دی گئیں۔ برقی جان نے نامرگوں کا ہر جانے کا اشارہ کیا۔ بند کمرے میں رستم، واس اور برقی جان رو گئے۔

برقی جان نے تنہیدیں انداز میں اپنے کپڑے ہانڈی طرف دیکھا اور غصہ سے ہونے لگے میں کہنا شروع کیا۔ ”آج میں تم دونوں سے کچھ اپنے دل کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جو میں نے بہت کم کسی سے کی ہیں۔ یہ باتیں کئی برسوں سے یا شاید لڑکھن سے ہی میرے اندر موجود تھیں مگر میں ان کو زبان پر نہیں لاسکتا تھا شاید ابھی نہ لانا۔ مگر اب حالات کچھ بدل گئے ہیں مجھے لگتا ہے کہ یہاں کچھ تبدیلیاں لاسکتا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ

لوگ ان تبدیلیوں کو قبول کر سکتے ہیں۔“

چند لمبے وقفہ کے اس نے اپنے خیالات جمع کیے اور بولا۔ ”ہمارا یہ قبیلا اس علاقے کے قدیم ترین قبیلوں میں سے ہے۔ پتھر کی بسلوں پر جو کچھ لکھا ہوا ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو دو سو سال پہلے بھی ہم لوگ موجود تھے اور اس کے ساتھ ہمارے عقیدے بھی۔ آجکے درخت اور سوسے کے چوں کی پوجا یہاں ہمیشہ سے جاری ہے۔ چند سو سال پہلے تک ہمارے قبیلے کی ایک شاخ ”روئے“ ہاش پستان کے شمالی کنارے پر بھی آباد تھی لیکن اب سب کچھ صمت سنا کر یہاں جمع ہو چکا ہے۔ ہم جہنم کی سرحد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“

اس نے چند لمبے وقفہ کے بات جاری رکھی۔ ”میری یہ خواہش رہی ہے کہ غلام رسوں کو یہاں سے ختم کیا جائے۔ خاص طور سے ایسی رسوں کو جو ہمارے مذہب کا حصہ نہیں ہیں۔ بس خواہ وہ مذہب میں شامل کر لی گئی ہیں۔ اس تم میری بات سے اتفاق کر رہے ہو نا؟“

”آپ کی سوچ ہمیشہ میری اپنی سوچ رہی ہے۔“

”اب یہاں پر شادی کے معاملات ہی دیکھو۔ شروع شروع میں ادھیڑ عمر عورتوں سے شادی کرنے کی پابندی صرف ملک (سرदार) اور اس کے بیٹوں پر ہوتی تھی۔ اور وہ واقعی اس کی پابندی کرتے بھی تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رواج منہ دکھاوے کے لیے دوسرے لوگوں میں پھیلا۔ ملک کی خوشدہی کو چاہنے والے لوگ جان بوجھ کر جوانی میں ادھیڑ عمر عورتوں سے شادی کرتے ہیں اور جوان لڑکیوں پر دال بکاتے ہیں۔ نتیجے میں جرم پران چھتا ہے۔ اور اب تو اس بات میں کوئی شک نہیں رہی کہ شوہر خان جو بلا نظر برسوں سے رنڈے کے طور پر زندگی گزار رہا تھا، رنگ لایاں مٹاتا ہوا چکرا گیا۔ جب سردار کی یہ حالت ہے تو دوسروں کے بارے میں کیا قیاس کیا جاسکتا ہے۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ پورے پاؤندہ قبیلے کے لیے شرمناک ہے۔“

واس نے ہنکارا بھرا۔

”اب اس ہیئت چاہنے والی رسم کو ہی لے لو۔ ہر سال کم از کم دو جوان لڑکیوں کا خون بے دردی سے بہا دیا جاتا ہے۔ شروع میں یہ رسم صرف اس وقت ادا کی جاتی تھی جب قبیلے پر کوئی بڑی آفت آتی تھی اور اگیارے میں ہونے والی عام عبادتوں سے فطی نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس رسم کو ہوا کا حصہ بنایا گیا۔“

”سفید کپڑے پہنوں سے رنگے ہاتھوں کی چھاپ لینے کا رواج تو جھپٹے چالیس پچاس

سال میں بتا ہے۔" وہ اس نے کہا۔

برقی جان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "میں ان چیزوں کو شمع کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں کی زندگی کو قدیم دور کے اندھیرے سے باہر کھینچنا چاہتا ہوں۔ عجائبات سمجھتی ہیں کہ شاید میں یہاں کے مذہب کو چھینڑنا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف ان چیزوں کو نکالنا چاہتا ہوں جو مذہب سے باہر کی ہیں۔ اور اس کے لیے۔ ہاں، اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے وہ براہ راست رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میری مدد؟" رستم نے اس کی وساطت سے پوچھا۔

"ہاں، تمہاری مدد کی۔ مجھے لگتا ہے کہ جو کام میں چاہتا ہوں وہ تم کر سکتے ہو۔ یقیناً کر سکتے ہو۔"

وہ اس نے برقی جان کے فخر کے ساتھ کر کے رستم تک پہنچایا۔ رستم نے اس کے ذریعے کہا۔ "لکھ برقی جان! کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے؟"

برقی جان نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "جب تم باہر سے اس ٹاپ پر لائے گئے تھے تم نے وہ آبی گزرگاہ دیکھی ہوگی جس میں برقانی نوے گرتے رہتے ہیں۔ یہ یہاں کی اکلوتی آبی گزرگاہ ہے۔ کئی بھگنوں پر اس کی گہرائی دو سو فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ اس گزرگاہ کے بارے میں ایک پرانی روایت ہے۔ قریباً دو سو سال پرانی! کہتے ہیں کہ یہ گزرگاہ پہلے موجود نہیں تھی اور ایک بڑے زلزلے کے بعد وجود میں آئی۔ اس زلزلے کے سبب زمین دو تھم ہو گئی اور راستہ بن گیا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، اس راستے کے درمیان ابھی بھی گہنیں چٹانیں موجود ہیں۔"

"کہا جاتا ہے کہ ایک ایسی ہی چٹان تک پہنچنے کے لیے پانی کے اوپر چلنا پڑا تھا۔" رستم نے اپنی معلومات بیان کیں۔

برقی جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "درحقیقت میں تم سے اسی چلنے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ شاید تم نے اس چلنے کے بارے میں بس سنا ہے، دیکھا نہیں۔" رستم نے سر ہلا کر اس کی بات کو درست قرار دیا۔ "برقی جان نے بات جاری رکھی۔ یہ چلنے اتنا تنگ نہیں جتنا دور سے نظر آتا ہے مگر اسے پار کرنا لوگوں کو بہت دشوار محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً اس کی وجہ وہ روایتیں ہی ہیں جو اس سے منسوب ہیں۔"

"کیسی روایتیں؟" رستم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں روایتوں کے بارے میں بتانے سے پہلے اس چلنے، چٹان کے بارے میں بتا دوں جہاں تک یہ چلنے پہنچتا ہے۔ جو کچھ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں، وہ ان سے سیکھا جاتا ہے کہ یہ چلنے زلزلے کے بعد خود بخود دین کیا تھا۔ یہ بہت بائبل اور مضبوط درخت کا ایک تانہ ہے جسے قدرتی طور پر پیچے سے ایک دو آہٹری ہوئی چٹانوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ یہ چلنے آبی گزرگاہ کے قریب وسط تک پہنچتا ہے۔ یہاں ایک چٹان پر ایک مجسمہ ہے۔ مجسمے کی ٹوکھ میں پتھر کی ایک سیل پڑی ہے۔ اس سیل پر دو سو سال پہلے کی بزرگ عجائیوں نے کچھ باتیں لکھی تھیں۔ اس تحریر کے مطابق تحریر کے مالک سردار کو یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اس پاؤندہ قبیلے کے رسم و رواج میں کچھ ضروری تبدیلیاں لائے۔ مگر اس سے پہلے کہ پتھر پر کندہ ہوئی یہ تحریر سردار کے سپرد کی جاتی۔ زلزلے والا واقعہ ہو گیا۔ اس میں بہت کچھ دردم برہم ہو گیا۔ پتھر پر لکھی ہوئی تحریر برقانی ندی کے وسط میں چٹان پر پڑی رہ گئی۔ کچھ لوگوں نے یہ گمان بھی کیا کہ وہ بات تبدیلیاں چاہتے ہی نہیں تھے اس لیے ٹاپ پر آفت نازل ہوئی۔ مگر اگلے ایک سو سالوں میں اس خیال کو سوچنے والے لوگ کم رہ گئے۔ بعد میں یہ عقیدہ بن گیا کہ اگر کوئی شخص کڑی کا چلنے پار کر کے جسے تک پہنچے گا اور پتھر کی لکھی ہوئی سیل اٹھا لائے گا تو موجودہ سردار کو بھی وہی اختیار مل جائے گا جو دو سو سال پہلے کے سردار کو ملے۔ یعنی وہ بھی یہاں کے رسم و رواج میں ضروری تبدیلیاں لائے گا۔"

"کیا لوگوں نے بدل لائے؟ کوئی کوشش کی؟" رستم نے پوچھا۔

"اب میں تمہیں اس روایت کے بارے میں بتاتا ہوں جو اس چلنے کے بارے میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور وہ روایت یہ ہے کہ اس چلنے کو پانچ سو سال پہلے پار نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر چلنے کے آخری چار قدم بہت زیادہ چال بڑا ہیں۔ یہ خیال یا عقیدہ سینہ بہ سینہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اب محض حقیقت کی طرح ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اس چلنے کا تنگ نہیں جتنا دور سے نظر آتا ہے۔ بلکہ تم سے قریب سے دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے۔ اس پر چل کر اسے پار کیا جاسکتا ہے مگر لوگ پار نہیں کر سکتے۔ میرے بچپن سے اب تک میں چار افراد اس چلنے پر گئے ہیں۔ دو تو ہلاک ہوئے تھے، ایک دو کو پھانسی لٹا دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ سلسلہ چلتا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟ چلنے پار کیوں نہیں ہوتا۔ کیا پکڑ وغیرہ آجاتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ نیچے چلنے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوں اور پکڑا جاتے ہوں لیکن میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ سب عقیدے اور دیکھ کر اتنا پختہ ہے۔ لوگوں کے

برق جانے سے جڑے سے بچنے کے لیے اور سرنگی میں ملایا جیسے رستم کو تانا چاہا۔ وہ باہر کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں پا رہا۔ جب وہ ایک دم کھڑا ہوا اس نے رستم کو دیکھا اور غصے سے بولے "مجھے میں کہا۔" جواب دینے میں جلدی نہ کرو۔ ایک دو دن اچھی طرح سوچ لو۔ اس سے بھی مشورہ کرو۔ اور ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ میں جو کچھ کرنا چاہ رہا ہوں اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ میں لوگوں کی وہ تمہیں کم کرنا چاہ رہا ہوں جو تمہیں کے نام پر یہاں مسلط کر دی گئی ہیں۔"

اس رات رستم، وہ اس اور ناصر میں دیر تک بات چیت ہوئی۔ وہ اس اس مرحلے میں برق جان کی طرف فوری کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "برق جان جو کچھ بھی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ کو تانا دے گا۔ اس کا ثبوت تم دونوں دیکھ رہے ہو۔ وہ جو کام نہیں کر سکتا اس کی امید بھی نہیں دلا رہا۔ اس نے صاف الفاظ میں تمہیں بتایا ہے کہ تمہیں یہاں سے آزاد کرنا اس کے اختیار میں نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ مقامی قانون کی سب سے بڑی خلاف ورزی ہوگی۔ لوگ شاید اسے زندہ ہی نہ چھوڑیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہماری قبریں یہیں نہیں کی۔" ناصر نے غصے سے کہا۔

"میں تمہارے سامنے ناپاکی کی بات کرنا نہیں چاہتا اور نہ میں نے کبھی کی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے یہاں کے بڑے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے اور جانتا ہے وہ یہی ہے کہ اس پاؤندہ ہستی میں باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص کبھی یہاں سے واپس نہیں گیا۔ کم از کم پچھلے ڈیڑھ دو سو برسوں میں تو ایسی مثال نہیں ہے۔ اس ناچکی کی ظالم چڑچاہائیاں کبھی کسی کی کوراست نہیں دیتیں۔ باہر آنے جانے کا فقط ایک راستہ ہے اور اس راستے سے بلا اجازت گزر جانا ایسا ہی ہے جیسے سوئی کے گائے کے اوٹ گزرنا۔"

"تو پھر تم کیا کریں۔" میٹھیس مر جائیں۔" رستم نے زنج بوکر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ یہاں پر زندہ رہیں اور اوپر کی طرف سے کسی انہو کی کا انتظار کرتے رہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہاں شادیاں کر لیں۔ بچے پیدا کریں اور ملک کی جاگری کرتے رہیں۔ پھر ایک دن تمہاری طرح ہمیں بھی یہ فریاد جھنپا دینا پڑے گا۔ ہم قبوہ بنیں، مگر گزری کے شش لیں۔ اور صبح سویرے برقانی مرغ کا شوق باسز پر کربھیز بکریوں کے پیچھے نکل جائیں۔" رستم نے ہر شے سمجھ کر کہا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ کام کو شش کرنے اور جانس کی

طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ اب کچھ دیر تک برق جان کی مرضی کے مطابق چلو۔ یہاں تہہ پٹیاں ڈرنا ہو رہی ہیں۔ کیا بچا کل کلاں کوئی ایسی تہہ ملی ہی آ جائے جس میں تمہارے لیے کوئی امید کی کوئی کن ہو۔"

باہر برقانی ہوا کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اندر آگ میں کھڑی حرارت میں چینی کے پیالوں میں قبوہ پینے کے ساتھ میں یہ تینوں افراد مسلسل بحث کرتے رہے۔ رات کے سناٹے میں دور کہیں برقانی ندی کے اندر برف کے تودے گرنے کی آوازیں ایک گونج پیدا کرتی رہیں۔ آوازوں سے چاہتا تھا کہ یہ ندی اس ناچ سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ تاہم راستہ بچ دار تھا۔ یہ وہی ندی تھی جس کا ذکر برق جان نے کیا تھا۔ اس ندی کے اوپر کلاں کا قد بتی چلا تھا۔ اور اس چل کے ساتھ ضوئیں مرسے سے اچھے واپس واپس ہوتے تھے۔ یہ عام سا تھا۔۔۔ پٹیاں سڑا بن گیا تھا۔ خاص طور سے اس کے آخری قدم، موت کے قدم سمجھے جاتے تھے۔ اور بنجاب کے ہر سے بھرے کھیتوں سے اٹھ کر اس پر فرسار میں باہر رستم کی دل دی میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس چل پر قدم رکھے گا جس طرح زری والا وہم رستم کے ہاتھوں پتھر پتھر دھوا تھا اور زری کے جھپٹنے چڑھنے کے باوجود بالآخر شوق کو شکست ہوئی تھی، اسی طرح یہ چل والا وہم بھی نکلے ہوئے تھا۔

اگلے روز نے مان رستم سے ملنے آیا۔ لڑائی سے پہلے رستم نے مان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ نے مان نے اس کا ہاتھ کو قبول کیا تھا اور بڑی حد تک دوستی کا حق بھی ادا کیا تھا۔ اس لڑائی کا ساتھ ستر فیصد فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا جب شوق نے اپنی جان باری تھی۔ اور شوق کو قتل کرنے کا رستم اور نے مان نے ہی انعام دیا تھا۔ نے مان کو اپنے پالتو جانور کی جاکٹ کا قمیض تھا اس قمیض پر رستم کی خوشی حادی تھی۔ رستم نے باتوں باتوں میں نے مان سے برقانی ندی کے چل اور پتھر پر کندہ کی ہوئی تحریر کا ذکر چھیڑ دیا۔ نے مان نے بھی اس حوالے سے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے رستم کو اس کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ روایات یہی تھیں کہ پتھر کی کندہ کی ہوئی تختی جس سردار کے پاس ہوگی وہ قبیلے کے رسم و رواج میں ضروری تہہ پٹیاں لائے گا۔ نے مان کی معلومات کے مطابق پچھلے ساتھ ستر برسوں میں کم از کم تین سرداروں نے اس پتھر پر کتبے کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جن افراد کو اس کوشش کا حصہ بنایا گیا ان میں سے دو جاک اور کئی ڈھ ہوئے۔

اس سلسلے میں انکشاف کرتے ہوئے نے مان نے ایک نئی بات بتائی۔ اس نے کہا۔ "دو سال پہلے شوق خان پر بھی یہ جنون سوار ہوا تھا۔ اس نے قبیلے میں سے دو افراد کو اس کام پر

متوقع بات ہوئی۔ رستم اور ناصر وغیرہ کی گھرانی پر مامور پیریار وہاں سے ہٹا لیے گئے۔ یہ ایک انجینی علامت تھی۔ رستم، ناصر اور شریف کو کسی حد تک آزادی کا احساس ہوا۔ شریف نے کہا۔ ”مجھ کو لگتا ہے جی کہ برق جان ہم کو رعایتیں دینا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں ہماری یہ ننھیں بیڑیاں بھی کھل جائیں۔“

”ننھیں۔ ان بیڑیوں کو تو بھول جاؤ۔ یہ تو شاید ہماری موت کے بعد ہی کھلیں گی۔“ ناصر نے مایوس انداز میں کہا۔

”خیر! اتنا بدلہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔“ رستم بولا۔ ”آہستہ آہستہ بہتری آ رہی ہے۔“

رستم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلی رات ایک بہتری آئی۔ یہ بہتری زری کی شکل میں تھی۔ رستم تو اسے بہتری نہیں سمجھ رہا تھا مگر ناصر کے چہرے پر ضرور روشنی آ گئی۔ رات پہلے پہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ رستم نے دروازہ کھولا تو سامنے برق جان کا قریبی ہزار محافظ کھڑا تھا۔ چادر میں لپیٹی ہوئی زری اس کے ساتھ تھی۔ محافظ نے انہیں بتایا کہ زری یہاں رہے گی۔ سنا روشنی ہونے سے پہلے وہ اسے واپس لے جائے گا۔ محافظ نے کہا۔ ”یہ جتنی دیر یہاں رہے، اسے پوری رازداری کے ساتھ رہنا چاہیے۔“

”ننھیں اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ سوال اسی سے پوچھو تو بہتر ہے۔“ پیریار واقعی خیر لکھ میں بولا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تم نے اسے اپنے ساتھ ملا کر بیکار کر دیا ہے۔“ پیریار نے کہا اور واپس چلا گیا۔

رستم نے دیکھا، زری کا چہرہ بخار سے جھٹکا ہوا تھا مگر شاید صرف بخاری نہیں تھا اندرونی بیکان بھی تھی۔ زری کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ رستم کے دیکھنے پر وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم آگ ہو رہا تھا۔ سر سے ہر ایک ایک لاشیں تھیں۔ رستم نے اسے ہر شکل چھپے بتایا۔ ”کیا کرتی ہو؟“ رستم نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا مارش ٹھیک ہونے والا ہے۔“

”تم جو بھی کہو۔ میں سنیں رہوں گا۔“ وہ روہنے والے لہجے میں بولی۔ اس کی سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

رستم نے اس سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ مناسب نہیں سمجھی۔ اسے بٹھایا، پانی وغیرہ چلایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برق جان نے زری کی حالت دیکھنے ہوئے اسے یہاں بھیج دیا ہے۔ برق جان کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ وہ بڑی چھاری کی بشارتوں اور ڈراؤں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ برق جان نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ زری گارٹی ہونے کے باوجود اب ایک عام لڑکی ہے۔ وہ ایک مرد سے اپنا پہلا جسمانی تعلق بنا چکی ہے۔ اور اب اس مرد کے لیے زری کی بے چینی ایک فطری عمل ہے۔

زری بڑی ہی سادگی میں رستم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر رستم نے محسوس کیا کہ اس کے گرم آنسو کپڑے میں سے گزر کر اس کی رانوں پر سرسرا رہے ہیں۔ رستم ہچکچانے والے انداز میں اس کے منڈے سے سر پر ہاتھ بچھرنے لگا۔ وہ اٹھ کر رستم سے لپٹ گئی اور جب گرم جوشی سے اس کے سر، رخسار اور پیشانی پر بوسے دینے لگی۔ وہ رستم کے قرب کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ یہ بارش جنگوں میں پھٹنے والی اس شوریہ و سر ہوا کا سا انداز تھا۔ جو تانور و رختوں کو بھی جڑوں کی گھبراہٹیں تک لرزہ بر اندام کر دیتی ہے۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد چانک کچھ یوں ہوا کہ زری کی گرم جوشی کم ہو گئی۔ رستم دوار سے ٹپک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ وہ جیسے کوئی چیز Miss کر رہی تھی۔ جسم کی خوشبو بس پا کچھ اور۔ اس کی سادہ کچھ میں جیسے خود بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کی محسوس ہو رہی ہے۔

اس کی یہ کیفیت رستم کے لیے تسلی کا باعث تھی۔ وہ رستم کے کندھے سے سر نکالنے نیم ہزار رہی اور اس کے سینے کے بالوں پر اپنی خوبصورت انگلیاں چلاتی رہی۔ انگلیاں چلاتے چلاتے اس نے رستم کے سینے پر کندھے سے اسے اس حرف کو بکھجوا جو رستم کی زندگی کا حاصل تھا۔ ”بی بی“ کے لفظ سے تعلق رکھنے والا حرف ”B“۔

”یہ کیا ہوتا؟“ زری نے نیم غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس نشان ہے۔“ رستم نے خشک لہجے میں کہا اور زری کا ہاتھ اس حرف پر سے ہٹا دیا۔

اسے یہ بھی اچھا نہیں لگا تھا کہ زری اس حرف کو بکھجوتی۔ اسے یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ زری اس جسم اور اس روح کو بکھجوتے جس کا نام صرف اور صرف بی بی سے تھا۔ اس پر بی بی کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ اور یہ رنگ انہیں اسی تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور رنگ اپنا اثر دکھاتا۔ یہ بڑا گہرا رنگ تھا۔ اس میں ایک نشہ تھا، ایک رستہ مستی۔ ایک جادوئی کیفیت تھی۔ یہ

مٹق کارگ تھا۔ اور یہ ایسا مٹق تھا جس کو حسوں کے ملاپ نے اور بھی لافانی اور لازوال کر دیا تھا۔ زری نے سینے پر کندہ حرف پر انگلی رکھ کر پوچھا تھا، یہ کیا ہے؟ اگر رستم اسے بتا سکتا تو بتاتا۔۔۔۔۔۔ یہ زندگی ہے، یہ سانس کی ڈور ہے اور ملن کی آس ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو بھرے میں اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور نیلے آسمان کے نیچے ایک لمبی آڑان کے سینے دیتا ہے۔ تاکہ اپنے پھڑے ساقی سے مل سکے۔ یہ وہ حوصلہ ہے جو تک و تاب کی زندانوں کے اندر قیدیوں کو زندہ رکھتا ہے اور ان کے سینوں میں سالہا سال تک اس کو روشن رکھتا ہے کہ ایک دن وہ پھر سے اپنے پیاروں کو مل سکیں گے۔

”مجھ کو لگتا۔۔۔ تم کیا دل؟“ زری رستم کے کان میں منمناتی۔

”میں تو نہیں بدلا، شاید مجھ اور بدل گیا ہو۔ تم کو کیا لگتا ہے؟“

وہ لاشیں کی روشنی میں بڑے وہمان سے رستم کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر الجھن سی الجھن تھی۔ ”میری مجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ زری نے کہا۔ اس نے اپنا سر وہ بار و رستم کے سینے پر ڈالا اور کسی جنگی لمبی کی طرح اس کو سوجھنے کی کوشش کی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کسی معصوم بچی کی طرح اطمینان کی نیند سو رہی تھی۔ اس کے سینے ہوئے جسم کی تشبیہ بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ سو رہی تھی پھر بھی اس کے چہرے پر بامی اور الجھن دکھائی دیتی تھی۔ رستم نے آہستگی سے خود کو اس سے جدا کیا۔ نامرادر شریف ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ نامری ساری توجہ اس کمرے کی طرف ہوگی۔ وہ یہ بھی کہ زری یہاں موجود زری اور زری ایک ہی رات میں۔۔۔۔۔۔ بلکہ رات کے مختصر سے حصے میں نامرے بہت قریب آچکی تھی۔ زری کے لیے بے پناہ لگاؤ کے جذبات، رستم نے نامری آنکھوں میں اس رات کی سب کو یاد دیکھ لیتے تھے۔

رستم کمرے سے باہر آیا تو نامرہ آدھ ماگہ پر ہل رہا تھا۔ ”آپ باہر کیوں آ گئے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ سو گئی ہے۔“

”اس کا بخار کچھ کم ہوا؟“ نامرے نے پوچھا۔

”جو بخار جہاڑی وہ ہے چڑھا ہے، وہ تہارے ابھر کیسے اتر سکا ہے۔“ رستم زیر لب مسکرایا۔ پھر فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”جو بخا بڑی بخار تھا، وہ تو کم گرم رہا ہے۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ نامرے نے اپنی آنکھیں کرتے ہوئے کہا۔

”یہی تو چاہی گئی۔ تمہیں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ اجازت تو ہمیں ملنی چاہیے۔“

نامرہ اندر گیا اور زری کو دیکھ کر آیا۔ رستم نے کہا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے، بہتر ہے کہ تم آپ اس کے پاس ہی رہو۔ اگر میرے بارے میں پوچھو تو اسے بتاؤ کہ میں اس گھر سے باہر ہوں۔“

نامرہ جیسے خود بھی یہی جانتا تھا۔ رستم دوسرے کمرے میں آ گیا اور کچھ ہی دیر میں سو گیا۔ اس کی آنکھ رات کے تیسرے پہر کھلی۔ ساتھ والے کمرے میں شور مچ رہا تھا۔ زری کچکیوں سے رو رہی تھی اور نامرے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم جھوٹ بولو۔ رستم ادھر ہی۔۔۔ میں اس کے پاس جاؤں گا۔“ وہ ایک خندی بچی لگ رہی تھی۔

نامرے نے کہا۔ ”دیکھو۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔ اس کو جانا پڑا ہے۔ اس کی ٹانگ میں بہت تکلیف تھی۔ تمہیں بتا ہے ناں اس کی ٹانگ میں کچھ بھی درد ہوتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک۔۔۔ وہ ابھی یہاں تھا۔“

رستم نے باہر جا کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر لاشیں کی روشنی تھی۔ بستر کا بھاری بھر کم لف فرش پر پڑا تھا۔ زری درد ر کے حال ہو رہی تھی۔ ایک بار بھراس کا چہرہ انکارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ نامرے اسے دونوں کندھوں سے تھا تا ہوا تھا اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ وہ کہہ رہا تھا، بالکل درست تھا۔

زری واہلا کرتی رہی۔ رستم کو اس پر ترس آ رہا تھا مگر وہ خود پر مضبوط کیسے دوسرے کمرے میں چڑھا۔ اسے پھر نیند آ گئی۔ قریب دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر زری سو رہی تھی اور نامرے ایک چار دیواری کی طرح اس کے پاس بیٹھا تھا۔

نامرے کے کردار کے قریب نامرے رستم کے سامنے آیا تھا اور یہ بہت مثبت رخ تھا۔ کہنے کو نامر بھی ایک مفرد ڈاکو تھا۔ اس کے ہاتھوں کی افراد مل ہو چکے تھے جن میں یقیناً پولیس والے بھی شامل تھے۔ ایسے لوگوں کی حسیات عموماً ختم ہو جاتی ہیں اور مثبت جذبات دم توڑ جاتے ہیں لیکن یہاں زری کے معاملے میں نامرے کا رویہ ایک ڈاکو کا نہیں تھا بلکہ نازک خیالات رکھنے والے ایک درد مند شخص کا سا تھا۔ شاید یہ اسی ڈاکو کا رویہ تھا جو چند برس پہلے ایک ٹریفک آفیسر کی بہت دھری کے سبب اپنی روشن منزل سے دور ہو کر اندامیر میں جھپٹ گیا تھا۔ چند روز پہلے ایک اتفاق کے تحت انھیں ایک نامری نامری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا تو اس اتفاق کو توڑی دیکر نشاط آور مکمل کچھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کیا کی ہو سکتی تھی۔ زری کچھ زیادہ خوب صورت نہیں تھی، نہ ہی مہذب تھی۔ اس کے باوجود

ناصر کی کشادہ چشمانی پر سوچ کی کبیریں تھیں۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پلیس ٹھیک ہے۔ مگر ابھی ایک دور درخت پر جائیں۔"

رستم نیم رضامندی کے انداز میں خاموش رہا۔

بستی کے حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ شتم خان کے چند کلز حاجی افراد کو برق جان نے بندی خانے میں ڈال دیا تھا۔ ان میں شتم کا بڑا بیٹا اور اقا خان بھی تھا۔ دو تین افراد کو بھرتوں اور بچوں پر ظلم کے جرم میں گولی سے آڑا دیا گیا تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسا یار بدستور برق جان سے ناراض ہیں..... خاص طور سے بڑی عجاری۔ اس کے ظلم کے مطابق زری کو رستم نے زبانی کا نشانہ بنایا تھا اور وہ ابھی تک سزا سے بچا ہوا تھا۔ بڑی عجاری کے علاوہ تین جن دیگر پہریادوں کو اس رات کی واردات کا ظلم تھا، ان میں سے دو کو برق جان نے اپنی حفاظتی حراست میں لے لیا تھا صرف تیسرا پہریادریان بخت ضروری امور انجام دے رہا تھا۔ لپٹ اور بھری تختی والا معاملہ ہونیکا ہوا تھا۔

دوراتوں کے وقفے سے زری بھر رستم کے پاس پہنچی۔ درحقیقت وہ ناصر کے پاس ہی پہنچتی تھی۔ رستم نے کہا۔

"ناصر! اب مزید دیر نہ کرو۔ اسے تادو۔"

"کیا وہ اس کو راز رکھ سکے گی؟"

"ضرور رکھ سکے گی۔ اس کے اندر مطلب ہے۔ یہ طلب اسے راست دکھائے گی۔"

"کیا ہم اس اور برق جان کو بھی بتا دیں؟"

"نہیں۔ وقت آنے پر اس کو بتا دیں مگر برق جان کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں خطرہ ہے۔"

کچھ دیر بعد ناصر کمرے میں زری کے پاس چلا گیا۔ غالباً اب وہ اس تازہ کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ کام جلد مٹانے کا خواہش مند تھا۔ وہ جانتے ہی زری کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ آج منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی۔ اس کی مصنویٰ ہنسی مٹ چکی تھی۔ اس نے آئینہ دیکھا اور بھوؤں کے بارے میں بات کی۔

ناصر نے کہا۔ "اس کا کیا ہے۔ بھر رہا ہے۔"

اس نے کامل کی ڈلی کی۔ زری مسکراتی ہوئی چٹ لپٹ گئی۔ ناصر اس پر جھک گیا اور اسے پیار سے اس کی ہنسیوں سے کہتا تھا۔ ناصر کی قربت سے اس کے چہرے پر ہلکی سی جھمبٹ

آگئی تھی۔ اس کی ہنسیوں سے کہتا تھا۔ ناصر نے اپنی چھٹکی سے اس کی آنکھوں میں کامل ڈالا۔ زری نے اٹھ کر چھوٹا سا آئینہ دیکھا اور ایک دم خوش نظر آنے لگی۔ وہ ناصر کے کندھے سے سر ہٹا کر بیٹھ گئی۔ اس کے اوئی لہو کے کاگر بیان اس کے بالائی جسم کو نمایاں رکھتا تھا لیکن وہ اس صورت حال سے مسکرا غافل رہتی تھی۔ ناصر فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اس لیے دروازے پر کھڑے رستم کو گنگٹو سمجھا آتا بند ہو گئی۔ ناصر نے زری کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے اور اس سے سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ حموی دیر بعد یکایک زری کے چہرے پر شدید جھرت اور بے یقینی کے تاثرات اجڑے۔ ناصر اس سے کچھ گنگٹو رہا۔ زری کے شفاف چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ آخری رنگ شرم کا تھا۔ وہ تڑپ کر ناصر سے ٹکڑھ ہوئی اور ایک دم لاف لاف اپنے اوپر کھینچ کر لیٹ گئی۔ رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر سے کچھ یوں بھی رہی ہے۔ ناصر کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ جب اس نے لاف لاف زری کی شکل دیکھنا چاہی۔ اس نے لاف لاف کو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا اور گزر چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ ناصر نے کافی کوشش کر کے لاف لاف اس کے اوپر سے اتارا۔ زری کا چہرہ کھنار ہو رہا تھا۔ وہ ایک دم ناصر سے لپٹ گئی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے سے سینے میں چھپا لیا۔ رستم نے اب مزید تاک بھجا تک مناسب نہیں سمجھی اور واپس آکر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔

صبح جب رستم اٹھا تو زری حسب معمول محافظہ ریان بخت کے ساتھ برق جان کی رہائش گاہ پر واپس جا چکی تھی۔ وہ رہائش گاہ کے عقبی دروازے سے آئی تھی اور یہ قافلہ میں کچھ قدم سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ناصر والے کمرے میں پہنچا۔ وہ ابھی اچھی جاگ تھا اور چھری دیوار سے ٹیک لگے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا خراہ اور آنکھوں میں ایک خوبصورت سرشاری تھی۔ اس کے ہنجرے ہنجرے بال اور اس کا ٹھٹھن ٹھٹھن بستر بتا رہا تھا کہ گزرنے والی شب محبت اور تربت سے آراستہ رہی ہے۔

رستم نے کہا۔ "ناصر! ابے شک تم مجھے خود سے بڑا سمجھتے ہو مگر ہم بے تکلف دوست ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ زری کے بارے میں تمہاری سوچ کیا ہے؟"

"ایک دم عجیب لڑکی ہے رستم بھائی۔ بہت بھولی اور بہت پیار کرنے والی۔ ہماری وجہ سے خدا نے انہی سے زندگی دی ہے۔ اب اس زندگی کو رش بھی ہم نے ہی دینا ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

”اگر میرے دل کی پوجتے ہیں تو میں اس سے شادی کرنا چاہوں گا۔ میری خواہش ہو گی کہ میں اس کے ساتھ گھر بساؤں۔ یہ اور بات ہے کہ گھر بسنا ہماری قسمت میں نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں۔ اس ٹاپو پر کون سا ذہنی ریاضتیں نہیں کرنے آئے گا۔ شادی رچاؤ اور سکون سے دو چار بنے پیدا کرو۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ٹاپو پر رہتے ہوئے مجھے زری سے شادی کرنے کون دے گا؟ یہاں کے قانون قاعدے کے مطابق تو وہ شخص لڑکی ہے جسے آپ کو دیتا ہے میں وقت پر سمیٹ کے لیے مقرر ہوا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس مسئلے کا کوئی حل ہو۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً خفیہ شادی۔ اس کو ساری حقیقت حال بتا دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی راستہ نکال لے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ لوگ اس بندے کو محفوظ بنا اور کیا چاہا جاتا ہے جس نے زری سے بدسلوکی کی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ زری سے یہ ملاقاتیں بھی کوئی بڑا نقصان نہ کر دیں۔“

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ رستم اپنی بیٹی کو گھسیٹتا ہوا دروازے تک گیا۔ باہر برق جان پہ نقس نقس موجود تھا۔ اس نے رستم کے ساتھ رکی کھات کا تبادلہ کیا۔ آج مترجم و اس بھی برق جان کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ برق جان سمجھ گیا تھا کہ زری کی کوشش کر کے رستم سے براہ راست بھی بات کی جاسکتی ہے۔ رستم اور برق جان اندر آ گئے۔ یہاں ناصر اور شریف سے بھی رکی کھات کا تبادلہ۔ برق جان گئے چار مسلح محافظ گھر سے باہر ہی کھڑے رہ گئے۔

رستم اور برق جان کے درمیان تباہی میں بات چیت ہوئی۔ برق جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہارا وقت اچھا گزر رہا ہے۔“ برق جان کا اشارہ یقیناً زری کی طرف ہی تھا۔ وہ مومنات کے وقت زری کو رستم کی طرف بھیج دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ رستم زری سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

رستم نے انہماک میں سر ہلایا۔ ”تمہاری مہربانی ہے۔“

”میں نے سپر ہیراؤں کو بھی یہاں سے ہٹا دیا ہے اور کچھ پچھوتو میرا دل چاہتا ہے کہ یہ بیڑیاں بھی تم تینوں کے پاؤں سے نکل جائیں اور تم تینوں خود کو ہر طرح سے آزاد محسوس کرو۔“

”اگر تم ہم پر اتنا اعتماد کر سکتو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“

”لیکن ابھی اس میں وقت لگے گا۔“ برق جان جلدی سے بولا۔ ”مجھے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی مطمئن کرنا ہے۔ ہمیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔ ہر قدم پر احتیاط اور سوچ بوجھ کی ضرورت ہے۔ میری رائے ہے کہ اب تم کچھ دنوں کے لیے زری سے بھی دور رہو۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا وقت گزار لیا ہے۔ دو بھی اب اطمینان میں نظر آتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جیسے تمہاری مرضی۔“

”اگر ضرورت ہے تو میں تمہارے اور دوستوں کے لیے کچھ اور انتظام کر دیتا ہوں۔ یہاں کے قانون کے مطابق خاص حالات میں اس قسم کی گمنامی موجود ہے۔“

”نہیں، ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہوئی تو کہہ دوں گا۔“

”اور ہاں۔۔۔ میں نے اس کو ابھی کچھ نہیں بتایا۔ اسے نہیں بتا کر زری یہاں تمہارے پاس رات گزارنے کے لیے آتی رہی ہے۔ میرے اور محافظ رہاؤں کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی اس مسئلے میں احتیاط رکھوں گا۔“ رستم نے نوٹے نوٹے پھونکے لفظوں میں اپنی بات برق جان تک پہنچائی۔

برق جان نے اپنے اگوتے ہاتھ سے اپنے بالوں میں اگلیاں چلائیں اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”پھر جو کام میں تم سے کہا تھا اس کے بارے میں سوچا ہے تم نے؟“

”جو گزارش ہم نے کی تھی، اس کے بارے میں کیا سوچا گیا ہے؟“

برق جان نے کہا۔ ”رستم! میں نے جیسے اپنی مجبوری بتائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تم سے کوئی ایسا وعدہ کروں جسے بعد میں پورا نہ کر سکوں۔ بے شک اگر تم نے یہ کام کرنے کی ہامی بھری تو تم آج تک بہت بڑا کام کرو گے۔ اس کام کا صلہ یہ نہیں ہے کہ تم سے دھوکا کیا جائے۔ جیسے مایوسی دی جائے۔ اس کا صلہ یہ ہے کہ جیسے تمہاری توقع سے بڑھ کر خوش کیا جائے۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جیسے خوش کروں گا بھی۔ لوگ یہاں تمہاری زندگی پر رشک کریں گے۔“

”لیکن میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے یہ زندگی نہیں ہوگی۔ نہ بدترین قید ہوگی۔ تم دنیا کی ہر شے بھی یہاں ہمارے سامنے ڈھیر کر دو، ہمیں اپنے گھر یاد آئیں گے، اپنے پیار سے یاد آئیں گے۔“

”تم آنے والے وقت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے ہو رستم۔ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جنہیں اپنے گھر بار سے زیادہ پیار یہاں ملا ہے۔ وہ فنی خوشی یہاں رو رہے ہیں اور وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے رستم۔“

رستم اور برق جان کے درمیان تادیر بات چیت ہوئی مگر کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ نہ جانے کیوں برق جان کو یقین تھا کہ اگر رستم نے ملے سے گزرنے کی ہائی بھری تو وہ اس کا کام با آسانی کر لے گا۔ اس کام کے بدلے وہ بہت سی رعایتیں دینے کو تیار تھا لیکن آزادی والی بات بقول اس کے اس کے بس میں نہیں تھی۔

جو کچھ بھی تھا۔ مگر رستم کو اس کی ساف کوئی ہینڈ آرہی تھی۔

رستم نے ایک بار پھر برق جان سے وہی بات پوچھی جو اس سے پہلے پوچھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”برق جان! تم بار بار مجھ سے یہی بات کہہ رہے ہو کہ چل کے ذریعے کتنے تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور میں با آسانی یہ کر لوں گا۔ اگر یہ اتنا آسان ہے تو پھر اب تک ہوا کیوں نہیں اس کام کے آسان ہونے کا سب سے زیادہ یقین تو تم کو ہی ہے۔ تمہارے بقول تم سنگڑوں یا بارس یا ہلکے کا معائنہ کر چکے ہو۔ تم نے آنکھوں آنکھوں میں اس کی ایک ایک اچنی تابی ہوئی ہے پھر تم۔ خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے۔ یا تمہارا کوئی قریبی محافظ جو تمہارے اشارے پر جان بوجھ کر نہ لے کر آتا ہو۔“

برق جان کا رنگ پیکا پیکا ہو گیا۔ وہ چند لمحوں خاموش رہ کر بولا۔ ”تم نے یہ سوال دوسری بار مجھ سے پوچھا ہے۔ اور دوسری بار بھی میرا جواب وہی ہے۔ میں اپنی کمزوری کو ماننا ہوں۔ سب کچھ جانتے ہو مجھے، سب کچھ سمجھتے ہو مجھے معلوم ہے کہ میں یہ ملے پار نہیں کر سکوں گا بلکہ ہم میں سے کوئی نہیں کر سکے گا۔ ہمارے اندر گہرائی میں ایک وہم موجود ہے۔ کسی میں کم سے کسی میں زیادہ۔ لیکن اس وہم کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ تم باہر کے آدمی ہو، دلیر ہو، مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ میں نے تمہارے اندر ایک خاص عزم دیکھا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ ہم جو اب تک نہیں ہو سکی تم کو کہلو گے۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو پھر ان ہت و ہر مجاہدوں کے منہ بند ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہم یہاں اپنی مرضی سے تہہ پٹیاں لا لیں گے۔ یہ بڑی شاعرانہ تہہ پٹیاں ہوں گی۔ اس کی ایک

چھوٹی سے مثال میں چھپیں دیتا ہوں۔ موجودہ رسم و رواج کے مطابق اس کی جتنی زری ایک دھکاری چوڑا کر دی ہوئی لڑکی ہے۔ وہ یہاں زندہ رہے گی مگر سبک سبک بدترین زندگی گزارے گی۔ اگر ہم تہہ پٹیاں لانے میں کامیاب ہو گئے تو اسے اور اس جیسی دودھ بھر عورتوں کو عام عورتیں قرار دے سکیں گے۔ زری عام زندگی گزار سکے گی۔ شادی کر سکے گی، گھر بنا سکے گی۔ ایسے بہت سے کام ہو سکیں گے جو ہمیں نہیں ہو سکتے۔ میں سمجھتا ہوں ایک انقلاب آ جائے گا۔“

”میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“ رستم نے کہا۔

”چلو۔ آج کا دن مزید لے لو لیکن اب زیادہ دیر نہیں ہوئی چاہیے۔ ہم جتنی جلدی یہ قدم اٹھائیں گے اتنا ہی بہتر ہے۔“

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ رات کا کچھلا پہر تھا۔ برف اور مدد بھگ و تک ایک نیگاؤں تار کی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں کے باشندے اپنے چھوٹے چھوٹے گھر وندوں میں اور قدرتی گھبراہٹوں میں بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ جاگ رہے تھے اور ایک چھوٹے سے سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہ سفر ناچ سے نکل کر برفانی ندی تک جانے کا سفر تھا۔ برق جان اور واس کے علاوہ قریباً دس مسلح محافظ بھی رستم کے ساتھ جا رہے تھے۔ رستم کے اصرار پر برق جان، ناصر کو بھی ساتھ لینے پر رضامند ہو گیا تھا۔ تاہم یہ ملے ہوا تھا کہ اس سارے سفر کے دوران میں رستم اور ناصر کے ساتھ ان کی پشت پر بندے رہیں گے۔ رستم کے ساتھ بھی اس نازک وقت پر کھولے جانے تھے جب اس نے ملے پر قدم رکھنا تھا۔ شریف بدستور ایک برفانی کی طرح ہستی میں ہی موجود تھا۔ اگر سابقہ تجربے کو دیکھا جاتا تو رستم اور ناصر اپنے ساتھی کو یہاں چھوڑ کر فرار ہوجانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود برق جان چھوٹے سے چھوٹا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

چودہ افراد کا یہ قافلہ رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی کے ساتھ ہستی سے روانہ ہوا۔ جب سے رستم اور واس کے ساتھی یہاں آئے تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس ٹاپو سے باہر جا رہے تھے۔ رستم اپنے ہنس میں عجیب سی سستی محسوس کر رہا تھا۔ وہ مغرب میں اس راستے سے گزرنے والا تھا جو اس گلشیر ٹراپا پر رہنے والے لوگوں کو یہاں سے باہر نکالتا تھا۔ رستم جاننا تھا کہ اس مرتبہ بھی وہ یہ راستہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کی۔ اور ناصر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ ان کی آمد کے موقع پر بھی یہی کچھ کیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ اس راستے سے گزرتے ہوئے اسے محسوس تو کر سکتے تھے۔ اپنے ذہنوں میں اس کے

خدا نال کا نقشہ تو بنا سکتے تھے۔

سنباتی ہوئی سردی میں انہوں نے قریب آدھ گھنٹے تک گھوڑوں پر سفر کیا۔ کے کوئی فلک ہنس چوٹی اور لمبہ پہاڑ ان کی دائیں جانب شمال مشرق کی طرف دکھائی دیتے تھے۔ ناصر کا خیال تھا کہ وہ جین کے سرحدی علاقے سے قریب ہیں۔ ایک جگہ گھوڑے روک دیئے گئے۔

”کیا بات ہے؟“ رستم نے برق جان سے پوچھا۔

”ایک ناخوشگوار کام کرنا ہے۔ تمہاری آنکھوں پر پٹیاں باندھنی ہیں۔“

”کیا یہ آخری ناخوشگوار کام ہے؟“ رستم نے طنز سے لہجہ میں کہا۔

برق جان سے کوئی جواب نہ پڑا۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ قریب آدھ گھنٹہ مزید چلنے کے بعد وہ سب گھوڑوں سے اتر گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی۔ ایسی ہی ہوا انہوں نے جب محسوس کی تھی جب وہ فرار ہونے کی کوشش میں ٹاپے کے کنارے پر پہنچے تھے۔ یہاں سے ان کا پیدل سفر شروع ہوا۔ کچھ دیر بعد رستم کو احساس ہوا کہ وہ ایک تنگ پر پٹی کھود میں ہیں۔ اس کھود میں کم از کم تین گھنٹہ پہلے دروازے تھے جہاں چڑی کے تیل کی مشعلیں جل رہی تھیں اور پکوس پھیرا رہا موجود تھے۔ تیزوں بار قفل کھلنے اور پھاری بھر کم ”ارل“ کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ اس سرنگ کی اونچائی کی جگہوں پر بہت کم تھی اور یقیناً یہاں گھوڑوں پر سوار ہو کر نہیں گزرا جاسکتا تھا۔ قریب آدھ گھنٹہ تک ٹیم گرم و طولوں اس سرنگ میں چلنے کے بعد وہ ایک بار پھر کھلی جگہ آ گئے۔ سردی اور ہوا کی کات سے پناہ ہو گئی۔ اب سبز جیوں کا طویل چکر دار سلسلہ شروع ہوا۔ یہ چکر کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی نامور سبز حیاں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک طرف گہرا ٹھنڈ ہے۔ ایک ایک پہرہ ارنے رستم اور ناصر کا بازو تمام رکھا تھا اور انہیں بڑی احتیاط سے اتار رہے تھے۔

”گلتا ہے کہ یہ سبز حیاں بھی ختم نہیں ہوں گی۔“ ناصر نے رستم کے پہلو میں چلنے چلنے سرگوشی کی۔

”جو چیز شروع ہوتی ہے، وہ کبھی ختم بھی ہوتی ہے۔“ رستم نے کہا۔

”مجھے تو گلتا ہے کہ ہم باپت اتر چکے ہیں اور اب زبردین جا رہے ہیں۔“

”زبردین ایسی فضا اور ہوا تو نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب!“ رستم نے کہا۔

”مجھے تو گلتا ہے یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ہم کبھی افنا نوئی دیا نہیں آ گئے ہیں۔ سالانہ بڑھ سال پہلے جب آپ لاہور میں گھوم رہے تھے کبھی چوک میں سرخ پتے کھا رہے

تھے اور راوی میں پر گاڑی دوڑا رہے تھے تو آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ جین کی ویران سرحد نے کسی کس ایسے برف زار میں آ پھنس گئے۔ اس برف زار میں درخت کچھ جا جاتا ہوگا، لڑکیاں، مرغ کی چاتی ہوں گی۔ اور اکھاڑوں کے اندر جنگلی جانوروں سے حضرت انسان کی پیچھا آڑا بنائیاں ہوتی ہوں گی۔“

”یہ بات تو ہے۔“ رستم نے ہلکا سا ہنسا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ناصر نے کہا۔ ”رستم بھائی ا قیدی کی حیثیت سے ہی کسی مگر ہم ایک بار اس جاپ سے نکل تو آئے ہیں۔ کیا کوئی کرشمہ نہیں ہو سکتا؟ کوئی ایسا طریقہ کہ کم ان لوگوں پر قابو پائیں۔“ اور پھر۔۔۔

”پھر شریف کو بھی اور۔۔۔ تمہاری زری کو بھی ہستی سے نکال لیں۔“ رستم نے ناصر کا فخر و کمال کیا۔

”پاکل۔۔۔ یہی کہنا چاہتا ہوں۔ پاؤندہ قبیلے کا اہم ترین فرد یعنی برق جان ہمارے ساتھ ہے۔ اگر ہم کسی طرح پائسا پلٹ سکیں اور برق جان کو گمن چا پناٹ پر لے لیں تو اس سے ان دو افراد کی رہائی متوانی جاسکتی ہے۔“

”برق جان کبھی گولیاں نہیں کھینچا ہوا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے کڑے پیرے کے باوجود ہمارے ہاتھ پست پر پناہ دے رہے ہیں۔“

رستم اور ناصر دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے اور کبھی ختم نہ ہونے والی سبز جیوں پر بولے ہوئے چلے رہے۔ مسلسل نیچے اترنے کے سبب ان کے جسموں کا تمام تر وزن پاؤں اور پنڈلیوں پر آ رہا تھا۔ ان کے پاؤں چھوڑنا گئے تھے۔ تیرہ چودہ افراد پر مشتمل اس قافلے نے ایک دو جگہ رک کر سانس بھی لیا، قبوہ پیا، پتھر کی خمیری روٹی کھائی اور پھر چل پڑے۔

شیطان کی آنت جیسا یہ سفر سورج طلوع ہونے سے پہلے ختم نہیں ہوا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ہموار برف پر پہنچے ہیں۔ دو تین گھنٹہ بعد رستم نے چلنے کے بعد انہیں ایک جگہ گھوڑوں کی جڑبناہت سنائی دی۔ یہاں ان کی آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ ہانسون کے اوپر گھاس چھوٹے گھیرے ہوئے تھے۔ ان چھوڑوں کے نیچے چٹانیاں چھبی ہوئی تھیں۔ یہاں دو تین درجن تازہ دم گھوڑے اور غیرہ وغیرہ موجود تھے۔ آگ روشن تھی اور ایک بڑے سے مقامی طرز کے برتن میں چائے بن رہی تھی۔ یہاں انہوں نے گائے اور پاک کے اقساط سے پیا ہونے والا ”زود“ نامی جانور بھی دیکھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ ندی کے کنارے پہنچے۔ یہ بڑا جادوئی سا منظر تھا۔ چاروں طرف سفید برف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بریلی چوٹیوں پر غرور حسیناؤں کی طرح خٹپٹے سے کھڑی تھیں۔ ان کے پیرا بن اور پیکر بے داغ تھے۔ ان کے درمیان سے بہر کر آنے والا برفاب دھیرے دھیرے آتی گزر رہا کہ ٹھکیں افسیاد کر گیا تھا۔ جوں جوں یہ برفاب نیچے آتا تھا، اس کا پاٹ چوڑا ہو جاتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے برف کے تودے اس کے بلند کناروں سے علیحدہ ہوتے اور پُر شور و آواز سے پانی میں گر جاتے تھے۔ یہ اتنا سرد پانی تھا کہ اس میں گر کر آٹا چنہ سینڈل میں ہی دامی اہل کو ایک کھسکا تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی جھلس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لگتا تھا جب سے دنیا بنی ہے اس قطعہ زمین پر کسی نے قدم ہی نہیں رکھا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ اس سکوت میں بس اس برفیلے پانی کی آہستہ جھکی جوصد یوں سے یہاں بہہ رہا تھا۔

برق جان نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہ جگہ ہے اور وہ سامنے بریلی چٹان ہے۔ اس چٹان کو ہم مقامی زبان میں ”ہورائے“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ”امانت کا پتھر“ ہے۔ یعنی وہ چٹان جس سے وہ سو سال سے کبجے کی امانت کو سنبھال رکھا ہے۔“

”وہ دائیں کنارے پر برجیاں کیسی ہیں؟“

برق جان چند سیکنڈ تک تدبیر میں رہا۔ پھر بولے بولا۔ ”یہ دو لوگ ہیں جو اپنے بے خانہ کی وجہ سے پہلے پاندرہ کر سکتے اور عادی کا ٹکڑا ہو گئے۔ یہ ان کی قبریں ہیں۔“

”کافی تعداد میں ہیں۔“ رستم کا لہجہ چہنٹا ہوا تھا۔

فضا میں ایک تناؤ تھا۔ یہاں ہم کا تناؤ تھا جو رستم کو روک رہا تھا۔ رستم، برق جان سے غریب لہجے میں بات تو کر رہا تھا مگر کچھ بھی تھا، اس ہمہ کی دے داری اس نے خود قبول کی تھی۔ برق جان نے اس پر کچھ بھی زبردستی نہیں ٹھوسنا تھا۔

برق جان کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر یہاں آرام کیا جائے اور کھینچی قوس کی ایک پٹائی اور لپی جائے۔ مگر رستم از خود ہی پل کی طرف چل پڑا۔ مجبوراً پانی لوگ بھی حرکت میں آ گئے۔ وہ قریباً سو قدم ڈھولان پر چڑھنے کے بعد پل کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں ہوا تیز تھی اور کانوں میں میٹھا سی بکھی تھیں۔ کوئی ندی کے دونوں کنارے پانی سے قریباً پچاس فٹ بلند تھے۔ دیو قامت درخت کا طویل پل دو سو فٹ سے کم لمبا نہیں تھا۔ استبداد

بعد نگاہ تک برف کی سفید چادور پر وہ پہلی دھوپ پھیلی نظر آئی۔ یہاں سے عظیم الشان شاہ گوری (کے نو) کا نظارہ زیادہ صاف شفاف اور اثر انگیز تھا۔ شاہ گوری کی جیت تاج چوٹی نیگلوں فلک کو بوسہ دیتی محسوس ہوتی تھی۔ ”اپنے پیچھے دیکھو ناصر۔“ رستم نے کہا۔

ناصر نے دیکھا اور دم بخود ہو گیا۔ وہ جس عجیب وضع کی چٹانی سطح سے اترے تھے، وہ ایک بہت بڑے کعبہ پیمانی طرح ان کے عقب میں دکھائی دے رہی تھی۔

”کتنا عجیب نظارہ ہے۔“ ناصر نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ یہاں دو زمین و نکلوں میں بنی ہوئی ہے اور ہم نیچے والے نکلوں سے پر آ گئے ہیں۔“

”وہ برفانی نالہ بھی شاید زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے پانی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔“ رستم نے دور مشرق کی سمت اٹھی سے اشارہ کیا۔

وہ پیردار بنیالیوں میں بھاپ اُڑاتی چائے لے آئے اور حسب سابق انہیں اپنے ہاتھوں سے پانی شروع کر دی۔ ساتھ میں مقامی طرز پر بنائی گئی مضافی اور بادام کشمش وغیرہ بھی تھی۔ برق جان بھی اپنی بنیالی لے کر رستم کے پاس آن بیٹھا۔

”ہم ایک گھنٹے میں پل تک پہنچ جائیں گے۔ تمہیں سمجھنا ہے تو محسوس نہیں ہو رہی؟“

”نہیں۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔“ رستم نے شگ گلیجے میں کہا۔

برق جان نے خاموشی سے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے یقین ہے رستم۔“

مجھے یقین ہے کہ ہم دو پہر کا کھانا پھر اسی جگہ کھائے گئے۔“

”تم سرداری رہو تو بہتر ہے۔ ایسی باتیں تو بوجی کر رہے ہیں۔“

”پتا نہیں کیوں، میں تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو خود کو نجومی ہی محسوس کرنے لگتا ہوں۔“

وہ رستم سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے رستم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور برق جان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ جو بھی ہوتا ہے، اب جلدی سے ہو جائے۔ اگر میں گر گیا تو میری لاش واہش و صومٹنے میں بھی تو کچھ وقت لگنا ہے۔“

برق جان کھیانا سا ہو کر رہ گیا۔ لہجے باتوں والے صحت مند گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔

زمانہ کے سب سے ایک دو جگہ سے غم کھا گیا تھا۔ ملی کی چوڑائی اور اس کا توازن دیکھ کر رستم برق جان کی بات درست لگنے لگی۔ یہ مقتول چوڑائی تھی۔ اس پر پٹنے والا اگر اپنے حواس بحال رکھتا اور نیچے پانی کی طرف تاک جھانک نہ کرتا تو بظاہر اس کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آتی چاہیے تھی۔

رستم کے لیے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ برق جان اس کے کندھے سے کندھا مارا۔ کھڑا تھا۔ اس کی خالی آستین ہوا میں پڑ پڑا رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں اس تاریخی پانی اور اس تاریخی جلی پر جمی تھیں۔ برق جان نے ہولے سے کہا: ”میں پھر کبھی رستم آتم یہ کر سکتے ہو۔ جس طرح تم نے گارنی والا تہ تو اسے تم یہ بت بھی تو دے سکتے ہو۔“

رستم نے جواب نہیں دیا۔

ناصر کی آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ رستم کووصلہ افزا غروں سے دیکھ رہا تھا۔ پیر یاروں کی تعداد وہ تھی۔ ان میں سے چھ اپنی رانگڑوں سمیت باگ، چوک کڑ سے تھے۔ رستم اور ناسر میں چہ تاو سے فراری دلیرانہ کوشش کر چکے تھے۔ وہ اس ناچ کے خطرناک ترین قیدی تھے۔ اور ان کی طرف سے ایک کھلے کی شکایت بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

رستم کے ہاتھ کھولنے سے پہلے برق جان نے پیر یاروں سے کہا کہ وہ صبر کرو اس سے دور لے جائیں۔ ناصر نے رستم کے کندھے پر ہوسہ دیا۔ تین منٹ پاؤں نہ۔ اسے رستم نے فاسلے پر لے گئے۔ ”رستم کے ہاتھ کھولو۔“ برق جان نے دوسرا ہاتھ دیا۔

زنگ آلود آہنی زنجیر رستم کے ہاتھوں سے لٹکی ہوئی تھی۔ سزاؤں میں خوراک رکھنے والی اس کی طرف آئی ہوئی تھیں۔ حراست کا کوئی ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رستم نے زلف سے اتھڑے ہوئے اپنے بھاری جگر کم جو ستے اچار نے چاہے تو ایک پیر یار نے بدلتی سے آگے بڑھ کر اس کی ہدایت کی۔

برق جان نے رستم کو ملے اور کہتے کے سلسلے میں آخری چابوت دیں۔ یہ چابوت اس نے کافی کاٹ لیا۔ یہی دستر تک پہنچانی تھیں۔ پیر یار اور برق جان سے مدد مانگا رہا۔ نا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے وہ کسی انسان کے گنیں خواہواں جانور کے گرد موجود ہوں۔ رستم نے کھر در سے چپ سے پیچھے سے پہنچے ہوئے طور پر دوسری پانی کو ایک پانچ لٹر جگر دیا۔ اور پھر پیر یار پر قدم رکھ دیئے۔ شرم سے چاند کھولے۔ بٹے کر نے سے بعد اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ جیل سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ شاید برق جان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ بہت آسان۔ اسے اسے صرف تو ہوتے دھڑا۔ اٹھا رکھا تھا۔ ملی کا چوڑا تھا کہ اس پر وہ بند سے پاؤں بڑھ بھی جاتے۔

سکتے تھے۔ ہوا انہیں طرف سے اسے دھکیل رہی تھی مگر یہ دھکیل خطرناک نہیں تھی۔ وہ اپنی نائیک کے درد کے سبب تھوڑا سا لنگڑا کر چلا ہوا۔ آگے بڑھتا گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی طیش آمیز توانائی اٹھ اٹھ اٹھ رہی تھی۔ اس توانائی کا سرچشمہ یہ ارادہ تھا کہ دوسروں سے وہم کے اس لہر اترے ہوئے جھنڈے کو اکھاڑ کر پھینکا ہے جو کام ایک طویل مدت سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آج اس چمکتی ہوئی صبح میں اس گہرے نیلے آسمان کے اس کے ہاتھوں سے ہو جاتا تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی۔

اور پھر وہ آخری چندہ میں قدم رہ گئے جو مقامی روایت کے مطابق زیادہ خطرناک تھے۔ چند لمبے کے لیے رستم کا دل پیسے کسی نے غمی میں جکڑا۔ اسے اپنے نیچے چپاس ساٹھ فٹ کی ملک گہرائی میں براف کا دم شور سنا دیا۔ اس پانی نے ایک سرگوشی کی اسے اپنی طرف بلایا۔ آج آج وہیں آتا ہی پڑے گا۔ یہاں یہاں کا دستور ہے۔ روانہ۔ دستور اور عقیدہ سے اتنی آسانی سے نہیں بدلتے۔ آج آج یہ آخری چندہ قدم طے کرنا ہی نہیں مانگ رہا ہے۔ یہ اب بھی مانگ رہا ہے۔ تم گر رہے ہو۔ تمہارا سر پکڑا رہا ہے۔ ہوا بہت تیز ہے۔ پاؤں پھسل رہے ہیں۔ نیچے دیکھو۔ نیچے دیکھو۔ اپنے پاؤں کی طرف دیکھو۔ غیر محرم کی سرگوشیاں وہم کی لہروں پر تیر کر رستم کے کانوں میں گونجتی رہیں یکن وہ در کانیں ٹھٹھا بھی نہیں۔ اس نے توقف بھی نہیں کیا۔ یقین کی ایک توانا لہر کے ساتھ بڑھتا ہوا۔ وہ دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ دوسرا سرا ہاں، دوسرا کنارہ۔ جو وہ صدیوں سے پاؤں دلوں کی کھینچ سے دور تھا۔ اور اس لیے دور تھا کہ اس تک پہنچنے کے لیے یقین محکم کی ضرورت تھی۔

یہاں ایک دھواں چٹان تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی میں مختلف تھیں۔ فٹ ہوگی۔ یہاں ایک تیسرہ تھا۔ بالکل برعکس صورت کا جیسے اوہ اپنی چھاتیوں سے اپنے نیچے کو دودھ چا رہی تھی۔ جیسے کی حالت سے اعزاز ہوتا تھا کہ وہ کسی سو سال پرانا ہے۔ وہم کی خیموں نے مجھے سے پتھر میں چھوئے چھوئے سوراخ بنادے تھے۔ بٹے کی ناک غائب تھی۔ صورت کا ایک کولہ نصف رہ گیا تھا۔ شاید کبھی اس مجھے میں جیسی پتھر دھیرہ بھی بڑے ہوں لیکن اب وہ چھپیں خالی تھی اور وہاں چھوئے چھوئے گڑے نظر آ رہے تھے۔ برق جان کی معلومات کے عین مطابق کھسا ہوا کبک صورت کی گود میں موجود تھا۔ یہ پتھر کی ایک پتلی سلی تھی اور اسے کتبے کے بجائے سنگی تختی کہا زیادہ مناسب تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی میں کی نام نہاد تھی سے تھوڑی ہی زیادہ تھی۔ اس پر باریک حرفوں سے ایک مہارت کندہ کی گئی تھی۔ یہ ناقابل فہم

عبارت یقیناً مقامی زبان میں ہی تھی۔ یہ تصور کہ رستم کو عجیب سا احساس ہوا کہ پھیلنا تقریباً دو سو سال میں یہاں پہنچنے والا اور اس تختی کو نبھونے والا وہ پہلا شخص ہے۔ اس نے تختی اٹھائی اور محسوس کرنا کہ اسے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود لوگ جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت آمیز مسرت تھی۔ وہ اچھل رہے تھے اور عجیب آوازیں بلند کر رہے تھے۔ پانی کے شور اور ہوا کے مخالف رخ کی وجہ سے یہ آوازیں وضاحت سے رستم کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ رستم نے تختی کو کسی زبانی کی طرح سر سے بلند کر کے کنارے پر موجود لوگوں کو دکھایا۔ ان کے جوش و خروش میں کی گنا اضافہ ہو گیا۔

واپسی رستم کے لیے زیادہ آسان ثابت ہوئی۔ اسے یوں لگا کہ اگر وہ چاہے تو آجکالیں بند کر کے دوڑتا ہوا اس بل کو پار کر سکتا ہے۔ درحقیقت خام عقیدے اور سینہ بہ سینہ چلنے والے وہم کا وہ خلسہ ٹوٹ گیا تھا جس نے ایک مدت سے اس بل کو ناقابل عبور بنا رکھا تھا۔

کنارے پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر رستم کے سینے میں ایک امید جاگ اٹھی۔ اگر جوش و خروش کی اس لہر میں بہہ کر برق جان اس کے قریب آجاتا، اس کے ہاتھ سے تختی لینے کی کوشش کرتا تو پانسا پٹ سکتا تھا۔ رستم کے ہاتھ اور پاؤں فی الوقت آزاد تھے۔ رستم نے بڑی تیزی کے ساتھ ایک نقشہ ترتیب دیا کہ اگر ایسا ہوا تو دیکھا کرے گا۔

جوں جی رستم نے کنارے پر قدم رکھا، برق جان اور اس کے ساتھیوں نے ایک قلب و کفاح نعرہ لگا دیا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ برق جان لپک کر رستم سے لپٹ جائے گا۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ شہنشاہ گیا۔ اس کے تجربے نے اسے ایک عقین ترین غلطی سے بچا لیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے پکار کر کہا۔ ”مبارک ہو رستم بہت مبارک ہو۔“

”تم کو بھی مبارک ہو۔“ رستم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”گفتا ہے کہ کوئی سینا و کجہر ہا یوں۔“ برق جان نے ٹھوکر دیا کہ کیا۔ پھر اس نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر رستم کے ہاتھوں سے تختی لے لے۔ رستم نے چند لمحوں کے لیے خود کو چراغ کی کہانی والے الدین کی طرح محسوس کیا۔ وہ بعد مشکل غار کے اندر سے جادو کا چراغ نکال لایا تھا۔ اب چراغ یعنی نبی اس کے ہاتھ میں تھا اور برق جان الدین کے چچا کی طرح اسے غار سے نکالنے سے پہلے اس سے چراغ وصول کرنا چاہتا تھا۔

رستم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قریب آنے والے محافظ کو دبوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر اس نے محافظ کو پکڑ بھی لیا تو برق جان اسے آنا ٹھانا محافظ سمیت چھٹی کر دے گا۔ اس نے اپنے ارد گرد چکر مسخ افکنوں کو دیکھا اور تختی، قریب آنے والے محافظ کے سپرد کر دی۔ اس نے مقدس تختی کو لڑاں ہاتھوں سے تھا، اسے بوسہ دیا اور برق جان کے پاس لے گیا۔ برق جان نے بھی بڑی عقیدت کے ساتھ تختی کو تھا، اسے بوسے دیے اور سینے سے لگا لیا۔

محافظوں کے چہروں سے بھی ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد تختی کو دیکھنا اور نبھونا چاہتے ہیں مگر فی الحال وہ ایک اہم ذمہ داری پر تھے۔

برق جان نے ایک دوسرے محافظ کو حکم دیا کہ رستم کے ہاتھ باندھ دیے جائیں۔ پہلے محافظ کی طرح اس محافظ نے بھی رستم کی طرف بڑھنے سے پہلے اپنی رائفل برف پر رکھ دی اور آہنی زنجیر سے رستم کی طرف بڑھا۔

رستم نے بے بسی سے ہنسی کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ان بائیس لگا ہونے والے اک دوسرے کو سمجھا دیا کہ مزاحمت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہاں، اگر وہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو پھر اور بات ہے۔ محافظ چھوٹا سا چکر کاٹ کر رستم کے عقب میں آیا اور بڑے ادب کے ساتھ اسے ہاتھ پیچھے موڑنے کو کہا۔ رستم نے ایک سوالیہ نظر برق جان پر ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو، کیا اس کے بغیر چارہ نہیں؟

برق جان نے نگاہیں الجھیں۔ شاید اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا کہ ہاں، اس کے بغیر چارہ نہیں۔

محافظ نے رستم کے ہاتھ پشت پر زنجیر سے پکڑ دیے۔ ہاتھوں کے بندھنے ہی فضا میں موجود ناکہ ایک دم ختم ہو گیا۔ وہ تین پیر ہزاروں کے سوا باقی نے رائفلیں جھکا لیں۔ برق جان لپک کر رستم کے پاس آیا۔ اس کا ہاتھ چارہ اور اگلے سے لگا لیا۔ اس کے چہرے سے خوشی چھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کا رنگ سرخ انار کی طرح ہو گیا تھا۔

”تم نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔“ تم نے..... تم نے تاریخ لکھ دی ہے دوست۔“ اس نے پہلی بار رستم کے لیے دوست کا لفظ استعمال کیا۔ اس کی آواز اندرونی بیجان سے کانپ رہی تھی۔

رستم ساکت و جامد کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔ برق جان نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا اور محبت کے انداز میں اس کے لیے بالوں کو نکھیرا۔ اس کے بعد وہ اس آگے بڑھا اور اس

نے بھی رستم کو گرم جوشی سے مبارکباد دی۔ "آج کا دن اس پاؤندہ قبیلے کے لیے ایک یادگار دن ہے۔" وہ اس نے کہا۔

تختی کو بڑے احترام کے ساتھ ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ محافظ قریب آ کر تختی کے لیے حد بندی اور احترام سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے تختی کے قریب آتے، اچھوٹے، بوسہ دیتے اور لے والے قدموں پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ سب لوگ رستم کو بھی بڑی ستائش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ رقص کا دن ہے۔ یہ خوشی کا دن ہے۔" برق جان نے پکار کر کہا۔
 "ہاں، یہ رقص کا دن ہے۔ یہ جشن کا دن ہے۔" ریان جنت بھی اپنے سرداری تاج میں بلند آواز میں بولا۔

پاؤندوں نے اپنی چمکیلی راکٹیں اپنے سروں سے اوپر افقی رخ پر اٹھائیں اور رقص کرنے لگے۔ ان کی کمروں سے ہندی ہوئی ان کی چھوٹی چھوٹی کپڑیاں سورن کی روشنی میں دمک رہی تھیں۔ اس، ہاضور اور رستم کے سوا وہ سب رقصاں تھے۔ ایک خانہ کزوی کے ایک ساتھ کھانے کو تھاپ دینے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ریان جنت دو منجروں، ایک دوسرے سے ٹکرا کر موسیقی پیدا کرنے لگا۔ پھر پہلے دو تین ہوائی فائر برق جان نے ہی کیے تھے۔

دھماکوں سے یہ میدان برف زار گونج اٹھا۔ اپنے سردار کو دیکھ کر دوسرے پاؤندہ بھی فائر کرنے لگے۔ تین چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑا اور ایک بار پھر تختی کی زیارت شروع ہو گئی۔ رستم ہاضور کو بہت اور احترام کے ساتھ ایک چٹائی پر بٹھادیے گیا۔ اعزاز و تہنیت کا ایک کوئی نہی پر اس تاریخی جگہ کے سامنے ابھی یہ جشن کچھ مزید چلے گا۔

اجمل خان اور ادا کے گوشانی سے رشتہ تو بنے اب تین ہفتے ہوئے کو آئے تھے۔ تین ہفتوں میں انہوں نے بہت سفر کیا تھا۔ اس سفر میں اجمل آباد کا رحیم اللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رحیم اللہ ان عجائبات کا ایک نہایت تجربہ کار گائیڈ تھا۔ وہ بوڑھا بوڑھا چکا تھا مگر اس کا بھی اب بھی منسوبہ تھی اور جسم میں جوانوں کی سی چستی محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک فوجی فوجی فوجی تھا۔ رحیم اللہ کے ایک مرحوم دوست کا بیٹا بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی تھا۔ اس کا نام فرحان حمید تھا۔ اس گروپ کے پاس "ہائیگنٹ" کا مکمل سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ اجمل خان،

کے پاس چھوٹے جیول کی ایک خود کار رائلٹ موجود تھی۔ یہ رائلٹ اس نے اپنے سامان میں اچھی طرح چھپا رکھی تھی۔ تاہم رائلٹ چھپاتے ہوئے یہ احتیاطی گئی تھی کہ بنگالی حالت میں وہ فوری طور پر برآمد کی جاسکے۔ رائلٹ کا ایڈیشن بھی کھانے کے سربراہن جنکس میں محفوظ کیا گیا تھا۔ رحیم اللہ کے سامان میں بھی 38 بورا ایک لائنس والا ہتوتل موجود تھا۔ یہ لوگ اسکرودے آگے کے علاقے میں گھومتے گھومتے ان سنان پھاڑوں کی طرف نکل گئے تھے جو پاکستان اور چین کی سرحد بناتے تھے۔ یہاں حد نگاہ تک برف تھی اور کہیں کوئی پتھر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نباتات اور حیوانات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے ایک برف پوش پہاڑی کے دامن میں کیپ لگا رکھا تھا۔ یہ دو اینٹ اینٹ ٹپے تھے۔ ایک ٹپے میں دو افراد قیام کر سکتے تھے۔ دن کا وقت تھا اور صوبہ نکل ہوئی تھی۔ اجمل خان، رحیم اللہ اور فرحان حمید بارہوچ میں چٹائی بچھائے بیٹھے تھے۔ رحیم اللہ نے ایک نقشہ اپنے سامنے پھیلا رکھا تھا اور اس میں کھویا ہوا تھا۔ ڈولا اندر ٹپے میں ہی تھا۔

فرحان نے کہا۔ "خان بھائی کیا بات ہے۔ ڈولا نکل سے گم سم ہے اور زیادہ ہوتا بھی نہیں؟"

"اس پر خاموشی کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔" اجمل خان نے کہا۔
 "کچھ ہے چین۔" بھی لگتا ہے۔"

"جب خاموش ہوتا ہے تو پھر یہ چین بھی ہوتا ہے۔ خواص کا دماغ بالکل اور طرح کا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ اس کا نظریہ کان اور ناک وغیرہ کتنا تیز ہے۔ یہ سارا بچہ ایک دم تیز کام کی طرح کام کرتا ہے۔ اور دوسرا بات یہ ہے کہ اکثر جب یہ چپ ہوتا ہے تو اس کا دماغ بہت دور کا کوئی لاتا ہے۔"

"اپنی طرح کا ایک دم تو کھاتا ہے۔"

رحیم اللہ نے نقشے سے سر اٹھایا اور اپنی بھاری بھر کم آواز میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اپنے درمیان سے کافی آگے نکل گئے ہیں۔" اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم اس وقت یہاں اس جگہ پر ہیں جبکہ ہمیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ یہ خطرناک جگہ ہے۔ یہاں یہ صلاوہ میں بہت زیادہ ہیں۔ ابوالاچ (برقانی توڑے گرنے) کا خطرہ بھی زیادہ ہو گا اور پھر وہ گہری کھائیاں انہوں پر سے نظر نہیں آتیں۔"

فرحان نے ہاتھ جوڑے ہوئے کہا۔ "رائٹل خدا کے لیے اب ان کھائیوں کا ذکر پھر

سے شروع نہ کر دیجیے گا۔ میرا دل ہولے لگتا ہے۔ آج تو صوبہ لنگی ہوئی ہے۔ موسم کی نسبت سے کچھ اچھی ایسی باتیں کہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، اب میں ہری برتی باتیں کر رہا ہوں۔"

"دراصل آپ کی شاعری اپنی اچھی ہے کہ اس سے متاثرے میں آپ کی اچھی سے اچھی نثر بھی بری لگنے لگتی ہے۔"

"تو تمہارا مطلب کہ میں عام باتیں بھی بخراور قافیہ ردیف کی پابندی میں رہ کر کیا کروں؟"

"جی ہے اگلے! اگر ایسا ہو جائے تو میں اپنے میگزین میں آپ کے اس انداز گفتگو کی تفصیل چھاپوں اور ساتھ ہی آپ کا نام ٹیئر بک آف ورلڈ ریکارڈ کے لیے جو بڑے کردوں دنیا کا واحد شخص جو باتیں کرتے، ہنستے ہوئے اور اڑتے بھگتے بھی بخراور قافیہ کا خیال رکھتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک اگلے اور نیچے میں ٹوک جھوک ہوئی۔ پھر نیچے نے انگڑی کو اپنی تازہ شاعری سنانے پر آمادہ کر لیا۔ رحیم اللہ کے کلام میں واقعی کوئی اور گہرائی تھی۔ اس کی ساری عمران برف زاروں، جھیلوں اور جنگلوں میں گھومتے گزرتی تھی۔ اس لیے اس کی شاعری میں بھی یہی مناظر دکھائی دیتے تھے۔ ایسے برف زار جن میں سینکڑوں میل تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جہاں قدرت ایک مہیب شانے کی صورت سفید برفیلی ڈھلوانوں، آئینہ صلیبوں اور سرکش چٹنیوں پر سایہ چھن رہی تھی۔ جہاں انسان خود کو گندے کے بہت قریب محسوس کرتا تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ ڈراکان لگائے تو غیر مرئی آواز میں سن سکتا ہے۔ اس شاعری میں صرف سفید برف ہی نہیں تھی۔ کہیں کہیں پھولوں کے رنگ، چشموں کی گنگناہٹ اور چناروں کے سائے کی چمکیلی کروائی پر ازخوں کی جھلک بھی تھی۔ رحیم اللہ نے انسانی ایک بھر پور نظم سن کر ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ اہمل خان کو بھی مزہ آیا۔ اس نے کئی بار ہاتھ اٹھا اٹھا کر رحیم اللہ کو داد دی۔

لغز ختم کر کے رحیم اللہ نے اہمل خان سے کہا۔ "یار! جہیں سمجھ بھی آتی ہے یا ویسے ہی دل رکھتے کو واہو اور تے ہو؟"

"خو آپ سمجھنے کی بات کر رہا ہے، ام تو آپ کی صحبت میں رہ کر خود شاعری پر مانے لگا ہے۔ کل رات ام نے بہت اچھے شعر جوڑے ہیں لیکن یہ ذرا مزید ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ام آپ کو سننا بھی سکتا ہے۔ بس آپ کو یہ گانہ دینا ہوگی کہ آپ نہیں کے ضرور۔"

"ایسی گزری شرط پر نہیں سن سکتے۔" رحیم اللہ نے کہا۔

"اچھا آپ کے لیے اتنا رعایت کر دیتا ہوں کہ مسکرا دیجیے گا۔" اہمل نے کہا۔

"ہاں نہیں۔ ہم صرف یہ گانہ دے سکتے ہیں کہ اگر تم نے بے کار شعر سنائے اور

شاعری کی تانگ و خیرہ توڑی تو ہم تمہیں نہیں گے نہیں۔"

"گانگ تو تھوڑی بہت ہونے لگی جی۔ کیونکہ ام اپنے شعروں میں ایک آدھو نا پشتویا

وچالی گا بھی لگا دیتا ہے۔"

"اچھا چلو، سناؤ خان بھائی۔" فرقان نے جیسے ایک بڑے خطرے کے سامنے سین تان کر کہا۔

اہمل خان نے ٹھکانہ کر گنا صاف کیا اور پوری تنبیہ کی سے بولا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ پڑا ہوا تھا

وہ سر جھکا کے بالکل چپ چاپ کھڑا ہوا تھا

استحسان میں چل تو اس نے ہوتا ہی تھا آخر

بچے کے دن بھی محبوبہ کے گھر وڑا ہوا تھا

"وڑا ہونا" یعنی کھسا ہونا۔ سب کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر گیا فرقان کا تو جس شمس

کر برا حال ہو گیا۔ اس نے سرخ چہرے کے ساتھ مزید فرائش کی۔ اہمل، شاعروں کے

انداز میں بال کھجا تا رہا پھر اس نے بڑی سادگی سے ایک اور قطعہ عطا کیا۔

اس بے کار زندگی نے تو ام کو تھکا مارا

ہر موڑ پر جھنجھوڑا ہر روز نیا جھکا مارا

ام نے کھجاوہ پیار سے گردن میں ہاتھ ڈالتی ہے

اس نے ہاتھ ڈالا، کھینچا اور ام کو پٹکا مارا

"پٹکا مارا کا مطلب ہے جی دھڑام مارا۔" اہمل نے آخر میں وضاحت کی۔ رحیم اللہ

نے سمجھ کر برف کا گولا اہمل خان کے سر پر مارا۔ فرقان ہیبت کچڑ کر بس رہا تھا۔ رحیم اللہ

خود بھی مسکرا رہے تھے۔

اچانک ڈھلائی جس سے برآمد ہوا۔ وہ اس سارے ماحول سے الگ تھلک نظر آ رہا

تھا۔ وہ تیزی سے اہمل، فرقان اور رحیم اللہ کی طرف آیا۔ وہ جیسے کسی چیز پر غور کرنے کی

کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے ڈھلے؟" اہمل نے پوچھا۔

”خان بھائی! کچھ سنا آپ نے؟“ ڈولا بولا۔

وہ تینوں ایک دم خاموش ہو گئے اور سننے کی کوشش کرنے لگے۔ تقریباً نصف منٹ تک بکسر خاموشی رہی۔ ہوا کی سائیں سائیں سے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہی سائیں سائیں جو پچھلے نئی ہفتے سے ان کے ساتھ تھی۔ کبھی بکھار اس آواز میں کسی جنگلی جانور کی آواز شامل ہو جایا کرتی تھی مگر اب تو پچھلے پانچ چھ روز سے کوئی ایسی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں برف کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

کافی دیر غور کرنے کے بعد سب سے پہلے اہمل نے ہی نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر وہ ڈولے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تمہیں کیا لگ رہا ہے؟“

”چاہئیں؟“

”کیا مطلب؟“

”یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ۔۔۔ دم آوازیں۔۔۔ شاید گولی چلنے کی۔“ ڈولے کے اپنے چہرے پر بھی اب الجھن نمودار ہو گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک مزید سن گن لیتے رہے۔ جب ڈولا نچے میں داخل چلا گیا اور پھر وہ بائیں کرنے لگے۔ فرخان نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ ڈولے کو کبھی کبھی دھوکا بھی ہوتا ہے۔ پچھلے ہفتے بھی اس کی ناک نے غلط اطلاع دی تھی۔ وہ جسے کسی مرے ہوئے جسم کی فکر رہا تھا۔ وہ ایک گامزادہ دست لگا تھا۔“

”چلو، پھر بھی ہم سے تو یہ بہت بہتر ہے۔ اس کی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں۔“ رحیم اللہ نے کہا۔

دھوپ اب تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف برف تھی پھر بھی ہلکی سی گرمی محسوس ہونے لگی۔ رحیم اللہ نے اپنی رست واضح دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری رائے ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ہم ڈھلوان کی سیدھ میں چلیں۔ جب ٹیبر چڑھ جاتا ہے تو اوپر سے برف پھسل کر ”ایو ایو“ بننے کا امکان بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔“

”لیکن ڈولا کبہر ہا تھا کہ ام کو آج کا دن یہاں اور رک جانا چاہیے۔ اس کو یہ جگہ بہت پسند آئی ہے۔“ وہ خود قوراندہ گھس کر بیٹھا ہوا ہے۔ ”رحیم اللہ نے کہا۔“

”اس نے پروگرام بنایا تھا کہ آج اس سائے والی پہاڑی تک جائیں گے۔ لگتا ہے کہ وہاں چھوٹا سا جھیل بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جھیل و جھیل مل جائے۔“

”جھیل پکڑے پکڑے خود برف کے نیچے ب گئے تو کیا فائدہ۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“ فرخان نے کہا۔

”شادی تو اگلے رحیم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہوا۔ بلکہ میرا تو کوئی منہ بولا بیوی بھی نہیں ہے۔“ اس بات پر فرخان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”منہ بولی بیوی نہیں۔۔۔ لیکن منہ بولی بہن تو ہے۔“ رحیم اللہ نے کہا۔

”بالکل ہے جی۔ منہ بولا بہن ہے لیکن بالکل سچی بہن جیسا۔ اس کے لیے اپنا جان بھی قربان ہے۔ ہمارا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ام اس کے لیے کوئی اچھا خبر لے کر جاسکے۔ اور اگر اچھا خبر نہ ہو تو پھر ام بھی یہیں کہیں کسی دراز مراڑ میں گر کر مر جائے۔“ اہمل خان ایک دم تنبیہ ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ پڑاؤ اٹھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب انہیں آگے جانے کے بجائے بائیں طرف مڑ جانا تھا اور ان پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلنا تھا جو آگے جا کر ٹھلک اٹھیں گے ساتھ چلتے تھے۔

ڈولا ابھی تک مطمئن تھا۔ جب سامان سفری قہیلوں میں بند ہو چکا اور نیچے وغیرہ سمیٹے جا چکے تو رحیم اللہ نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔ ”بھئی وہ ڈولا جھیل کدھر ہے؟“ ان کی مراد ڈولا تھا۔

تینوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ ڈولا کچھ فاصلے پر ایک برف پوش پہاڑی کی ڈھلوان پر کدھر نظر آیا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ پھر وہ چند قدم مزید چلے کر پہاڑی کی ایک چوٹی کے نزدیک پہنچ گیا۔ عجیب برہکا برہکا سا انداز تھا اس کا۔ ابھی رحیم اللہ اسے آواز دینے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان سب نے ڈولے کو گونجتے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ تیزی سے ان تینوں کی طرف مڑا۔ اس کی پکارتی ہوئی برہکا برہکا آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ وہ انہیں پہاڑی کی طرف بلارہا تھا۔

”شاید اس نے کچھ سنا ہے۔“ اہمل خان نے کہا۔

سب سے پہلے اہمل نے ہی قدم بڑھائے تھے۔ پھر رحیم اللہ اور فرخان بھی اس کے پیچھے آئے۔ وہ نرم برف پر ڈولے کے چھوٹے چھوٹے قدموں کا تعاقب کرتے قریباً ڈیڑھ دو میٹر دور پہاڑی پر پہنچ گئے۔ ڈولے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے کچھ دیکھ

نہیں بلکہ سنا ہے۔ وہ خاصا جڈ پاتی بور ہا تھا۔ اس نے اپنی بار یک آواز میں کہا۔ ”یہاں کچھ ہے جی۔ مجھے فائرنگ کی آواز آئی ہے۔ یہ دیکھیں۔ یہ دیکھیں پھر۔“ پھر گولیاں چلی ہیں۔“

اجمل، فرقان اور رحمہ اللہ نے بھی ہوا کی لہروں پر کان لگا دیئے۔ انہیں ہوا کی تیز سرسراہٹ کے ہوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دو چار منٹ گزر گئے پھر شاید وہ ڈولے کے واہیلے کے پاؤں جو دباؤس ہی ہو جاتے۔ مگر اچانک ہوا کے بہاؤ میں اجمل کو بھی کچھ سنائی دیا۔ بہت مدھم آواز تھی لیکن شناخت کی جا سکتی تھی۔ یہ فائرنگ کی ہی آواز تھی۔ یعنی اس وسیع و عریض برف زار میں ان کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود تھا۔ نزدیک تھا، دور تھا یا بہت دور تھا۔ مگر حاضر و!

”ہاں ام کو بھی سنائی دیا ہے۔“ اجمل نے ہنسنے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔ انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ برف کی سفید چادر پر جہ نگاہ تک کہیں کوئی ایسی نشانی دکھائی نہیں دی تھی جسے کیا انداز سے تعبیر کیا جاسکے۔

ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ایک بار پھر مدھم آواز ابھری اور اس مرتبہ اس آواز کو فرقان نے بھی سنا۔ آپ شے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ بات بھی کہ یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ اور اگر موجود تھے تو پھر ان سے کچھ نہ کچھ معلوم بھی ہو سکتا تھا۔

ابھی ٹھوڑی دیر پہلے رحمہ اللہ صاحب نے یہی بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ”یہاں کسی انسانی آبادی کا نشانہ بہت مشکل ہے لیکن اگر آبادی ہوئی تو پھر ہمارے لیے امیدی کی کریمیں بھی پیدا ہوں گی۔“ تو کیا امیدی کی کریمیں پیدا ہو رہی تھیں؟

انہوں نے اپنا بھاری سامان وہاں ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔ اجمل خان نے اپنے بیک میں سے خود کار رائل ٹکال لی اور اس کے وفراؤں پر بھی ٹکال کر بھاری بھر کم بیٹک کی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ رحمہ اللہ نے بھی اپنا پستول برآمد کر لیا اور اپنی جیب کو پکڑ کر اس کو بغیر ہتھیار لیا۔ اس کے بعد وہ انداز سے اس آواز کی سمت بڑھے۔ وہ قریباً ایک گھنٹا چلتے رہے۔ راستے میں وہ بڑے دھیان سے قدموں کے نشانات یا اس قسم کی دوسری نشانیاں بھی تلاش کرتے رہے۔ ایک جگہ انہیں بچوں کے واضح نشانات دکھائی دیئے۔ رحمہ اللہ نے خیال ظاہر کیا کہ یہ سنو لیا پڑا کے نشانات ہو سکتے ہیں۔ ان کے جسموں میں سنسنی دوڑ گئی تاہم انہیں دور دور تک کہیں اس خوبی جانور کے آثار نظر نہیں آئے۔ گتھا کتا کہ وہ کئی دن پہلے یہاں سے گزرا ہے۔

ایک ڈولا ٹھٹک گیا۔ ”سنیں۔ سنیں۔ سنیں۔“ وہ سب کھڑے ہو گئے اور ان کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ دو فائر ہوئے اور اس مرتبہ آواز واضح تھی۔ آواز رحمہ اللہ نے بھی سنی۔ ”میرا خیال ہے۔ اس طرف۔“ رحمہ اللہ نے ابھی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

”مجھے بولنے کی مدھم آواز میں بھی سنائی دی رہی ہے۔ یہ آٹھ دس سے زیادہ بندے ہوں گے۔ شاید وہ کچھ گارے ہیں۔“

اجمل اور فرقان نے سننے کی کوشش کی مگر کوئی انسانی آواز سننے میں ناکام رہے۔ بہر حال اب ان کے لیے ڈولے کی بات کو بھلا کر ممکن نہیں تھا۔ وہ جی الامکان تیزی اور احتیاط سے ڈولے کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔ اس گرمی کو بھی کبھی خوشگوار ہوا کے تپوئے گرم و خنک میں بدل دیتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹہ مزید چلتے کے بعد ڈولا ٹک جکڑ گیا۔ اس کی حیات اپنی پوری رفتار سے کام کر رہی تھی۔ وہ سن رہا تھا۔ اب باقیوں نے بھی دھیان سے سنا تو انہیں مدھم آواز میں سنائی دیں۔ کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے اور فیس رہے تھے۔ تاہم وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ ڈولے نے کہا۔ ”ان کے ساتھ ٹھوڑے بھی ہیں۔ انہوں نے آگ جلا رکھی ہے اور شاید قبوہ وغیرہ بنا رہے ہیں۔ ان کے پاس کافی رائلٹیں بھی ہیں۔“

”اندازاً تین دو دروہوں کے ہم سے؟“ اجمل نے پوچھا۔ ”وہ اس سامنے والی پہاڑی کے پیچھے ہیں۔ میں۔ میں پانی کا شور بھی سن رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پہاڑی ندی ہے۔ وہ اس کے کنارے بیٹھے ہیں۔“

اجمل خان نے اپنی رائلٹ تیار کر لی۔ وہ چاروں بڑی احتیاط اور آہستہ روی سے پہاڑی کی بلندی کی طرف بڑھے۔ چندہ میں منٹ میں وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ اجمل اور رحمہ اللہ نے فریٹے تو دوں کے عقب سے غیب میں بھاٹکا۔ ڈولے نے جو کچھ کہا تھا، درست تھا۔ ایک چوڑے پاٹ کی برفانی گڑ گاڑھی جس کے اندر آدھ ٹھٹکی برف تیر رہی تھی۔ وہ صلوں کی وجہ سے پانی ہلکا شور پیدا کر رہا تھا۔ اس آبی گڑ گاڑ کے نصف پاٹ کے اوپر ایک قدرتی پھول سا بنا ہوا تھا۔ ایک بہت نادر درخت تھا جو تھ موسوں کی تختیاں جھیلیٹا جھیلیٹا نہ جانے کب عری کے پاٹ میں گرا تھا اور اس کی نصف چوڑائی تک پہنچ گیا تھا۔ اس ٹپ کے مین سامنے سفید براق برف پر تیرہ چودہ افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب بھاری بھر کم لباسوں میں تھے۔ ان کے کندھوں سے رائلٹیں لٹک رہی تھیں۔ فاصلہ زیادہ تھا، ان کے چہرے

وضاحت سے تو نہیں دیکھے جاسکتے تھے مگر پتہ چلا تھا کہ ان میں سے اکثر کے سر اور چہرے کے بال بے حاشہ بڑے ہوئے تھے۔

اجمل اور ذولے نے دیکھا کہ چمڑی ایک مختفی کی ایک بلند چمڑ پر رکھی گئی ہے۔ پانچ چھ افراد اس مختفی کے گرد جمع تھے اور قہقہے سا انداز اپنانے ہوئے تھے۔ ذولا کچھ زیادہ ہی بڑے جوش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ”خان بھائی! ان لوگوں نے اپنی کمر سے چھوٹے دستے کی کپڑا یاں لٹکا رکھی ہیں۔ ان کے طے انہی لوگوں جیسے ہیں، جنہیں ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”دور میں کہاں ہے؟“ اچانک اجمل خان کو خیال آیا۔ رحیم اللہ نے فرقان کے چلیے کی طر اشارہ کیا۔ فرقان نے ٹیلی اسکوپ نکال کر اجمل کے حوالے کی۔ اجمل نے اسے آنکھوں سے لگایا اور جائزہ لینے لگا۔ سطر واقع تر ہو گیا تھا۔ اچانک اجمل خان کو لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون جوش مار کر اس کے سر کی طرف آ رہا ہے۔ اس کے پرے جسم میں جڑا روں واٹ کی برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے اپنی محبوب ترین ہستی کو دیکھا۔ اس نے رستم سیال کو دیکھا۔ شدید موصوں نے رستم کا رنگ ستولا دے دیا تھا۔ اس کے رستم کی طرح نظر آنے والے بال اچھے اچھے تھے اور داڑھی بھی اسی ہوا نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر کسی دی یا زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ڈاکٹر ناصر بھی موجود تھا۔ اس کا حلیہ بھی بدتر تھا اور ہاتھ پشت پر بٹکے ہوئے تھے۔ دو دونوں ایک پٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دروازہ قد باریب شخص جس کا ایک بازو کندھے سے کٹا ہوا تھا۔ رستم اور ناصر کے پاس کھڑا تھا۔ اجمل کو شریف نظر نہیں آیا۔

”کیا بات ہے؟“ اجمل کے مٹاڑت دیکھ کر رحیم اللہ نے بے چینی سے پوچھا۔ اجمل نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹائی۔ اس کا چہرہ جوش اور مسرت کے بے پناہ دباؤ سے آگ کی طرح جھپٹنے لگا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ ”آپ کچھ کیا جناب! ام چاروں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔“ دو دروازوں آواز میں بولا اور اس نے ٹیلی اسکوپ رحیم اللہ کی طرف بڑھا دی۔

اگلے دو تین منٹ میں ٹیلی اسکوپ بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے میں منتقل ہوئی۔ اجمل نے آگے بڑھ کر ذولے کو گلے سے لگایا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ذولے۔ ورنہ تم تو پیچھے چارے تھے۔“

رستم اور ناصر کو پچھان کر ذولہ بھی ایک دم خوش نظر آ رہا تھا۔ تاہم اب اسی خوشی کے ساتھ

ساتھ ایک طرح کا فکر بھی ان سب کے چہروں سے مٹا ہونے لگا۔ یہ بات اب بالکل واضح چھپی چھپی تھی مگر رستم اور ناصر ایسے لوگوں کی توہل میں جو ہرگز ان کے دوست نہیں ہیں۔ ان کے پاس کم از کم گیارہ جدید رائلٹیس موجود تھیں اور ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد چوک اور بڑے لوگ ہیں۔ ان کی ہلاکت آخری بھی کوئی دھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سری کے نواح میں گورے کے پٹنگے کے اندر انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ اجمل کی آنکھوں کے سامنے وہ خوشی مناظر محسوس ہوتے تھے کہ بالکل پٹنگے میں ہونے والی نقل و حرکت سے تھا۔

اچانک رحیم اللہ کی آواز نے اجمل کو چڑکا دیا۔ ”اجمل خان! بھٹے گنا ہے، دو لوگ یہاں سے چلنے کی تہاری کر رہے ہیں۔“ ٹیلی اسکوپ رحیم اللہ کی آنکھوں سے گئی تھی۔ اجمل نے ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے لگائی۔ گھوڑوں کی زینیں کی جارہی تھیں۔ رستم اور ناصر بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے پاس ایک مختفی سا ہوا تھا تھا۔ یہ مقامی نہیں لگتا تھا۔ اجمل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ رستم اور ناصر کو اس لقمہ و دیران برف زار میں دیکھ رہا ہے۔

رحیم اللہ نے کہا۔ ”یہ دیکھ لو۔۔۔ یہ لوگ گھوڑوں پر ہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا کریں۔ کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ ام ان کے چلنے سے پہلے ہی ان تک پہنچ جائیں۔“

”ہاں، ابھی ان کو چلنے میں دس پندرہ منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔“ رحیم اللہ نے کہا۔ کوہستانوں کی تعداد نے رحیم اللہ کو بجا طور پر پریشان کر دیا تھا۔ کچھ سبکی کیفیت فرقان کی بھی تھی حالانکہ وہ ایک نڈر اور باہمت ”نیوز مین“ تھا۔

اجمل خان کے رگ و پے میں ایک اونٹنا جو بڑے جوش پر گھبرا گیا تھا۔ وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ یہ اس شخص کچھ شخص سے بالکل مختلف تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اوٹ پٹنگ شہر ستار ہا تھا۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ تینوں کوئی پکڑ نہ کرے۔ ام اس ماٹے کو خود ہی آسانی سے دیکھ لے گا۔“

”نہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رحیم اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم جو کچھ کریں گے، قی کر کریں گے اور مشورے سے کریں گے۔“

”یہاں کو خان بھائی!“ ذولے نے کہا۔ وہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اجمل خان نے پوچھا۔

”وہ لوگ چلنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ مگر ان کا رخ دائیں طرف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے قریب سے ہو کر گزر رہے ہیں۔“

اجمل نے ٹیلی اسکوپ میں سے منظر دیکھا۔۔۔ اور تھوڑی دیر بعد تائیڈی انداز میں سر ہلایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اگر یہ لوگ دائیں طرف گیا تو پھر ام کو ان کے پاس جانے کا ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود مارے پاس سے گزرے گا۔“

انہوں نے باری باری ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے لگائی اور انتظار کرنے لگے کہ یہ اونٹ کس کروٹ چلتا ہے۔

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔۔۔ پھر ان کی امیدیں برآئیں۔۔۔ کوہستانوں کے مختصر قافلے کا رخ دائیں طرف ہی تھا۔ اب انہیں ایک ایسے راستے سے گزرنے کا تھا جہاں ان پر گھمٹا لگا کر بڑا موثر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ گھمٹا لگانے کی جگہ کا انتخاب پہلے ہی کر چکے تھے۔ ”مارا خیال ہے کہ اب ام کو چلنا چاہیے۔“ اجمل نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

رحیم اللہ فرقان حمید اور ڈولے نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ہر فیملی تو دوں کے پیچھے سفر کرتے ہوئے تیزی سے بائیں رخ سے آگے بڑھنے لگے۔ قریباً بیس منٹ بعد وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے کوہستانوں کے قافلے کو بہر صورت گزر کر جانا تھا۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہو گئی کہ نشیب میں برف پر قدموں کے ساتھ نشان دیکھے جاسکتے تھے۔ یقیناً یہ نشان اسی وقت بنے تھے جب یہ قافلہ کہیں سے چل کر آئی گزر رہا ہے۔ کنارے پر پتھرا تھا۔ اجمل خان کے اندر کہ یہ مثال نشانے باز پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے پوزیشن لینے کے لیے بڑی عمدہ جگہ منتخب کی۔ یہاں وہ اوندھ حالت کار اور دو چرخوں سے اپنی رائفل کی نال گزار کر بہت عمدہ نشان لگ سکتا تھا۔ اس کا بے پناہ اعتماد دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی حوصلہ بکڑ لیا تھا۔ پھر بھی پوزیشن ایک دم اپنی اختی خراب کرنا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

رحیم اللہ نے کہا۔ ”اجمل خان! ہمیں اپنے ذہن میں ایک بات کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہمیں ان پر سیدھی گولی چلانی ہے یا نہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔“ سیدی گولی چلائے بغیر ام ان کو سنہانے میں کامیاب ہو

جانے گا؟“

”مگر یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ اگر ان میں سے کوئی بندہ سر گیا تو پھر معاملہ ایک دم بہت تنگین ہو جائے گا۔ ہم کسی ایک بندے کی نہیں، پورے قبیلے یا برادری کی دشمنی مول لیں گے۔“

”آپ کا کیا رائے ہے؟“ اجمل نے پوچھا۔

رحیم اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ڈولے نے اچانک نشیب کی طرف اٹھی اٹھائی اور بولا۔ ”وہ دیکھیں جی۔۔۔ وہ نظر آ گئے۔“

اجمل اور رحیم اللہ نے بیک وقت نیچے دیکھا۔ برف کی سفید چادر پر قافلے کے دو پہلے گھڑ سوار نمودار ہو گئے تھے۔ یہ لوگ توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں آ پہنچے تھے۔ وہ بالکل کھلی جگہ پر تھے۔ اجمل خان ان کو نشانہ بنانے کی بہترین پوزیشن میں تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے کا پورا قافلہ نمودار ہو گیا۔ اجمل خان نے ٹیلی اسکوپ کے بغیر بھی رستم اور ناصر کو صاف پہچان لیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر باندھے تھے، اس کے باوجود وہ مہارت سے گھوڑوں پر اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ گھوڑے دگنی چال چلتے ہوئے جا رہے تھے۔ رستم کے لیے بال اس کے چہرے پر بھول رہے تھے۔ ایک گھڑ سوار نے چمڑکی مستطیل تختی کو بڑے احترام سے اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔

رستم کی بے بس حالت دیکھ کر ایک دم اجمل کی آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادری تن مچی۔ بہت کچھ اس کے ذہن سے گزر گیا۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ رستم کو قیدی کی حیثیت سے کہیں لے جایا جا رہا ہے اور اسے لے جانے والے بس چند سیکنڈ میں اس کی زد سے نکل جائیں گے۔ اس نے اپنی رائفل سنگل شاٹ پریسٹ کی اور برف پر اوندھ لیتا لیتا پکار کر بولا۔ ”خبردار! ایک جاؤ۔۔۔ ایک جاؤ۔“

اس کی آواز دیرانے میں دوں تک پہنچی۔ یہ الفاظ اس نے پشتوں میں ادا کیے تھے۔ قافلہ ٹھیک کر گیا۔ دو تین افراد کے ساتھ اپنی رائفلوں کی طرف بڑھے۔ اجمل خان پھر دہراڑا۔ ”خبردار۔۔۔ ہاتھ رائفلوں سے دور رکھو۔“

اس کی وارننگ پر کوئی بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ اجمل خان نے بے دریغ دوسرے زائرینر دہرایا۔ دو دھماکے ہوئے اور نشیب میں قریباً ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر دو گھڑ سواروں کی پیشانیوں میں ”بندھا“ لگ گئی۔ وہ کٹے ہوئے ہتھیروں کی طرح برف پر گرے۔ اجمل خان پھر دہراڑا۔ ”خبردار۔۔۔ رائفلیں پیکٹ دو۔“ اس کی آواز میں خوفناک آگ گئی۔ یہ آواز سننے

والے کے اعصاب پر لرزہ طاری کر سکتی تھی۔

ایک بار پھر اس کی وارننگ پر دھیان نہیں دیا گیا۔ اس مرتبہ اصل نے بڑی بے رحمی سے دو لمبے برست چلائے اور کم از کم پانچ مزید افراد کو برف اور خون میں لٹا دیا۔ دو گھوڑے بھی زمین پر گر کر ترپنے لگے تھے۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ جو کہ ہوا آٹا تھا اور ہوا۔

اجمل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ رستم اور ناصر کو کچھ سٹاک لوگوں کی گرفت سے نکالنا چاہتا تھا۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو تقریباً ایک سال پہلے گورے سے پینکے میں لرزہ خیز درندگی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔

”وہ دیکھو“ ڈولہ، اجمل کے پہلو میں چلا آیا اور ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

اجمل نے دیکھا، رستم اور ناصر دوسرے لوگوں سے کچھ قاصلے پر چلے گئے تھے۔ ایک شخص ہاتھ میں خنجر لیے رستم اور ناصر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے یا پھر ان میں سے کسی کی گردن پر خنجر رکھ کر یہ اندھی فائرنگ روکنے کا سوچ رہا ہے۔ دوسرا خیال زیادہ زیادہ تو قوی تھا۔ کیونکہ اس نے رستم اور ناصر کو مارنا ہوتا تو دوری سے گولی چلا دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ رستم یا ناصر کے قریب پہنچتا، اجمل نے ایک اور مشکل شٹ چلایا۔ گولی حملہ آور کے سر کے پچھلے حصے میں گئی اور وہ برف پر اوندھے منہ گر کر روک ٹوک کھیل گیا۔

چمک چمکنے میں سات آٹھ افراد کو گولیوں کا ہلاک ہو چکے تھے۔ باقی بکسر حواس باختہ کھڑے تھے۔ رائفلس ان کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جوابی فائر کس طرف کریں۔ یا شاید اب ان میں جوابی فائر کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ اجمل کی گرج ایک بار پھر تھمکے خیز فضا میں گونجی تو سب سے پہلے ایک ہاتھ والے دراز قد شخص نے ہی اپنی ہتھیاری رائفل برف پر پھینک دی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے باقی دو ساتھیوں نے بھی رائفلس پھینک دیں۔ ان کے دو تین گھوڑوں کو گولیاں لگ چکی تھیں۔ دو تو جان کنی کی حالت میں زمین پر تھے۔ ایک اپنی ٹانگ ٹھیکنا ہوا پانی کے بے دکے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگا پھر رہا تھا۔

☆=====☆

کچھ دیر پہلے جب ایک لٹاکر ہوئی آواز رستم کے کانوں میں پڑی تو دوسروں کی طرح وہ بھی بری طرح چڑھا تھا۔ آواز پھاڑیوں سے ٹکرا کر گونجی تھی اور کچھ پائیں چلا تھا کہ کدھر سے آئی ہے۔ الفاظ سمجھ میں آئے تھے اور نہ ہی زبان۔ پھر ایک دو دھماکے ہوئے تھے۔ رستم

اور ناصر نے دو مسلح پیریداروں کو اچھل کر گھوڑوں سے نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں جان لیوا طور پر ڈش ہوئے تھے یاؤندہ محافظوں نے حیرت کے شند یہ جھٹکے سے سنبھل کر اپنی رائفلس کندھوں سے آٹامارتا چاچیں جب لٹاکر لگا کر ہار پھر کھینچی۔ اور اس کے ساتھ ہی جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ تڑتڑ کی سماعت ضمن آواز سنائی دی۔ خود کار رائفل کے دو طویل برست چلائے گئے۔ کم از کم پانچ محافظ برف پر گر کر ترپنے لگے اور ان کے ساتھ دو گھوڑے بھی جان کنی کا شکار ہو گئے۔

رستم اور ناصر نے گھوڑوں سے چھلانگیں لگا دی تھیں اور کسی محفوظ آڑ تک پہنچنا چاہتا تھا مگر آڑ کہیں نہیں تھی۔ وہ بس یہی کر سکتے کہ اس مقام سے دور چلے گئے جہاں لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ پھر ایک مشتعل یاؤندہ خنجر بدست بھاگا ہوا ان کی طرف آیا مگر ان تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنے سر کے عقب میں ایک گول وصول کی اور نہ وہ چپکلی کی طرح اوندھے منہ فرش پر آگرا۔ اس ہلاکت سے رستم اور ناصر کو کم از کم یہ انداز ضرور ہو گیا کہ گولی کس طرف سے چل رہی ہے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے رستم بھائی؟“ ناصر چلایا۔

”شاید برقی جان کے کچھ دشمن ہیں۔“ رستم نے بھی بلند آواز میں کہا۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ کم از کم رائفل تو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ رستم کا خیال تھا کہ شاید اسی وجہ سے انہیں ابھی تک نشانہ بھی نہیں بنایا گیا۔

اسی دوران میں رستم اور ناصر نے دیکھا کہ برقی جان اور اس کے بچے ہوئے دو ساتھیوں نے رائفلس پھینک دیں اور سخت حواس باختہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ان کے قریب کھڑے وہ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

”کیا ہم بھاگ سکتے ہیں؟“ رستم نے تیز سرگوشی کی۔

”مشکل ہے۔ یہ بالکل ممکن نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ رستم مزید کچھ کہتا، چند افراد برٹیفے تو دونوں کے عقب سے برآمد ہوئے اور وہ طوائف لڑتے ہوئے نیچے آئے گئے۔ یہ چار افراد تھے۔ بظاہر یوں لگا کہ ان میں ایک بچی بھی ہے۔ رستم اور ناصر آٹھائیس سکوڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ یکا یک رستم کی رگوں میں لہری گردش تیز تر ہو گئی۔ اس نے چپکلی دھوپ میں آنکھیں مزید سکڑ کر سامنے دو طوائف کی طرف دیکھا اور پھر دفعتاً اس کا دل بلیوں اچھٹنے لگا۔ اس نے۔۔۔ ہاں اس نے، اس شخص کو پہچان لیا تھا جو سب سے آگے آ رہا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں خود کار

یہیں نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال کی اندیشہ ابھی موجود تھی۔ رستم داسر اور اس کو بھاپور پر یہ خطرہ تھا کہ یہاں ہوئے والی زبردست فائرنگ کی آواز کبھی کسی ایسی جگہ نہ گئی تھی جو جہاں سے ٹاپ کے لوگ خبردار ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں گھر جاتے۔ درحقیقت یہ فائرنگ کی آواز ہی تو تھی جو اہل اور اس کے ساتھیوں کو یہاں بھیج لائی تھی۔ جب رستم چل پادر کے پھر کر دو سو سال پرانی تختی کنارے پر لے آیا تھا تو کنارے پر موجود لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹکڑا نہ رہا۔ اسی خوشی میں انہوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی۔ وقت کے لیے جانے والی یہی ہوائی فائرنگ تھی جو پہلے ڈولے نے اور پھر اہل وغیرہ نے سنی۔

اب کھلی جگہ پر سے آٹھ عدد لاٹوں کو ہٹایا جا چکا تھا۔ ان لاٹوں کو ایک دو میل کھری کھنڈ میں اس طرح ڈال دیا گیا تھا کہ یہ دور سے نظر نہ آسکیں۔ دو گھوڑوں کی لاٹوں کو ٹھیکینا اور چھپانا مشکل تھا۔ انہیں چھپانے کے لیے ان پر برف وغیرہ بھیر دی گئی۔ بد کے ہوئے گھوڑوں کو اکٹھا کر کے ایک جگہ باندھ دیا گیا۔ برقی جان کی خواہش کے مطابق پھر کی مقدس تختی کو ایک اونچی جگہ پر احتیاط سے رکھ دیا گیا۔ اہل خانہ، رستم اور باصر ایک دوسرے کو اپنے اپنے مختصر حالات سے آگاہ کر چکے تھے۔ تفصیلی حالات جاننے کے لیے تو مسلسل کی دن کی گفتگو بھی تھوڑی تھی۔

رستم نے سب سے پہلے اپنی لی لی کے بارے میں ہی پوچھا تھا۔ ”وہ کیسی ہیں اہل؟“
”وہ بالکل ٹھیک ہے رستم بھائی۔“ اہل نے آنکھوں میں نمی لے کر کہا۔ ”وہ آج کل اپنے گاؤں رنگ والی میں ہے۔ اس کی بہت شان ہے رستم بھائی۔ بزاروں لوگ اپنی چھوٹی چودھرائی کا ایک جھلک دیکھنے کے لیے انتظار میں کھڑا رہتا ہے لیکن۔۔۔ وہ بھی کسی کا انتظار کرتا ہے۔ اور آپ کو پتا ہی ہے وہ کس کا انتظار کرتا ہوگا۔ اس نے آپ کے لیے اتنا آنسو بہایا ہے رستم بھائی۔ اتنا آنسو بہایا ہے کہ ام بیان نہیں کر سکتا۔“

”اور حاجی حیات۔۔۔ اور منا۔۔۔ گریس وغیرہ؟“

”گریس آج کل اپنے وطن گیا ہوا ہے۔ حاجی حیات نے بھی ہر طرح سے آپ کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ ام آپ کو تفصیل بتانے کا تو گھنٹوں لگ جائیں گے۔ منا، لی لی کے پاس ہی ہے۔ وہ اچھا خاصا صحت مند ہو گیا ہے۔ پوری ہو۔۔۔ میں خرگوش کے مابین بھانگن پھرتا ہے۔“

”اور اس کا باپ۔۔۔ چودھری بشیر؟“

اہل کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپکا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر رستم کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ”چودھری بشیر اپنے گناہوں اور نیکیوں کا حساب کتاب لے کر اللہ کے پاس حاضر ہو چکا ہے۔ وہ ہماری بہن کا زندگی عذاب بنانے کے لیے اب اس دنیا میں موجود نہیں۔“

رستم نے حیرت کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ اس نے اہل سے تفصیل جاننا چاہی لیکن اہل شاید اتنے افراد کی موجودگی میں جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو بڑھتے ہوئے رستم نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ اس نے قدرت اللہ ربی راہیں نظر اور تاپا معصوم وغیرہ کے حوالے سے چند سوالات کیے۔ جن کے اہل نے مختصر جواب دیئے۔

ڈولے اور اہل نے بھی رستم سے چند سوال کیے جن کے مختصر جواب رستم اور باصر نے دیئے۔ ان میں ایک اہم سوال رستم کی ٹانگ کے بارے میں بھی تھا۔ اہل اور ڈولا اس امر میں حیرت انگیز مسرت محسوس کر رہے تھے کہ رستم کی کئی ہوئی ٹانگ پھر سے اس کے جسم کا زندہ حصہ تھی۔ وہ ایک معمولی لنگڑا ہٹ کے سواہد رستم میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کر رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

محمد اعظم خاں کے قلم سے ایک دلکش اور خوبصورت ناول۔

پرایا آسمان

قیمت
150 روپے

- رشتوں کے بندھن میں جزی ایک لازوال تحریر۔
- پیار و محبت سے گندمی ایک منفرد کہانی۔
- ان لہجوں کی داستان جب کوئی ہمارے جیت گیا۔
- کسی کی بے وفائی اور کسی کی وفاؤں کا قصہ۔

اپنے ہا کر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی بکسٹال

علی میاں پبلیکیشنز

بازار

بہت دور، چمک سہ پتہ ہلال آباد

7247414

عین۔ شین۔ قاف

محمد فاضل مادی

- عشق و محبت کے اس سوداگر کی کہانی۔ جس نے عشق نہ کرنے کی فہم رکھی تھی۔
- گھر اس کی خدا اور انا عشق کے پہلے حرف "شین" کی اسیر بن گئی۔
- شربی اور آوارہ مزاج احمد سبحانی جب عاشق بنا تو "شین" نے اس کو روح کی گہرائی تو پا دی ہے۔
- تاراں دینے پر مجبور کر دیا۔ شیطان ملعون کے کاری دار "شین" کی سرخوئی کی راہ میں دیوار تھے۔
- اس عاشق کا قصہ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کا عشق "شین" سے شک نہیں بلکہ "شین" سے شہادت پہنچی ہے۔ وہ خاندان سے بھارت کر کے شہر محمد پور لے گیا۔ مسافر بنا تو طوفان نے اس کا راستہ روک لیا۔
- کیا اس نے عشق کی سر بلندی کے لیے جان کی بازی لگا کر عشق کا دوسرا نصف "شین" سرخو کر دیا؟
- سادات گھرانے کی وکالت عشق کے خلاف دلیل بن گئی جبکہ مدعی ایک عوامی مخالف تھی۔
- گندمی اور گنجل میں تھوڑی ہوئی عوامی مخالف نے "قاف" کو اپنا بیٹا بن لیا۔
- وہ عشق کے قاف کی ایک اسیر بن کر دنیاوی مدافعوں نے اس کی زندگی بھر کی تادیب کر دی۔
- اُس نے "قاف" کو کس طرح خراج پیش کیا؟
- محبت و عقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ عشق کی رعنائیوں سے لبریز سطر میں عبادت گزار۔
- خیر سے بہتر جن اسلوب شاعری اور محبوب لہجے کے عشق میں جانوں کے ڈرائے تھنا چڑھ کر نے والوں کی کہانی۔
- شین۔ شین۔ قاف کی بھی اور نئی تحریر "عشق" کی حشر سامانیاں۔
- عشق عشق پر اب تک کبھی ہانے والی کتاب کو فراموش کر دینے والی شاندار تحریر۔

علی بکسٹال



علی میاں پبلیکیشنز

بہت دور، چمک سہ پتہ ہلال آباد

7247414

شیخ درمنج سنسنی خیز واقعات میں الجھی ہوئی ہیبت ناک داستان

کالے چراغ

ایم اے راحت

پاتال جیسی اتھ گہرائیوں میں سات بے نور چراغ جنہیں انسانی خون سے روشن کرنا تھا۔
 بقی جلی ہوئے، زبوں، شیش آئے، رائے سنسنی خیز واقعات۔
 ایک ہر دم نے اسے جتنے دن رات اس سے سات خون کراہے۔
 چھپاؤنی آئیں اسے، نہ دوت اور آسپ تن کا پتے تھے۔
 دوسرے لوگوں نے اسے سنا، نہ تیرے۔ اس پیدہ اہونے والوں کا خون ماضی تھی۔
 دو دن تک، جاتی طاقتوں کا سردار، دونوں صدیوں جیسے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ شقی مان لوں تھا!
 جاو و گاتی پر اسرار، وہ شٹناک کہانی۔

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال

علی میاں پبلیکیشنز

سیت روڈ، چمک سیت ہسپتال، لاہور۔

20-منڈ مارکٹ، اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414

خواتین کا مقبول ترین ناول

ماہی ماہی کوکدی میں

دو حصے

ہما کوکب بخاری

پہلی جلد 350 روپے

- معاشرے کے سب سے اونچے سنگھاسن پر بیٹھے زوروں کی کہانی۔
- ان مقدس دوشیزاؤں کی کہانی جن کا تقدس ان کے لیے عذاب بن گیا تھا۔
- اس باپ کا قصہ جسے اپنی عزت، آن اور زبان اپنی اولاد سے زیادہ عزیز تھی۔
- صدیوں سے غیرت کے نام پر سولی پر لٹکانی جانے والی عورت کی کہانی۔
- عظمت کے ساقیوں آسمان پر بھی عورت پاتال کی گہرائی میں کیوں گرتی ہے۔
- ماپنی خا خا ہشوں کے بھنور میں پھنسنے لوگوں کی داستان۔
- خاندانی روایات کے باقی ایک بلند ہمت نوجوان کی کہانی۔

اپنے ہا کر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی بکسٹال

||

علی میاں پبلیکیشنز

ناشر

سیت روڈ، چمک سیت ہسپتال، لاہور۔

20-منڈ مارکٹ، اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414